پولیس

شہری معاشرے کا اہم بازو

شفقت تنویر مرزا



مشعل

پولیس
شہری معاشرے کا اہم بازو

شفقت تنویر مرزا

مشعل
آر۔ بی 5 ' سیکنڈ فلور' عوامی کمپلیکس
عثمان بلاک' نیو گارڈن ٹاؤن' لاہور54600' پاکستان

پولیس شہری معاشرے کا اہم بازو

شفقت تنویر مرزا

ناشر: مشعل
آر-بی-5، سیکنڈ فلور،
عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور-54600، پاکستان
فون وفیکس:042-35866858
Email: mashbks@brain.net.pk
http://mashalbooks.org

فہرست

پیش لفظ

ایف آئی آر

کسی بھی ملک میں پولیس کا شعبہ ہی ہوتا ہے جو معاشرے کو بگاڑنے، اقدار کو برباد کرنے ۔ انسان کے وجود ،اس کی آزادی نجی زندگی، مال و منال کو چیلنج کرنے، اجتماعی زندگی کو حفظ و امان سے محروم کرنے اور کاروبار حیات کو سبوتاژ کرنے والے عناصر سے نبرد آزما رہتا ہے۔ یوں وہ زیادہ شائستگی اور بہتر تہذیبی منازل کی طرف معاشرے کے سفر کو آسان ، پرمایہ، نتیجہ خیز اور تیز تر کرنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ ایک ایسی فضا فراہم کرنے میں ہمہ وقت مصروف رہتا ہے جس میں قوم اپنی صلاحیتوں کا بہتر طور پر تخلیقی اور پیداواری اظہار کرسکتی ہے۔ ہر فرد نجی اور اجتماعی زندگی میں حقوق و مراعات سے پوری دلجمعی کے ساتھ فیض یاب ہوسکتا ہے۔ یہی نہیں، ہر فرد پر معاشرہ یا اجتماع کی طرف سے جو فرائض عائد ہوتے ہیں وہ بھی خوشدلی کے ساتھ پوری تندہی سے سرانجام سینے میں لگا رہتا ہے۔

پولیس مدنی زندگی کا یہ مقدس فریضہ ادا کرنے میں کب سے مصروف (یا مفرور) ہے؟ کس ملک میں کس روپ میں سرگرم ہے؟ اس کی تگ ودو کا حاصل کیا ہے؟ اس کا نفع نقصان کیا ہے؟ ہمارے معاشرے کو عہد قدیم سے عہد حاضر تک پولیس سے کیا نفع نقصان ہوا اور اس کاروبار میں خود پولیس کو کیا کیا طرز اداد کھانی پڑی؟ یہ مختصر سی کتاب انہی سوالوں کو سامنے رکھ کر پیش کی جارہی ہے ۔ جوابات کسی حتمی صورت میں فراہم کرکے قاری کے تخئیل کی پرواز ،تعبیر اور ذاتی مشاہدے اور تجربے کی وسعت کو پابند کرنے کی بجائے کھلا چھوڑ دیا گیا ہے اس یقین پر کہ پیش کئے جانے والے مواد کے حوالے سے وہ خود حساب کم

وبیش بہتر طور پر کرسکتا ہے۔

کسی ادارے کے قیام، تنظیم و ترکیب، ڈسپلن، حدود، فرائض اور کارکردگی کے بارے میں پہلے مرحلے پر بہترین منصف وہ ہوتے ہیں جن سے اولاً اسے واسطہ پڑتا ہے۔ ان کی شہادت زیادہ معتبر ہوتی ہے۔ اس کے بعد وہ سوچنے سمجھنے والے لوگ ہوتے ہیں جو مبصر بھی ہوتے ہیں اور تجزیہ نگار اور ناقد بھی۔ ان میں سے کچھ کا علم براہ راست اور کچھ کا اکتسابی ہوتا ہے۔ آخر میں ان کی گواہی آتی ہے جو خود اس ادارے کا حصہ رہے ہوں۔ یہ گواہی تھوڑی سی دفاعی نوعیت کی بھی ہوتی ہے اور اس میں خود تعریفی کا عنصر بھی شامل ہوتا ہے اس کے باوجود ادارے کی مثبت یا نفی کارکردگی کے بارے میں یہی گواہی بڑی معتبر (دستاویزی) بھی قرار پاتی ہے۔

ہمارے ہاں مطالعہ، تحقیق، جستجو اور فکری نوعیت کا کام دوسرے شعبوں میں ہی بہت کم ہوا ہے بلکہ بعض اوقات ہوا ہی نہیں تو پھر پولیس والوں سے یہ توقع کرنا کارلا حاصل ہے کہ وہ اپنی پیشہ ورانہ آپ بیتی کے ذریعے عام پڑھنے والوں، پالیسی ساز حکام، معاشرتی مفکرین اور اپنے ہم عصر اور بعد میں آنے والے ہم پیشہ افراد کے لئے کچھ سامان فکرونظر بھی پیش کریں گے۔ کچھ پچھتاوے کچھ ندامتیں اور کچھ معذرتیں بھی کہ بہر حال یہ ہر سرگزشت کا لازمی حصہ ہوتی ہیں۔ پاکستان میں پولیس والوں نے ایسا کام کیا بھی ہے تو بہت کم اور پھر وہ نظر بھی کم ہی آتا ہے۔ پولیس (برصغیر پاک وہند) کی تاریخ کے بارے میں سابق ڈی آئی جی، این۔ اے۔ رضوی کی کتاب ہے جو قابل تعریف ہے۔ کم از کم پولیس کے نقطۂ نظر سے۔ اس کتاب سے خاصی خوشہ چینی کی گئی ہے۔ باقی کام ایسے ہی ہیں۔

پنجاب میں اس ادارے کی کارکردگی پر پنجاب کے سابق انسپکٹر جنرل صاحبان، جناب فضل حق، جناب سردار محمد چودھری، ایس ڈی جامی اور جناب محمد عباس خان نے اپنی رپورٹوں اور مضامین میں بڑے نازک معاملات پر بات کی ہے ان سے پورا استفادہ کیا گیا ہے کہ ان کی حیثیت دستاویزی شہادت کی سی ہے۔ اسی طرح پولیس مقابلوں کے بعد پولیس والوں کو جب انعامات اور ترقیوں سے نوازا جاتا ہے اس پر لاہور ہائی کورٹ کے ایک تلخ فیصلہ کا متن بھی شامل ہے۔

فرنگی عہد سے اپنی پولیس کی درجہ بدرجہ صورت پذیری کی تفصیل (یعنی تاریخ) ادارے کی مدنی حیثیت کو مختلف ادوار میں جاننے کے لئے لازم ہے۔ اسی طور اس پولیس کا وجود جس قانون کا رہین منت ہے وہ 1861ء کا پولیس ایکٹ ہے جسے شامل کرنا ضروری جانا۔

نفاذ قانون، قیام وتسلسل، امن وامان، جرائم اور دہشت گردی کے مقابلے میں پولیس کی ایک سال (1995ء) کی کارکردگی کے بارے میں پاکستان کے انسانی حقوق کے کمیشن کی رپورٹ بھی ایک آئینہ کی حیثیت رکھتی ہے جو شامل کتاب ہے۔

پولیس کے رسائل وغیرہ کی فراہمی میں عزیزی محمد ریاض شاہد کا ممنون ہوں جہاں تک پولیس والوں کا تعلق ہے وہ اپنے بارے میں کچھ بتانے سے گریز ہی کرتے ہیں، خدا جانے انہیں یہ وہم کیوں ہے کہ ان کے خلاف ایف آئی آر کاٹی جانے والی ہے!

اس مضمون یعنی نفاذ قانون، اور جرم وسزا سے متعلق محکموں کے بارے میں پوری طرح سے باخبر ہونے کا کوئی دعویٰ نہیں اس لئے کتاب میں پائے جانے والے نقائص کی ذمہ داری کسی دوسرے پر نہیں ڈالی جاسکتی۔ اسی طرح اگر کہیں توازن ڈگمگا گیا ہے تو اس کے لئے پیشگی معذرت۔

اسی روز گوجرانوالہ کے ایس ایس پی
اشرف مارتھ کو قتل کیا گیا۔
مارچ 1999 تک قاتل نہیں پکڑے گئے۔

ضمنی

یہ کتاب مئی 1997 میں مکمل ہوگئی تھی اس لحاظ سے یہ ایف آئی آر 1997 میں آپ کے سامنے آجانی چاہئے تھی مگر ناگزیر وجوہ کی بنا پر ایسا نہ ہوسکا۔ ان دو برسوں میں پولیس کی کارکردگی میں کیا فرق پڑا؟

پولیس کی طرف سے سول عدالتوں میں پکا ریکارڈ، پکے ثبوت پیش نہ کرسکنے کے باعث مختلف توع کے جرائم اور دہشت گردی میں اضافہ سے گھبرا کر حکومت نے فوجی عدالتیں قائم کردیں حالانکہ ان عدالتوں کو بھی مواد تو اسی پولیس نے فراہم کرنا تھا۔ تاہم

امور مملکت خویش خسرواں دانند۔

سپریم کورٹ نے قانون ضرورت کی ایک غلط روایت پر خط تنسیخ کھینچتے ہوئے فوجی عدالتوں کو آئین کے مطابق قرار نہ دیا۔ یوں پولیس کو "اعلی کارکردگی" دکھانے کے موقع سے محروم کر دیا گیا اور اس نے حسب روایت حاکمان وقت کے اشارہ ابرو پر ان کے سیاسی حریفوں پر بھی کڑی نظر رکھی اور حاکمان کے طرف داروں کو سپریم کورٹ پر یلغار کے لئے کھلا چھوڑ دیا۔ ذمہ دار پولیس اس سے کوئی سبق حاصل کرے گی؟ ہماری پولیس کا پورا ماضی گواہ ہے کہ اس نے کبھی اچھا سبق نہیں سیکھا۔ البتہ اسے برے سبق یاد رکھنے اور ان کے مطابق عمل کرنے پر اعزاز اور ترقی سے بھی نوازا گیا۔ مثلاً جس کو توال کے عہد میں لاہور میں ایک دن میں ایک کنبہ کے کئی افراد قتل ہوگئے اور قاتلوں کا کچھ پتہ نہ چل سکا اسے ایک گریڈ اوپر ترقی دے دی گئی' سیاسی حکومت کی تبدیلی کے باعث کچھ عرصہ یہ آفتاب گہن میں رہا' لیکن سیاسی تبدیلی پر پھر صورت خورشید کچھ ایسے ابھرا کہ اپنے درجنوں سینئر افسروں کی چمک ماند کرتا گیا۔ کیا ایسی روایات کسی بھی ادارے میں کام کرنے والوں کے دل میں نہ صرف حکمرانوں کے بلکہ ملک کے خلاف زہر بھرنے کے لیے کافی نہیں؟

اسی اثنا میں ایک بات اور اچھی ہوئی کہ پنجاب کے ایک سابق انسپکٹر جنرل پولیس چوھدری سردار محمد نے انگریزی زبان میں اپنی پولیس نوکری پر ایک بھاری کتاب لکھ دی۔ اس میں ان کے مشورے اور تجویزیں بھی شامل ہیں۔ ان سے پہلے کے ایک آئی جی پنجاب ایس ڈی جامی نے بھی ایک کتاب لکھی جن میں سے کچھ واقعات' آخری مضمون کی صورت میں شامل ہیں۔

گذشتہ دو سالوں میں قانون کو بہتر طور پر نافذ نہ کر سکنے کے صلے میں حکمرانوں نے پولیس کو ہلا شیری دے دی ہے کہ گناہ گار ہو چاہے بے گناہ' جو مردود قرار پا چکا ہے اسے پولیس مقابلے میں پار کر دو۔ ایم اے پاس لڑکی اپنی مرضی سے اگر شادی کر لے تو اس کے جاگیردار سیاسی باپ بھائی کے کہنے پر دوسرے صوبے سے اس کو اٹھا کے لے آئے۔ جیسے راجہ داہر عورتوں کو اٹھا لایا تھا۔ گویا پولیس کو اذن مل گیا ہے کہ وہ ایک بدتمیز منہ زور اور اداروں کے انہدام پر اپنی بادشاہی قائم کرنے والے گروہ کو ملک کے اعلے ترین ججوں پر حملہ کرنے کا خود پورا موقع فراہم کرے۔ اس پولیس کی نیک نامی اور اعتماد کو برقرار رکھنے

کے لیے بعض اوقات پولیس کی معصوم روحیں انہیں پولیس مقابلوں میں ماری جاتی ہیں۔
بعض اوقات مجرموں کے ہاتھوں اور بعض اوقات اپنے ہی باوردی ساتھیوں----

آخر میں شکر گذاری کی ایک صورت بھی----فیض صاحب کے بقول

روشن کہیں بہار کے امکاں ہوئے تو ہیں

2 مارچ 1999 کے روزنامہ جنگ لاہور سے:

''ڈسٹرکٹ وسیشن جج نارووال رانا زاہد حسین نے ساڑھے تین سال قبل تھانہ شکر گڑھ میں تشدد سے 25 سالہ نوجوان ثمر کو ہلاک کرنے کے جرم میں اس وقت کے ایس ایچ او اشرف گوندل کو سزائے موت کا حکم سنایا ہے''۔ ایڈیشنل سیشن جج لاہور محمد یونس نے پانچ سال قبل تھانہ جوہر ٹاؤن میں ایک نوجوان خالد سرفراز کو تشدد کر کے ہلاک کرنے کے الزام میں تین کانسٹیبلوں سلیم' نواز اور رفیق کو عمر قید کی سزا سنائی۔

شفقت تنویر مرزا

18۔مارچ 1999

پولیس

پولیس کا محکمہ یا ادارہ کل بھی اور آج بھی، کچھ انتہائی اہم مدنی، ضرورتیں پوری کرنے کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ معاشرے کو وحشت دہشت، عدم تحفظ بدامنی، انفرادی یا اجتماعی مسلح یا غیر مسلح یا مسلح تنازعوں اور داروگیر سے پاک کرنا اس کا اولین فرض تھا، نا انصافی کی صورت میں انصاف اور عدل بپا کرنے پر یہ ایک معاون وسیلہ بھی تھا، زور والے کو روکنے اور کمزور کی مدد کرنے کا ابتدائی کام بھی ایک حد تک اسی ادارے کے فرائض میں شامل تھا اور ہے اور یہ سارے کام مدنی زندگی کے شروع ہوئے ہی کسی نہ کسی کو سرانجام دینے پڑے۔ وہ پولیس والے تھے، چوکیدار تھے، سردار تھے۔محتسب تھے، کوتال تھے، شحنہ تھے، جو بھی تھے ان کے کام کی بنیادی نوعیت ایک سی تھی، اسے لاٹھی یا شوشک سے لے کر بکتر بند گاڑی اور انتہائی مہلک گن سے مسلح بھی کیا گیا تو اسی نقطۂ نظر سے کہ اسے ریاست، یعنی افراد ملک میں عمرانی معاہدہ کی پاسداری میں ایک معاون ادارے کے طور پر کام کرنا ہے۔

آج دنیا کا کوئی ایسا ملک نہیں جہاں پولیس نہ ہو، کہیں بہت زیادہ کہیں برائے نام، کہیں بے پناہ اختیارات کی مالک کہیں برائے نام اختیار والی، کہیں سراپا رحمت اور کہیں سر بسر زحمت، کہیں خوئے حکمرانی کہیں خیر کی ارزانی، گویا اس کے ہر جگہ اپنے روپ ہیں، بہروپ بھی اور سروپ بھی، کہیں معاشرہ کی تنظیم و ترتیب میں رخنہ اور شگاف ڈالنے والی، کہیں لوگ اس کے لئے سراپا سپاس کہیں ہاتھ سنگ باری کے لئے اُٹھے ہوئے، لیکن پولیس دو انتہاؤں میں ہی نہیں بٹی ہوئی اس میں ان دونوں کا امتزاج ہی ہے، کہتے ہیں فوج جیت جائے تو قوم کی ہیرو ہار جائے تو زیرو، یعنی ہنگامی صورت حال میں ایک ادارے کی کار

کردگی اس کی حیثیت قدر اور رتبہ کو متعین کرتی ہے اسی طور قوموں کی زندگی میں جب مشکل مقامات آتے ہیں تب پولیس' عدلیہ' انتظامیہ اور عوام کا کڑا امتحان شروع ہوتا ہے۔ کہا یہی جاتا ہے کہ اگر معمول کے حالات میں یہ ادارے اچھی کارکردگی کے حامل ہوں تو ہنگامی صورتوں کو بھی عموماً خوش اسلوبی سے سنبھال لیتے ہیں ورنہ انہیں تنزل اور زوال سے کوئی نہیں بچا سکتا اور بقول ساحر لدھیانوی یہ ادارے نئی فصل گل کے آنے تک' ضمیر ارض اک زہر چھوڑ جاتے ہیں۔

علامہ اقبال نے کہا تھا:

صورت شمشیر ہے دست قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زمانے اپنے عمل کا حساب

یہی حساب ہم نے من حیثیت القوم مجرمانہ طور پر ترک کر دیا چنانچہ پولیس کا ادارہ بھی آج دوسروں کی طرف سے نہیں خود اپنے سربراہوں کی نظر میں بے شمار خرابیوں کا مرکز بن چکا ہے یقیناً اس کی وجوہات میں ان میں کچھ ٹھوس اور بجا اور کچھ برائی کی یلغار کے سامنے ہتھیار ڈال دینے کی ناقابل معافی پسپائی کے سبب۔

پولیس بذات خود ایک حساس ادارہ ہے مگر یہ وہ ادارہ ہے جس سے بجا طور پر توقع کی جاتی ہے کہ وہ ریاست' حکومت اور حکومتی اداروں کے بارے میں عوام کے احساس اور اعتماد ٹھیس نہیں پہنچنے دے گا۔ یہ معاشرہ میں اٹھنے والی لہروں کو جذب کر کے سطح آب کو ہموار رکھنے میں اپنا متعین کردار ادا کرے گا اور یہ کردار خود بخود ادا کرے گا کیونکہ اس کے لئے کسی ایف آئی آر کے درج کرانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ پولیس اپنے مخصوص فرائض اور لباس کے باعث ہمہ وقت لوگوں کی نظر میں رہتی ہے اور ہر لحاظ اس سے بہتری کی توقع کی جاتی ہے خیر کی توقع کی جاتی ہے۔ اگر ایک چھوٹا سا بچہ ہجوم میں بچھڑ گیا ہے اور پریشان ہے اور پولیس والا آس پاس ہے تو اس سے یہ توقع ہوتی ہو کہ وہ اسے اپنی تحویل میں لے کر ہر ممکن طریق اس کے وارثوں تک پہنچائے گا' یہ مثال معاشرے کے حوالے سے دی جاسکتی ہے۔

آج معاشرے میں پولیس کو موثر اور معاون ادارے کی حیثیت سے ایک خاص مرتبہ یا متعین مقام حاصل ہے۔ جس کے ابتدائی فرائض یہ ہیں کہ وہ ملکی قوانین کے نفاذ کا

ذمہ دار ہے۔ کہیں پر آزادانہ طور پر اور کہیں ضمنی طور پر اس کا تعلق زندگی کے ہر شعبے سے ہے۔ اگر ایک طرف اسے اعلیٰ حکمرانوں کی حفاظت کرنا ہے تو دوسری طرف اسے ایک چھوٹی سی بستی کی زمین بدنیتی سے قبضہ کرنے کی نیت سے حملہ آور ہونے والوں سے بھی بچانا ہے۔ اسے سکولوں کو بچوں خصوصاً لڑکیوں کے تعلیمی اداروں کے باہر بدقماش عناصر پر بھی نظر رکھنا ہے اور بس اور ویگن میں جیب تراش کی کاروائی میں بھی متاثرہ فرد کا معاون بننا ہے' کہیں اسلحہ کی کھلی نمائش کرنے والوں کو روکنا ہے تو کہیں سائلنسر کھول کر موٹر سائیکل سواروں کی سڑکوں پر بدتمیزی کو بھی روکنا ہے' پرہجوم بازاروں میں اچکوں سے خواتین کے پرسوں کو تحفظ دینا ہے تو بینکوں سے بھاری رقوم نکلوا کر لے جانے والوں کی حفاظت کی توقع بھی اسی سے کی جاتی ہے۔ ملک کی شاہراہوں پر شب روز رواں ٹریفک کو بھی رواں رکھنا ہے تو حادثے کی صورت میں جائے واردات پر پہنچ کر مرحومین یا زخمیوں کو بھی ہسپتالوں میں پہنچانا ہے' خودکشی کی نیت سے گولیاں کھانے والوں کا معاملہ بھی دیکھنا ہے اور جلتے چولہوں پر پھینک کر ہلاک کرنے کی انسانیت سوز حرکت کرنے والوں پر بھی توجہ دینا ہے۔

مساجد' امام بارگاہوں' بسوں اور اڈوں پر بم پھٹیں یا کلاشنکوف کی گولیاں برسیں پولیس کی ذمہ داری ہے کہ یہ حادثات نہ ہونے دے اگر ہو گئے ہیں تو ملزموں کو پکڑے اور بعض اوقات خود بھی بموں یا گولیوں کا نشانہ بن جائے۔

مالیہ وصول نہیں ہوتا۔ سرکاری بقایا جات کی اگراہی میں کچھ لوگ مزاحم ہیں' قرضوں کی بازیابی نہیں ہوتی۔ ناجائز تجاوز کرنے والوں نے متاثرین کا دم ناک میں کر دیا ہے بھینسوں نے گلیاں بند کر دی ہیں' سست رفتار گاڑیوں نے وہ سڑک بند کر دی ہے جس پر ان کا چلانا ممنوع ہے تو پھر یہ کام بھی پولیس کے ذریعے ہی ہوتے ہیں۔ انتخابات کروائیں۔ بنیادی جمہوریت کے' بلدیہ کے یا صوبائی اور قومی اسمبلیوں کے تو پولیس کو بھی ایک کردار ادا کرنا ہوتا ہے' ذرا اونچ نیچ ہو جائے تو الزام پولیس پر' ذمہ داری پولیس کی۔

جیل میں ملزم لے جائے جاتے ہیں' انہیں پیشیوں پر عدالت لانا ہے تو یہ کام بھی پولیس کا اور اگر واردات میں کوئی موقع پر پکڑا گیا تو اسے بھی تھانے تک لے جانا پولیس کا کام ہے۔ جو مقدمات تھانے میں درج ہیں اور جن کا تعلق فوجداری معاملات سے ہے تو ان کا عدالت تک لے جانا اور مقدمے کی پیروی کرنا بھی پولیس کا کام ہے۔

فوجداری انصاف' آخری فیصلہ تو عدالت دیتی ہے۔مگر اس سے قانون کے سارے پھسلتے میدانوں میں سے گزرنا پڑتا ہے جبکہ اس پھسلن میں اسے خال خال ہی کامیابی ہوتی ہے کیونکہ ایف آئی آر سے لے کر عدالت تک' اس میں دوچار نہیں سینکڑوں ہی سخت مقام آتے ہیں اور مجموعی طور پر غلط تربیت' رشوت ستانی' بدعنوانی' وکیلوں کے سٹائل' ملزموں کی کارستانیاں' عدلی کی اپنی ادائیں غرضیکہ بعض اوقات پولیس غالب کے مصرعے میں مجسم ہو جاتی ہے۔

میں ہوں اپنی شکست کی آواز

کسی نے کہا تھا کہ جو علاقے اونچے نیچے پہاڑوں' میدانوں اور پیوں پر مشتمل ہوتے ہیں وہاں مجرم جائے پناہ آسانی سے کیسے تلاش کرلیتے ہیں۔ جواب سیدھا سا تھا۔ ارضی ٹوپوگرافی۔ اسی طرح ایک معاشرے کے بارے میں کہا جاسکتا کہ جہاں اونچ نیچ' امارت غربت' اختیار بے اختیاری' برادری اورقبائل کی تفریق' دھڑے بندی' سیاسی اور علاقائی تعصّبات' روزگار اور بے روز گاری' عمل اور بے عملی' پیداداری اور غیر پیداداری انفرادی قوت میں تفریق'شہری اور دیہی فاصلے' سماجی حدبندیاں' محاسبہ اور محاسبہ سے بے لگام بالا تری اور سب سے بڑھ کر قانون وضوابط سے بے خبری اورحساب دری سے مجرمانہ لاپرواہی ہوگی اس معاشرے میں جرائم کی وارداتیں نہ صرف بہت زیادہ ہوں گی بلکہ معاشرے کے جنگل' پہاڑ' غاز دریا' ریگستان مجرموں کو پناہ دینے میں بھی انتہائی فراخ دل ہوں گے اور اگر پولیس خود بھی خود پر اپنی بے بضاعتی کو ایسے طاری کرلے جیسے جھوٹی پٹیاں باندھ کر سرعام بھیک مانگنے والے گداگر ہوتے ہیں تو پھر پولیس ایک غیرمہذب معاشرے میں اپنے وجود کو اس سے بھی زیادہ غیر مہذب بناتی چلی جائے گی۔ایک طرف وہ خود قبضہ گروپ با اثر اور امیر افراد اور گروپوں' بدعنوان سرکاری اہل کاروں' عدلیہ کے اہل کاروں' ڈاکوؤں' چوروں' تاجروں اور سمگلروں کی ساتھی بن جائے گی دوسری طرف اس کی صفوں میں انہی گروپوں کی سفارش پر نااہل (معیار سے کم تر) افراد بھرتی ہوکر اس کی کارگزاری کو برباد کردیں گے بلکہ پورے معاشرے کے وجود کے لئے ایک زبردست خطرہ بن جائیں گے اور یہ ادارہ ہرلباس میں ننگ وجود بن جائے گا۔

یہاں صرف ایک مثال کافی ہوگی' لاہور کے آس پاس ایک مخصوص علاقہ میں

ایک خاص گروہ نے نہ صرف مجرموں کو پناہ دے رکھی تھی بلکہ وہاں انتہائی خطرناک اسلحہ بھی جمع کر دیا گیا تھا جس کا نشانہ دوسرے گروہ کو بنانا مقصود تھا اور امن و امان کا ایک خوفناک مسئلہ پیدا ہونے والا تھا۔ حکم ہوا کہ پولیس فوری اقدام کرے۔ اپنی بکتر بند گاڑیوں کی مدد سے آپریشن کی نہ صرف تیاری کر لی گئی بلکہ آپریشن رات کے وقت کر دیا گیا پولیس کے اندر اس گروہ کے لوگ بھی موجود تھے۔ خبر نکل گئی علاقے میں پیش بندی کر لی گئی اور صبح کے وقت پولیس کی کئی گاڑیاں آپریشن میں جلا دی گئیں ۔ اسے گولیوں کا بھی سامنا کرنا پڑا اور جانی نقصان بھی اٹھانا پڑا۔ اسی طور مخالف گروہ بھی اپنے اندر کے بھیدیوں کے سبب اتنا شیر ہوا کہ اس نے ہیر کے دیس میں پولیس کی ایک بکتر بند گاڑی پر ایسا راکٹ مارا کہ اس کے اندر چار پانچ پولیس والے جان گنوا بیٹھے۔

ہمارے ملک میں پولیس کا ادارہ 1947ء میں قائم نہیں ہوا تھا۔ وہ اس شکل میں انگریز کے عہد میں قائم ہوا بلکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں قائم ہوا تھا۔ اس کا فرض ایسٹ اینڈیا کمپنی کے ہر نوع کے مفادات کی نگہداشت اور فروغ تھا۔ جس طور کسی امیر کبیر شخص کے ذاتی محافظ اور چوکیدار صرف اس شخص کی جان و مال کی عزت و قار کے محافظ ہوتے ہیں اس کے علاوہ نہ ان کا کوئی انسانی فریضہ ہوتا ہے نہ معاشرتی ۔ اسی طرح ایسٹ انڈیا کمپنی کا چوکیدار یا گارڈ اس مقام سے اٹھا کر کوتوال بنا دیا گیا اور نجی تجارتی مفادات کے تحفظ اور نجی قوانین کے نفاذ والے ادارے کو اجتماعی مفادات اور قوانین کے نفاذ کے ذمہ دار ادارہ میں تبدیل کر دیا گیا۔ دوسرے ممالک میں بھی کم و بیش یہی صورت رہی۔ مثلاً امریکہ میں پہلی پولیس ٹیکساس رینجرز کے نام پر قائم کی گئی جس کا مقصود یہ تھا کہ وہ امریکی نو آباد کاروں کو ریڈ انڈین کی یلغار سے بچائے۔ انگلستان میں پولیس کے ذمے لوگوں کو چوری چکاری اور راہزنی سے بچانے اور دریائے ٹیمز میں تجارتی سامان لانے لے جانے والی کشتیوں کو محفوظ کرنے کا کام تھا۔ ابتداً پولیس میں خود چور اچکے بھی شامل ہوگئے تھے جاپان میں پولیس کے ذمے بادشاہ کی حفاظت ہی نہیں اس کے آمرانہ قوانین و احکامات پر عملدار آمد بھی تھا۔ تاہم مجموعی طور پر پولیس کو معاشرہ میں سماجی تجارتی معاشرتی و اخلاقی خرابیوں اور قوانین کی خلاف ورزیوں کو روکنے کی خاطر ایک ادارے کی صورت دی گئی۔ عہد قدیم میں روم میں بھی جہاں سے لفظ پولیس (شہر) لیا گیا۔ اس ادارے کے قیام کا مدعا یہی تھا۔

باقی رہا ادارے کے اچھے یا برے ہونے یا اعلیٰ کارکردگی یا ناقص کارکردگی کے حامل ہونے کا سوال، تو اس کا تعلق خود اس ملک کے مدنی نظام سے وابستہ ہے کہ یہ نظام کن بنیادوں پر کھڑا ہے، اس کا مدعا اور مقصد کیا ٹھہرا؟ اسے ترقی اور روشن خیالی کی راہ پر چلانے کی موثر کوشش ہوئی یا زوال کی طرف جانے والی راہوں پر ڈال دیا گیا؟ ایک وقت یہ تھا کہ فرائض میں پولیس از خود پروٹسٹنٹ عقیدہ رکھنے والوں کی سرکوبی کرتی پھرتی تھی اور مذہبی کتابوں کو سنسر بھی خود ہی کرتی تھی کہ اسے اقتدار اعلیٰ کی طرف سے یہ اختیار حاصل تھا مگر وہی پولیس لوگوں کے لئے مارکیٹیں ہسپتال، سکول، ٹائلٹ، بھی تعمیر کرتی رہی کہ مقصد لوگوں کی فلاح و بہبود تھا۔ وہ پولیس یہ بھی دیکھتی کہ آیا منڈی میں آنے والا سامان خور دونوش صحیح ہے یا ناقص، تول کم ہے یا پورا، ذخیرہ اندوزی تو نہیں کی جارہی کسی کو دھوکہ تو نہیں دیا جارہا، لوگوں کے حقوق تو غصب نہیں کئے جارہے۔

مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ پولیس کا اہم ترین فرض یہ دیکھنا ہے کہ ملکی قوانین کے تحت لوگوں کو حاصل حقوق تو سلب نہیں کئے جارہے، ان کی زندگی کو بدحال تو نہیں بنایا جارہا، ان کی جان اور مال اور ان کی اولاد محفوظ ہے، ان کی راہ گزر میں کوئی غاصبانہ رکاوٹ تو نہیں ڈالی جارہی ان کی نجی زندگی میں کوئی بلاوجہ دخل تو نہیں دے رہا۔ تو گویا عوام کے بنیادی حقوق کا تحفظ پولیس کے ادارے کے ذمے ہے تاہم اس ضمن میں وہ اگر اولیں اہمیت کا حامل نہیں تو اس کی معاون حیثیت ہمیشہ سے متعین ہے۔

پاکستان کے آئین میں ان حقوق کی حفاظت کا یوں بندوبست کیا گیا ہے(اور دنیا بھر کے قوانین کے علاوہ اقوام متحدہ کے بنیادی حقوق کے چارٹر یا منشور میں بھی اسی نوعیت کا تحفظ فراہم کیا گیا ہے۔

آرٹیکل 4(1)اور(2)

ہر شہری کا یہ نا قابل تنسیخ حق ہے کہ اسے قانون کا پورا تحفظ حاصل ہو اور اس کے ساتھ قانون کے مطابق سلوک کیا جائے۔ (الف) خصوصاً بجز قانون کے تقاضے پورے کئے بغیر کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا جائے گا جو اس کی زندگی، آزادی، جسم، یا جائیداد کے لئے خطرے کا باعث ہو (ب) کسی شخص کو کوئی ایسا کام کرنے سے نہ روکا جائے گا نہ اس میں رکاوٹ کھڑی کی جائے گی جو قانوناً ممنوع نہیں ہے (ج) کسی شخص کو وہ کرنے پر

مجبور نہیں کیا جائے گا جو قانوناً اس پر واجب نہیں ہے۔

آرٹیکل 9

بجز قانون کے کسی شخص کو اس کی زندگی یا آزادی سے محروم نہیں کیا جائے گا۔

آرٹیکل 10-(1)-(2)

گرفتار کئے گئے کسی شخص کو اس کی گرفتاری کے بعد پہلی فرصت میں گرفتاری کی وجوہ بیان کئے بغیر حراست میں نہیں رکھا جائے گا۔ نہ اسے (قانونی) مشورہ کرنے اور اپنے دفاع کے لئے اپنی پسند کے وکیل کی خدمات حاصل کرنے کے حق سے انکار کیا جائے گا۔

آرٹیکل 14-(1)-(2)

قانون کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہر شہری کا وقار اور نجی زندگی (پرائیویسی) کا حق نا قابل تنسیخ ہے۔ کسی شخص پر گواہی حاصل کرنے کے لئے تشدد نہیں کیا جائے گا۔

یہ حقوق پاکستان کے آئین 1973ء کے حوالے سے شہریوں کو حاصل ہیں اور ریاست ان حقوق کی ضمانت اپنے انتظامی اداروں کے ذریعے دلاتی ہے جن میں پولیس کا ادارہ ایک بنیادی اہم ادارہ ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ پولیس پاکستان میں ایک صوبائی مسئلہ ہے۔ انگلستان میں اسے بلدیاتی مسئلہ کہا جاسکتا ہے۔ امریکہ میں ریاستوں اور بلدیاتی اداروں سے وابستہ ہے اور یہ سب بلا شبہ مہذب معاشرے ہیں لیکن کسی نہ کسی مرحلہ پر ان مہذب معاشروں میں یہی ایک اہم مدنی ادارہ یعنی پولیس اپنی حدود کو پھلانگ جاتا ہے۔ چھٹی دہائی میں طلبا کی احتجاجی لہر اٹھی تو انگلستان میں بھی اور امریکہ میں بھی اسے دبانے کے لئے پولیس کو بے دریغ استعمال کیا گیا، فرانس میں اس وقت سے لے کر آج تک طلبا پر تشدد کے باعث پولیس بد نام چلی آرہی ہے۔ طلبا کے علاوہ جب کبھی مزدوروں نے اپنے حقوق کے لئے ملک گیر پیمانے پر احتجاج کیا تا پولیس کا فرض تھا کہ اسے تشدد نہ ہونے دے مگر اکثر یہ ہوا کہ سیاستدانوں کی کسی نہ کسی غلطی کے سبب پولیس کے لئے دشنام طرازی کی گنجائش نکل آئی۔

ترقی یافتہ اور پس ماندہ ممالک میں پولیس کے ادارے کا روپ سر بسر مختلف ہوتا ہے کیونکہ دو مختلف معاشروں کی نمائندگی مختلف نوعیت کی فورس کو دی ہوتی ہے۔ پس ماندہ معاشرے میں اگر معاملہ کو طاقت سے دبایا جاتا ہے بلکہ ہر مسئلے کا حل طاقت کے ذریعے

نکالنے کی کوشش کی جاتی ہے تو پھر پولیس بھی انہی خطوط پر طاقت کو فوراً اور بعض اوقات بلا جواز استعمال کر لیتی ہے۔ اس کے مقابلے میں ترقی یافتہ ممالک میں معاملات کو مذاکرات اور جمہوری طریق سے نمٹانے کی کوشش سر فہرست ہوتی ہے چنانچہ ان کی پولیس بھی معاملات کو پر امن طریقوں سے نمٹانے کی پابند ہوتی ہے اس کی تربیت شروع دن سے ایسے کی جاتی ہے اور پھر یہی روائیت انہیں ورثے میں ملی ہوتی ہے جبکہ پس ماندہ ممالک میں روائیت بھی سختی کی اور ماورائے قانون اقدامات کی ہوتی ہے نتیجہ یہ ہے کہ پولیس کا تصور ایک دوست ایک مدد گار کا نہیں ہوتا۔

پولیس کے ادارے میں اسی سول سوسائٹی کی جھلک نظر آتی ہے جس میں اس نے تشکیل پائی ہو۔ مثلاً ہمارے ہاں یعنی برصغیر پاک و ہند میں مختلف نسلوں، مذاہب، علاقوں اور زبانوں والے لوگ بستے تھے۔ سب کے اپنے عقائد، اپنے رسم و رواج اپنی حکایات اپنی تاریخ، اپنا کلچر، اپنی غذائی عادات اور اپنا اپنا رہن سہن تھا۔ یہاں پولیس کے ادارے کو امن عامہ اور نفاذ قانون کے معاملات طے کرنے کے لئے کسی ایسے ملک کی پولیس کے مقابلے میں زیادہ باخبر، تربیت یافتہ، اور لبرل ہونے کی ضرورت تھی جس میں صرف ایک زبان بولنے والے رہتے ہوں ان کا ایک ہی نسل سے تعلق ہو ان کی تاریخ میں چھوٹے بڑے کے باوجود یکتائی اور ہم آہنگی ہو۔ لیکن بدقسمتی سے معاملہ الٹ رہا۔ مثلاً انگلستان میں آئرلینڈ کی آج تک کی شوریدگی یا علیحدگی پسندی کے باوجود ایک ہی قوم بستی ہے جبکہ برصغیر پاک و ہند میں رنگ، نسل، زبان، مذہب، عقیدے اور تاریخ میں بے شمار تضادات تھے۔ اس انگلستان میں پولیس کی تشکیل اور تربیت اور اس کی کارکردگی کے حوالے سے اسے واقعی ایک مہذب ادارہ ہی کہا جائے گا مگر ہمارے ہاں معاملہ برعکس ہو گیا، پولیس فورس میں وہ لوگ لائے گئے جو تعلیم کے اعتبار سے بھی ناقص تھے۔ کلچرل تضادات سے بھی بے خبر تھے، عقائد کے حوالے سے مختلف گروہوں کے احساسات و جذبات اور سوم و قیود سے نہ صرف بے خبر تھے یا کم علم تھے بعض اوقات ایک دوسرے کے متحارب بھی ہو جایا کرتے تھے۔ ان حالات میں پولیس کا ادارہ افہام و تفہیم اور گفت و شنید کے ذریعے معاملات کو سلجھانے کی بجائے طاقت کے استعمال پر انحصار کرتا جس کا لامحالہ نتیجہ یہی نکلتا کہ یہ ادارہ لوگوں کی نظر میں مشکوک اور بدنام رہا حالانکہ اس کی مدنی افادیت کے اندر سے ہر ایک تسلیم بھی کرتا

کیونکہ بحران کی صورت میں بہر طور وہ پولیس کو ہی مدد کے لئے پکارتا۔

پولیس کی موثر معاشرتی افادیت کے بعض پہلو یہ ہیں

آفات سماوی میں لوگوں کی مدد کے لئے اگر کوئی ادارہ سب سے پہلے میدان میں اترتا وہ پولیس کا ادارہ ہی ہوتا' ہمارے ہاں سیلاب نے بارہاوسیع پیمانے پر بربادی کی۔ اس سیلاب کی آفت کے بعد پنجاب' سندھ' سرحد میں ہر بار پولیس نے ابتداً لوگوں کی مدد کے لئے نہ صرف پہل قدمی کی بلکہ مجموعہ طور پر اچھی کارکردگی کا بھی مظاہر کیا۔ مزید ہنگامی حالات میں ان کی مدد کے لئے فوج اور دوسری نیم فوجی تنظیمیں بھی میدان میں اتریں۔ بلکہ اگر لفظاً لفظاً ان کے فرائض کی تعبیر کی جائے تو اس میں ان پر زیادہ ذمہ داری نہیں ڈالی جاسکتی۔ تاہم اس ادارے کی ناقص یا کم معیاری یا سفارشی افرادی قوت یا بدعنوان افرادی قوت نے ان حالتوں میں بھی پولیس کو اس کریڈٹ سے محروم رکھا جس کی وہ سزاوار تھی۔

قیام پاکستان کے بعد کے حالات انتہائی مخدوش تھے۔ اتنے وسیع پر تبادلہ آبادی اور قتل و غارت گری میں بے شمار شکایات کے باوجود پولیس نے بہت حد تک معاملات کو انتہائی خطرناک صورت اختیار نہیں کرنے دیا اور بہت مشکل حالات میں کم از کم اپنے ہم عقیدہ لوگوں کے لئے بہت کام کیا۔ اعلی پولیس افسراین۔ اے۔ رضوی اس ضمن میں پولیس کی ان خدمات کی بھی بہت تعریف کرتے ہیں جو اس نے پنجاب اور سرحد میں مغویہ خواتین کی بازیابی کے لئے کیں۔ یہ ایک غیر معمولی ذمہ داری تھی اور غیر معمولی حالات میں نبھانی پڑی لیکن عمومی طور پر یہی دیکھا گیا کہ اس نے ایک اچھے مدنی ادارے کے طور پر بہتر کارکردگی دکھائی۔

سابق انسپکٹر جنرل پنجاب چوہدری سردار محمد کے مطبوعہ احکامات اور ہدایات میں جو 92-1991 سے تعلق رکھتے ہیں' پولیس کی بعض اہم ذمہ داریوں میں کوتاہی کی نشان دہی کی گئی ہے۔ انہوں نے ان کوتاہیوں کی وجوہ پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ مثلاً پولیس کا ایک ادارہ وہ ہے جو نفاذ قانون کے سلسلے میں عدالت کے معاون کے طور پر کام کرتا ہے۔ قانون کی کسی بھی نوع کی خلاف ورزی کرنے والے پر ہاتھ ڈالنے کا اختیار صرف اور صرف پولیس کو ہے۔ ریاست کے باقی کسی اورے کو ئی اختیار حاصل نہیں۔ ہر چند اجارہ داری کا لفظ

منفی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ تاہم کہا جاسکتا ہے کہ پولیس کو نفاذ قانون کے سلسلے میں وسیلے کے طور پر اجارہ داری حاصل ہے۔ اجارہ داری جہاں کہیں بھی ہو بہر طور کچھ آمرانہ قسم کی خرابیاں ساتھ لاتی ہے۔ مثلاً کسی معاملہ میں اس اختیار کا ناجائز استعمال۔ جیسے رات کے وقت چیکنگ کے دوران کسی جوڑے سے اس کے شادی شادہ ہونے کا سڑیفکیٹ یا نکاح نامہ مانگنا' بغیر وارنٹ کسی گھر کی تلاشی لینا' یا کسی کو پکڑ لینا' قانون کے بر خلاف گرفتار کئے گئے شخص کو گرفتاری کی وجوہات نہ بتانا نہ ہی اس کے وارثوں کو باخبر کرنا' کسی کو حراست میں لے کر تشدد سے لے کر عصمت دری تک کر جانا' کسی گاؤں میں جا کر کسی فریق کی عورتوں مردوں کی سرعام تذلیل کرنا۔ تو یہ صورت ہے جس میں پولیس کا ادارہ اختیار کی اجارہ داری کی بنا پر غیر مہذب اور سماج دشمن رویہ اختیار کر لیتا ہے۔ تاہم جب پولیس خلاف قانون سرزد ہونے والے واقعے کے بارے میں اپنے قاعدے قانون میں رہ کر اور اختیار کی غیر واضح اجارہ داری کے باوجود معاملہ کو اصل طریق کار یعنی عدالت کے ذریعے نمٹانے کی کوشش کرے تو اسے پولیس کے ادارے کا مہذب اور شائستہ کردار کہا جاتا ہے۔

پولیس' عدالت کی معاون ہوتی ہے اس لئے اسے عدالت تک معاملہ پہنچانے سے پہلے اس کی ترتیب و تفصیل کو ضابطوں کے مطابق بنانا ہوتا ہے تا کہ عدالت کہہ سکے کہ پولیس نے اپنے ملزم کا حق ادا کر دیا ہے اور عدالت کو قانون کی خلاف ورزی کرنے والے کو قانون کے مطابق سزا دینے کے سوا اور کوئی چارہ نظر نہ آئے۔ پولیس کا یہ وہ کردار ہے جو اس کا بنیادی کردار کہا جاسکتا ہے اور جس میں اس کی ہمہ وقت کڑی آزمائش ہوتی ہے۔ ہر خلاف قانون حرکت معاشرے کو پراگندگی کی طرف لے جاتی ہے اس میں انسانیت کم کر کے انسانیت کے مخالف عنصر زیادہ شامل کر دیتی ہے۔ اگر خلاف قانون کام کو روکنے میں پولیس کا ادارہ پختہ کردار ادا نہیں کرتا جس کی اس سے قانونی اور اخلاقی طور پر توقع کی جاتی ہے تو پھر یہ ادارہ عوام کی نظر میں بھی اور دوسرے اداروں کے نقطہ نظر سے بھی نہ صرف اپنی افادیت کھونے لگتا ہے بلکہ اس کا تصور بھی لوگوں داغدار ہونے لگتا ہے۔

پولیس قانون کو پامال کرنے والوں کو اگر پوری چابکدستی سے قابو میں نہیں لاسکتی تو اس کی پہلی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ متعلقہ پولیس کو نہ اس قانون کی شدھ بدھ ہے جس کو توڑا گیا نہ اپنے ضابطوں کی خبر ہے کہ کون سا ضابطہ یہاں پر لگانا ہے اور اس کی پکڑ کو موثر

بنانے کے لئے مزید کیا کیا اقدامات (دستاویزی اور دوسرے) کرنے ہوتے ہیں۔ گویا قانون سے لاعلمی' ضابطوں سے بے خبری اور فرض سے تساہل کی مجرم خود پولیس بن جاتی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہوتی ہے کہ متعلقہ اہل کار قانون توڑنے والے سے مک مکا کر لیتے ہیں یعنی رشوت اور دوسری بدعنوانیوں کے باعث قانون شکنی کی واردات کرنے والے سزا سے بچ جاتے ہیں حتیٰ کہ اخلاقی نفرین سے بھی ان کا بچاؤ ہو جاتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک طرف پولیس میں فرض سے مجرمانہ سرکشی کا رجحان تقویت پانے لگتا ہے تو دوسری طرف جرائم میں اسی بنا پر اضافہ ہونے لگتا ہے کہ محاسبہ کرنے والی طاقت یعنی پولیس خود مجرموں کی بغیراعلان کئے ساجھی بن جاتی ہے۔ یہ صورت رپورٹ لکھنے سے پہلے پیدا ہوتی ہے رپورٹ لکھنے کے بعد معاملہ مقامی عدالت اور پولیس کی پراسیکیوشن برانچ کے درمیان ہوتا ہے اگر مقدمہ اچھی طرح تیار کی گیا ہو۔ لیکن اگر پراسیکیوشن والے بدعنوانی کے اسیر ہو چکے ہوں تو اسے خود الجھا کر قانون شکن فرد کے بچ نکلنے کی گنائش پیدا کر دیتے ہیں اس مرحلے پر عدلیہ کا بھی ایک کردار ہوتا ہے اگر عدلیہ انتظامیہ سے الگ ہے تو وہ زیادہ آزادانہ طریق سے معاملہ کو دیکھ سکتی ہے کیونکہ آخر کار یہ عدلیہ ہی ہوتی ہے جس پر قانون شکن عناصر کی سرکوبی کا فرض عائد ہوتا ہے۔ اگر فوجداری عدلیہ کا حال بھی پولیس جیسا ہے(یعنی بدعنوانی میں عار نہیں) تو پھر قانون شکنی کا مرض معاشرے میں وبا بن جاتا ہے۔ ہمارے ہاں ابھی تک عدلیہ اور انتظامیہ الگ الگ نہیں ہوئیں نتیجہ یہ ہے کہ قانون شکنی کی جو لہر کبھی پایاب ہوا کرتی تھی اب سر سے گزرنے لگی ہے۔ معاشرہ میں عدلیہ کے علاوہ پولیس کے ادارے کی مدنی حیثیت کو بہتر انداز میں اسی صورت میں دیکھا جاسکتا ہے جب وہ قانون شکنی کی فضا کو پورے کنٹرول میں رکھے۔

فوجداری عدالتوں میں کیا کچھ ہوتا ہے؟ اس مرحلہ پر تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں' عدالت اور پولیس کا یاک خاص تعلق ہوتا ہے۔ اسی حوالے سے عرض یہ ہے کہ عدالت پولیس کے ذریعے ہی(فوجداری اور دیوانی) سمنوں کی تعمیل کراتی ہے۔ سمنوں کی تعمیل کے بارے میں ہمارے ملک میں حالت یہ ہے کہ ایک معروف مقدمہ میں قومی اخبارات کے چیف ایڈیٹر' رپورٹر اور ایسے ہی دوسرے افراد کے سمنوں کی تعمیل پورے ایک سال میں کرائی جاسکی۔ ایک معمولی کانسٹیبل جس کے پاس اپنی سواری تک نہیں ہوتی سمنوں

کی تکمیل کرانے میں کہاں کامیاب ہوگا۔ بلکہ اس وقت جو صورت ہے اس میں وہ یہ تو چاہے گا کہ زیادہ سے زیادہ سمن آئیں تا کہ وہ طلب کئے جانے والے افراد کے پاس جائے اور اپنی مٹھی گرم کر کے یہ رپورٹ کرنے لوٹ آئے کہ ''پتہ نامکمل یا گھر پہ نہیں ہے۔ گھر پہ تالا لگا ہے۔ ہمسائے بے خبر ہیں۔'' شنید یہ ہے کہ سمنوں کی عدم تعمیل میں جو کمائی ہوتی ہے وہ تھانے میں تقسیم ہوتی ہے۔ بہر طور قانون سے روگردانی کا مرض ان با اثر ایڈیٹروں سے لے کر ایک عام سے شہری سبھی کو لگا ہوا ہے اور یہ عادت اتنی پختہ ہو چکی ہے کہ ذمہ دار ایڈیٹر یا دوسرے باخبر اور با اثر افراد سمنوں کا معلوم ہو جانے کے باوجود خود ہی عدالت میں اپنا وکیل بھیج کر اطلاع پانے کا اقرار کرنے کو بھی تیار نہیں ۔ دوسرے لفظوں میں ہمارے معاشرہ میں ہر افراد اپنے سوا باقی سب پر قانون کی حکمرانی کا نہ صرف قائل ہے بلکہ مبلغ ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ قانون کی حکمرانی کی خواہش روز بروز پژمردہ ہوتی جاتی ہے۔

عدلیہ کے حوالے سے اس پہلو نے نفاذ قانون کو موثر بنانے کی بجائے پولیس کو ایک ادارے کے طور پر بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ اس میں قصور وار کون ہے؟ پولیس عدلیہ اور وہ لوگ جو کسی بھی مقدمہ میں ملوث ہیں یا ملوث کر دیئے گئے ہیں ۔ گویا تین فریق مل کر مہذب اور قانون پسند معاشرے میں قانون اور انصاف کی شکست کا اہتمام کر رہے ہیں۔

انتظامیہ کے مختلف شعبوں میں جن کا تعلق قانون اور ڈسپلن کے نفاذ سے ہے' پولیس کو پھر ایک اہم مقام حاصل ہے۔ یہ قانونی تقاضہ ہے کہ جو سیزر کا ہے وہ سیزر کو دیا جائے یعنی مالیہ' فیس' ضمانت' سرکاری بقایا جات' ضروری کاغذات ٹیکس وغیرہ ادا کئے جائیں اور اگر قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے یہ ادا نہ کئے جائیں تو پھر متعلقہ محکموں کے ذریعے یا عدالت کے ذریعے ان کی وصولی کا حکم حاصل کر لیا جاتا ہے۔ مگر وصولی اکثر محکموں کے بس کی بات نہیں ہوتی اور پولیس کی مدد لینی پڑتی ہے۔ یعنی مالی قانون کے نفاذ اور اس پر عملدر آمد میں بھی پولیس کو ایک افادی کردار ادا کرنا پڑتا ہے۔ تحصیلدار مالیہ یا آبیانہ کی وصولی کے بارے میں ایک فیصلہ سنانے کا مجاز ہے اگر وہ نادہندہ سے وصولی سے لے کر اس کی زمین یا جائیداد کی قرقی تک کے احکامات پر مسلح فورس یعنی پولیس کے ذریعے عملدر آمد کرنے پر مجبور ہے۔ اسی طور جب عدالت اس قسم کا فیصلہ کرتی ہے تو فیصلہ (یعنی قرآن) پر عمل در آمد کرنے کے لئے پولیس کو ایک فورس کے طور پر استعمال کرتی ہے۔

مفرور ملزموں کو پکڑنے کے لئے پولیس کی ڈیوٹی لگتی ہے، مفرور یا اشتہاری ملزموں یا مجرموں کی جائیداد کے بارے میں کوائف فراہم کرنے کی ذمہ داری پولیس کی ہے۔ جائیداد کی ضبطی یا قرقی پولیس کے ذریعے ہی انجام پاتی ہے۔ حتیٰ کہ فوج، نیوی یا ائیر فورس کے بھگوڑوں کو پکڑنے کا فریضہ بھی پولیس کو سونپا گیا ہے۔ گویا ضابطہ یا قانون کی اس نوعیت کی تعبیر یا فیصلے پر عملدر آمد پولیس کا کام ہے اور پولیس کا ادارہ اگر اس میدان میں اپنی اچھی کارکردگی دکھاتا ہے تو گویا وہ لاقانونیت کو روکنے اور قانون شکن عناصر کو سزا دلوانے میں موثر کردار ادا کر کے معاشرے کو زیادہ مہذب زیادہ پر امن، زیادہ منظم اور زیادہ تخلیقی بنانے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ یوں وہ خود محض ایک مسلح فورس کی بجائے مدنی اور تہذیبی اعتبار سے ایک قابل قدر ادارہ بن کرا بھرتا ہے۔

مدنی یا شہری معاشرہ میں پولیس یا کسی بھی ادارے کا کردار متعین کرنے میں دوسرے ادارے بھی اتنا ہی اہم کرردار ادا کرتے ہیں جتنا خود یہ ادارہ ۔ ان اداروں کی کارکردگی کا عکس ایک دوسرے میں نظر آتا ہے۔ اب یہ عکس کتنا خوبصورت عام سا یا مکروہ ہے۔ اس کا انحصار اس آئین اور قانون پر ہے جو معاشرہ کی راہیں اور طریق متعین کرتا ہے۔ ہر ملک میں پولیس کے لئے قوانین بنائے گئے ہیں اسی مجموعہ قانون سے اس ادارے کا ڈھانچہ کھڑا ہوتا ہے۔ اگر یہ مجموعہ قانون مدنی ضرورتوں اور تقاضوں کے عین مطابق ہے تو اس پر ابھرنے والا ادارہ بھی شائستہ مہذب اور مستعد ہوگا۔ برصغیر پاک و ہند، مشرقِ وسطےٰ، مشرق بعید یا یورپ امریکہ اورشمال و جنوب میں پولیس کے لئے بنیادی قانون بھی ہے اورضابطے بھی۔ پاکستان میں یہ مجمویہ قانون 1861ء میں بنایا گیا اور ضابطہ 1934ء میں۔ قیام پاکستان کے بعد ہم اپنے ادارں کو مجموعی طور پر کس سانچے میں ڈھالنا چاہتے تھے اور پولیس کو ایک آزاد معاشرے میں کیا کردار سونپنا چاہتے تھے؟ اس کا تعین کم از کم پچاس برس میں نہیں ہو سکا ، اگر یہ طے ہوگیا ہوتا کہ یہ ادارے جیسے ہیں ویسے ہی رہیں گے تو مایوسی تو ضرور ہوتی مگر اضطرار کی اس کیفیت اور ایک نادیدہ مثالی صورت سے ہم کنارہ کش ہو کر زیادہ حقیقت پسندی سے معاشرے کو اسی ڈگر پر نسبتاً بہتر طریق سے آگے لے جاسکتے تھے۔ لیکن ایسا ہوانہیں۔

پولیس کا کوئی افسر یا کوئی بھی ماتحت ایسا نہیں جو ڈیڑھ سو سال پرانے مجموعہ

قانون سے بے زار نہیں ہے یا یوں کہئے کہ اپنے اوقات کار' ضابطہ کار اور تقاضوں سے مطمئن ہے۔ پولیس کا ادارہ اسی صورت نفاذ قانون اور انسداد جرائم میں زیادہ موثر اور ترقی پسندانہ کردار ادا کرسکتا ہے جب وہ معاشرہ میں سب سے زیادہ سریع الحرکت ہو اور پھر موجودہ ہرطاقت اور ہر ہتھیار سے زیادہ طاقتور اورزیادہ موثر ہتھیاروں سے لیس ہو' فہم قانون کے لئے لازم ہے کہ اپنے شعبے کے بارے میں علم اگر مثالی نہیں تو معتبر ضرور ہو اور وہ اسے مسخ کرنے یا توڑنے مروڑنے کا سوچ ہی نہ سکے۔ جرائم پیشہ افراد کے مقابلے میں وہ بہتر طریق سے حرکت میں آسکے۔ اس کے اندر جرائم پیشہ عناصر یا ان کے نمائندے یا ان کے زرخرید نہ ہوں اور جہاں جہاں اسے براہ راست عوام سے واسطہ پڑے وہاں وہاں اس کے رویہ میں انسانیت' نرمی' حلیمی اور ہمدردی زیادہ ہو تاکہ اسے نفاذ قانون اور انسداد جرائم میں عوام کا بھرپور تعاون حاصل ہوسکے۔ ایک یہی ایسی صورت ہے جس میں پولیس کا ادارہ مہذب معاشرے کو زیادہ مہذب بنا سکے اور اضطرار اور اضطراب کی بجائے سکون ٹھہراؤ احساس تحفظ اور امن و امان دے سکے۔ چنانچہ لازم ہے کہ پرانے مجموعہ قانون اور ضابطوں کو اسی ڈھب سے تبدیل کیا جائے۔ تعلیم و تربیت کا معیار بدلا جائے' افرادی قوت کے بارے میں پچھلی تمام روایات کو ترک کر کے صرف میرٹ کی بنا پر نئے لوگوں کے لئے دروازہ کھولا جائے اور پولیس کے لئے بنائے قوانین اورضابطوں پر سب سے پہلے اسی سے عمل کروایا جائے۔

ایک زمانے میں پاکستان کے ایک معتبر اخبار میں بھرتی ہونے والا ضلعی نامہ نگار معاوضے کا سوال کرنے پر جواب پاتا تھا کہ ''کیا آپ کے لئے یہ اعزاز اور معاوضہ کافی نہیں کہ آپ اس نامور اخبار کے نامہ نگار ہیں؟ ایک دوسرے موقر اخبار والے اس شرط پر نامہ نگار رکھتے تھے کہ آپ بھی کھاؤ اور ہوسکے تو ہمیں بھی کھلاؤ۔ پولیس کی ملازمت نہ تو پہلے اخبار کے نامہ نگار کی وابستگی کی طرح کوئی اعزاز ہے کہ بے مزد مصروف کار رہیں اور نہ دوسرے اخبار کی طرح کہ بلیک میلنگ کریں خود بھی کھائیں اور ہوسکے تو اوپر والوں کو بھی کھلائیں ۔ پاکستان میں ہی نہیں دنیا بھر میں پولیس کا ادارہ اسی صورت میں اعلیٰ صفات کا حامل بن سکتا ہے جب اس کی افرادی قوت کو اپنے جائز اخراجات کے لئے تنخواہ کے علاوہ کوئی اور ذریعہ تلاش نہ کرنا پڑے۔ معاشرے میں سریع الحرکت فورس کے رکن کی حیثیت

سے مالی پریشانی سے ہر صورت رہائی ضروری ہے۔ چنانچہ یہ شکائیت بجا ہے کہ اس وقت عام پولیس والے کو چوبیس گھنٹے ڈیوٹی دینے کے بعد جو کچھ ملتا ہے اس سے اس کے تیس میں سے دس دن بھی آسانی سے نہیں گزر سکتے۔ اگر تنگی رزق کی یہی صورت رہے تو یہ توقع کرنا کہ مجموعی طور پر یہ ادارہ بدعنوانی' رشوت ستانی' تساہل' غفلت' دھڑے بندی اقربا پروری اور با اثر' برسرا قتدار یا صاحب ثروت مجرموں کی ڈکٹیشن کو ختم یا کم کردے گا۔ زیادتی ہوگی یہ سوچنا کہ جس سمگلر یا منشیات کے تاجر یا قبضہ گروپ کے سربراہ یا سیاسی ڈکیٹ نے ہوم منسٹر یا ہوم سیکرٹری کو اپنے شکنجے میں لے رکھا ہے وہ پولیس کے ادارے کی نفاذ قانون اور انسداد جرائم کی کوئی کارروائی چلنے دے گا۔ تو یہ بات ناممکنات میں آتی ہے۔ اگر یہ بات ناممکنات میں آتی ہے تو پھر یہ ممکن سمجھنا کہ یہ ادارہ معاشرہ کو مزید خوبصورت' پر امن اور قانون کا احترام کرنے والا معاشرہ بنا سکے گا سرا سر خوش فہمی بلکہ خام خیالی ہے۔

دنیا کے سبھی ممالک میں کافی دیر سے یہ بات زور دے کر کہی اور بعض جگہ کی بھی جارہی ہے کہ پولیس کے ادارے و تعلقات عامہ پر خاص توجہ دینی چاہئے کیونکہ اس محکمہ کو دوسرے سارے اداروں یا محکموں کے مقابلے میں عام کے تعاون کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ نفاذ قانون' انسداد جرائم اور امن عا امان ان سب میں اگر محکمہ کو عوام کا تعاون حاصل نہ ہو' یا عوام کی طرف سے مخاصمانہ رویہ اختیار کیا گیا ہو تو پھر اس کی کامیابی بطور مدنی ادارے کے ناممکن ہے۔ ہمارے جیسے ممالک کو جو آج بھی نو آبادیاتی ڈھانچے میں جکڑے ہوئے ہیں جو پولیس ورثے میں ملی۔ اسے عوام سے بالا را دہ دور رکھا جاتا' قاعدہ قانون کی بجائے حاکم اعلیٰ کے حکم کا غلام سمجھا جاتا اور اس طور اس محکمہ کی اوپر والی سطح کو ایک طرح فری میسن والی خفیہ تحریک کی طرح بنا کر رکھ دیا گیا۔ لوگوں پر صرف اس کی دہشت طاری کر کے انہیں جرائم یا ناپسندیدہ افعال سے باز رکھنے کا حربہ استعمال کیا گیا، نتیجہ محتاج بیان نہیں۔ برصغیر پاک و ہند میں اکبر کے عہد سے لے کر بعد تک تھانوں یا چوکیوں پر علاقے کے سبھی لوگوں کے نام پتے کا اندراج ہوتا تھا حتیٰ کہ آنے جانے والوں کا بھی۔ کوئی باہر سے آتا اور ناواقف ہوتا تو انہی پولیس والوں سے راہ نمائی حاصل کرتا۔ تھانے چوکی کے اندر جانے سے اسے خوف نہیں آتا تھا بلکہ سے وہاں دوستانہ راہ نمائی ملتی تھی۔ آج صورت حال اس کے بالکل الٹ ہے۔ پولیس بعض اوقات اتنی بے خبر ہوتی ہے کہ اسے اپنے علاقے کے

بستہ الف اور بستہ ب کے بدمعاشوں کے گھروں' اڈوں' ٹھکانوں' جائیدادوں اور دوسرے رابطوں تک کا علم نہیں ہوتا۔ اپنے علاقے کی گلیوں سڑکوں تک سے آشنائی نہیں ہوتی کجا کہ اسے یہ علم ہو کہ علاقے میں کتنے اعلیٰ کاریگر' انجینئر اور دوسرے نامور لوگ رہتے ہیں جن کی عزت کرنے سے ان کی اور ان کے تھانوں کی توقیر پیدا ہوگی۔ قانون شکن اور جرائم پیشہ افراد کو بے حیثیت کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ پولیس خود ان شرفا کی بالا رادہ پذیرائی کرے جو مختلف شعبوں میں ملکی یا شہری قصبے کی سطح تک عوام میں احترام وعزت کما چکے ہیں۔ پنجاب کے سابق آئی جی سردار محمد چوہدری نے اپنے تحریروں میں پولیس والوں کی توجہ اس طرف منعطف کرائی کہ انہیں علاقے میں نیک نامی اور عوام سے تعاون حاصل کرنے کے لئے نجیب لوگوں سے راہ ورسم رکھنی چاہئے کہ اس طرح فرد کے کردار میں بھی ایک روحانی طاقت پیدا ہوتی ہے۔ تعلقات عامہ کی ایک نہیں مذید صورتیں ہوسکتی ہیں۔ مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر کسی ملک کی کسی ہمسائے یا کسی دور کے ملک سے کوئی مخالف نہیں' اسے کسی طرف سے مسلح حملے کا خدشہ نہیں تو وہ فوج کے بغیر بھی قائم رہ سکتا ہے' لیکن معاشرے میں نفاذ قانون' انسداد جرائم ،نظم و ضبط اور دوسری مدنی ضرورتوں کے لئے پولیس کا ادارہ رکھنے پر ہر ملک مجبور ہے کیونکہ پولیس ایک اہم معاشرتی اور تہذیبی ضرورت ہے۔

نادر شاہ نے مغل بادشاہ محمد شاہ کی خوبیوں کو بھی گہنا کر رکھ دیا تھا۔ مثلاً یہ کہ اس کے عہد میں' کم از کم اس کی نظر میں' عدلیہ اور انتظامیہ کی الگ الگ حیثیت تھی اور اسے کم از کم اتنی قدرت حاصل تھی کہ وہ ان دنوں کو اپنی حدود سے تجاوز کرنے کی اجازت دینے کے لئے تیار نہ تھا۔ خافی خان کے حوالے سے پروفیسر عبدالرشید نے اپنی کتاب History of the Muslims of indo.pakistan Sub- Continent(1707.1806) کے صفحہ(90) پر لکھا ہے۔ ''سدی فولاد شہر دہلی کا کوتوال تھا اس کے بیٹے کی رائے شیوداس کے بیٹے سے دوستی تھی۔ ایک روز سدی کے سیکرٹیری نے شیوداس کے دو بیٹوں کو قتل کر دیا۔ مقتول کی ماں نے جو بیوہ بھی' احتجاج کی خاطر قلعہ دہلی کے ایک دروازے پر واویلا کیا اور انصاف کے لئے فریاد کی ۔ محمد شاہ نے مقدمہ قاضی کو بھیج دیا کہ قرآن کے مطابق انصاف کیا جائے۔ قاضی نے اپنے کوتوال دوست فولاد کے عزیزوں کو بچانے کے لئے اپنے فیصلہ

میں ایک دلیل یہ دی کہ قتل کا کوئی ثبوت نہیں ہے اور دوسرے یہ کہ ایک مسلمان کی جان کے عوض پانچ کافروں کی جان لینے کی اسلامی شرط ہے ۔ بیوہ نے کہا کہ اگر سدی کو سزا دی جائے تو وہ اپنے بیٹوں کی بیواؤں کے ساتھ اپنے آپ کو بھی تہہ تیغ کئے جانے کے لئے پیش کرتی ہے۔ جب معاملہ بادشاہ کے پاس پہنچا تو اس نے قاضی سے پوچھ لیا کہ قرآن میں ایک مسلمان کے عوض پانچ کافروں کی جان لینے کا حکم کہاں ہے۔؟ قاضی کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ اور ظاہر ہے کہ بادشاہ کو قاضی اور کوتوال کی دوستی کا علم تھا چنانچہ سدی کو پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔

ایک دوسری مثال میں ہمہ مقتدر بادشاہ اور اس کے چیف جسٹس کے تعلقات اور دوسرے امور سے متعلق ایک واقعہ ڈاکٹر آئی ایچ قریشی نے اپنی کتاب The Administration of the Mughal Empire میں (صفحہ 184) پر مولوی عبدالقادر بدایونی کی کتاب منتخب التواریخ کے حوالے سے درج کیا ہے۔ بات یوں ہوئی کہ متھرا شہر میں ایک قاضی نے ایک مسجد بنانے کا حکم دیا۔ مگر ایک ثروت مند برہمن نے اسلام کی مخالفت میں مسجد کے لئے آیا ہوا سامان تعمیر اٹھالیا۔ قاضی نے برہمن کو عدالت میں طلب کرلیا۔ برہمن نے عدالت کے حکم کی پرواہ نہیں کی بلکہ پیغمبرﷺ اسلام کی شان میں گستاخی بھی کی ۔ قاضی نے مرکزی حکومت یعنی شعبہ عدالت کے سربراہ (چیف جسٹس) صدر الصدور اور قاضی القضاۃ شیخ عبدالنبی کو شکائت بھیجی جس نے برہمن کو عدالت میں طلب کر لیا۔ اس نے اس عدالت میں بھی بد زبانی جاری رکھی۔ جس پر چیف جسٹس نے اسے موت کی سزا سنادی۔ مغل عہد میں رواج یہ تھا کہ موت کی سزاؤں کی تصدیق بادشاہ وقت کیا کرتا تھا۔ عبدالنبی نے اپنا فیصلہ بادشاہ اکبر کو بھیج دیا۔ ان دنوں مذہب کے بارے میں اکبر کا رویہ بدلا ہوا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ برہمن کو موت کی سزا دی جائے ۔ حرم میں موجود ہندو برہمنوں نے بھی بادشاہ پر دباؤ ڈالا ۔ چنانچہ بادشاہ نے پہلے تو مقدمے میں کوئی نقص ڈھونڈنے کی کوشش کی ۔ یہ نہ ہوا تو اس نے واقعات کے بارے میں خفیہ انکوائری ایسے علما یا افراد سے کرائی جو عبدالنبی کے خلاف تھے۔ واقعات کے بارے میں تو ثابت ہوگیا کہ وہ سچے تھے یعنی برہمن نے وہ کچھ کہا اور کیا تھا جس پر اسے موت کی سزا دی گئی تھی۔ اب معاملہ یہ بھی تھا کہ اکبر خود اتنا عالم فاضل نہ تھا کہ آزادانہ طور پر رعائتی طریق انصاف میں تبدیلی کر کے فیصلہ کو

منسوخ کرنے کی جرات کر سکتا ۔ آخر اکبر نے خود عبدالنبی سے اشارے اشارے میں سزائے موت تبدیل کروانے کی کوشش کی مگر عبدالنبی نے ایسا کرنے سے صاف انکار کر دیا اور آخر کار برہمن کو پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔

یہ اکبر کی عہد کی اس عدلیہ کا ذکر ہے جس نے کم از کم مذہبی طرز عدل سے انحراف کرنے سے انکار کر دیا اور یقیناً انکوائری میں اس وقت کی پولیس نے بھی حقائق کو توڑنے موڑنے کی کوئی کوشش نہیں کی ہوگی جبکہ اکبر ہی کے عہد میں پولیس کی حیثیت اور بادشاہ کی نظر میں اس کے مقام کے بارے میں پولیس بھی باخبر تھی۔

ان دنوں اکبر نے لاہور کو پایہ تخت بنالیا تھا انہی دنوں پنجاب میں مغل سلطنت کے خلاف کہیں کہیں ہوا چل رہی تھی۔ حافظ آباد اور ساندل بار کے علاقے میں بھٹی قبیلے کا ایک سردار دلا بھٹی (عبداللہ بھٹی) بادشاہ کے دو دارالحکومت دہلی اور لاہور کے بارے میں جو رویہ رکھتا تھا اسے کسی نا معلوم شاعر نے اس مصرعے میں منعکس کر دیا ہے:

میں بھوراں دلی دے کنگرے تے بھاجڑ پا دیاں تخت لاہور

(میں دہلی کے قلعے کے کنگرے اڑادوں گا اور لاہور میں ہلچل ڈال دوں گا)

صوفی شاعرہ شاہ حسین کے سوانحاتی فارسی منظوم تذکرہ حقیقت الفقرا میں بتایا گیا ہے کہ باغی بھٹی کو فوج سخت مقابلے کے بعد گرفتار کر کے لائی۔ مقدمہ چلا اسے سزائے موت ہوئی ۔ مقدمہ سیاسی تھا اس لئے سیاسی اختلاف رکھنے والوں یا بادشاہ کے خلاف بغاوت کا سوچنے والوں کو عبرت دلانے کے لئے دلا بھٹی کو سرعام پھانسی دینے کا حکم ہوا ۔ لاہور شہر کا ایس ایس پی یعنی کوتوال علی تھا۔علی کو یہ بھی حکم تھا کہ جب بھٹی کو پھانسی پر چڑھایا جائے تو وہ بادشاہ کے بارے میں جو کچھ کہے اس کی من وعن بادشاہ کو رپورٹ پیش کی جائے۔ بھٹی نے بادشاہ کو بہت برا بھلا کہا اور بھی جانے کیا کیا کہا علی کوتوال نے سب کچھ لفظ بلفظ بادشاہ کے گوش گزار کر دیا۔ بادشاہ کو سن کر اس قدر طیش آیا کہ اسی وقت یہ حکم ہوا کہ ایس ایس پی لاہور ملک علی کوتوال کو پوری ذلت کے ساتھ قتل کیا جائے اور اسی وقت قبر میں ڈال دیا جائے۔ چنانچہ ہوا یوں کہ بادشاہ کا باغی دلا اور بادشاہ کا سب سے باوقار ملازم ملک علی کوتوال ایک ہی تلوار سے ایک ہی دن قتل کئے گئے اور اسی روز میانی صاحب کے قبرستان میں دفن کئے گئے۔فرق صرف اتنا تھا کہ بھٹی کی تدفین تو اتنے خفیہ طریقے سے

کی تھی کہ صدیوں اس کی قبر کا راز سینہ و سینہ عزیزوں تک منتقل ہوا اور اس صدی کے دوسرے نصف میں اسے عام کیا گیا۔ جبکہ علی کوتوال ایس ایس پی کے خاندان کو یہاں پر خاندانی قبرستان تک بنانے کی اجازت دے دی گئی۔

اس آخری مثال سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اکبر کی نظر میں ایک شہر کے کوتوال کی کیا حیثیت تھی اور اس حوالے سے پولیس کی اہمیت کیا تھی اور دوسرے عدل کے معاملے میں بادشاہ ماورائے عدالت قتل کرتا اور کرواتا تھا یعنی معاملات ماورائے عدالت بھی ہوتے تھے۔

برصغیر میں عدلیہ اور پولیس کی یہ صورت ایک اچھے اور نیک نام بادشاہ کے عہد میں تھی تو پھر مسلمانوں کے آنے سے پہلے کیا صورت چلتی رہی ہوگی؟ یعنی مغلیہ خاندان سے پہلے بھی پولیس جیسا کوئی نہ کوئی محکمہ تو ہوگا جو نہ صرف شہر میں قانون کے نفاذ اور امن و امان بحال رکھنے کا ذمہ دار ہوگا ۔ بلکہ عدالت میں ملزم پیش کرنے یا جیلوں میں قیدیوں کی نگرانی کرنے یا ٹیکسوں کی وصولی کے سلسلے میں متعلقہ محکموں کے مددگار کے طور پر کام کرتا ہوگا۔ گویا پولیس کی قسم کا محکمہ کسی نہ کسی صورت میں انسانی سوسائٹی کے وجود میں آنے کے ساتھ وجود پا گیا ہوگا۔

اکبراور اس کے بعد کی پولیس (کوتوال' فوج دار' دراوغہ) کی بذات خود ایک لمبی داستان ارتقا ہے تاہم اکبر کے عہد میں لندن میں برطانوی حکومت نے 1585 ء میں ایک قانون بنایا تا کہ لندن شہراور دوسری بستیوں میں شہریوں کے لئے مزید تحفظات اور مراعت فراہم کی جاسکیں۔ قانونی طور پر پولیس کی باقاعدہ روائت 1285ء میں شاہ ایڈورڈ اول کے عہد میں ڈالی گئی تھی۔ (رسمایہ کام 1078 ء سے شاہ ولیم نے شروع کیا) اکبر کے ہم عصر عہد میں برطانیہ میں لندن اور پورے ملک کی صورت حال انتہائی خراب تھی۔ چاروں طرف جرائم کی لہر تھی۔ شاہراہوں پر ڈاکو سرعام لوٹ مار کرتے پھرتے تھے۔ نقب زنی اور چوری کی کوئی انتہا نہیں تھی اور دریائے ٹیمز پر قزاق بلا روک ٹوک لوگوں کو تختہ مشق بنا دیتے تھے۔ محلوں اور گلیوں میں جو چوکیدار مقرر کئے جاتے نا اہل سست اور نا قابل اعتبار بن گئے تھے اور تو اور وہ چوری چکاری میں ملزموں کے ساتھ مل کر مال غنیمت میں اپنا حصہ بھی وصول کیا کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ انیسوں صدی کے شروع میں لندن اور ملک کے دوسرے

حصوں میں ہر بائیس باشندوں میں سے ایک جرائم پیشہ ہوتا تھا۔ جرائم پر قابو پانا اس لئے بھی مشکل ہوگیا تھا کہ پولیس کی تعداد بہت کم تھی مثلاً پندرہ مربع میل کے علاقے میں صرف تین کانسٹیبل اور تین ہیڈ کانسٹیبل ہوتے تھے۔ اتنے ہی رقبے میں تقریباً چھتیس گھنٹے میں چوری کی کم از کم ایک واردات ضرور ہوجاتی تھی اور اکثر وارداتیں کامیاب بھی ہوتیں۔ بعض علاقوں (آج کی طرح میونسپل وارڈوں یا بلاکوں) میں حالت زار یہ تھی کہ چوراچکے گلیوں کے نکڑ پر کھڑے ہوجاتے اور آنے جانے والوں سے جو ملتا لوٹ لیتے۔ یہ حال ان محلوں یا علاقوں کا تھا جن میں پولیس موجود ہوتی تھی۔ مگر بہت سے علاقے ' دیہات' شہر ایسے تھا جن میں کوئی باقاعدہ پولیس نہیں ہوتی تھی کہیں کہیں لوگوں نے اپنے تحفظ کے لئے نجی سطح پر کچھ سامان کر رکھا تھا اور لوگوں کو سرکاری تحفظ حاصل تھا نہ قانونی مدد' نہ اتنی دلیری کہ چوروں کے خلاف سرکار میں جاکر فریاد کرسکیں۔ لوگ لوٹے اور مارے جاتے تھے اور چوروں ڈاکوں کے ہاتھوں بلیک میل بھی ہوتے تھے۔ چنانچہ 1829ء میں جب انگریز (سندھ' پنجاب' سرحد'بلوچستان اور کشمیر کو چھوڑ کر باقی سارے ہندوستان کو اپنا مطیع بنا چکے تھے) وزیر داخلہ سر رابرٹ نے اس افسوسناک صورت حال کے پیش نظر دار الحکومت اور دوسرے بڑے شہروں کی پولیس کو زیادہ منظم اور موثر بنانے کے لئے قانون منظور کروادیا۔ اسے میٹرو پالیٹین پولیس ایکٹ کہا جاتا ہے مگر اس قانون کے بننے تک جو جو کچھ ہوا اس کی مختصر روا داد اظہر حسن ندیم (ڈی آئی جی) نے اپنی کتاب The punjab police in a comparative perspective کے صفحہ 2 پر دی ہے۔

1663ء میں لندن میں تنخواہ یافتہ رکھوالے یا چوکیدار بھرتی کئے جانے لگے۔ ان کا نام چارلی پڑ گیا تھا۔ ان کا کام رات کو پہرہ دینا تھا مگر معاوضہ اتنا کم تھا کہ اس اسامی کے لئے صرف ایسے بوڑھے اور کاہل لوگ آتے تھے جن کے لئے کوئی دوسرا کام کرنا مشکل ہوگیا تھا۔ یوں کئی صدیوں تک جسٹس آف پیس (مجسٹریٹ) یہ چوکیدار اور کانسٹیبل ہی انگلستان اور ویلز میں امن وامان کی رکھوالی کے فرایض انجام دیتے رہے۔

دریائے ٹیمز کے کنارے تجارتی ساز وسامان کے کئی گودام وغیرہ تھے جو چوروں کے ہاتھوں اکثر لوٹے جاتے چنانچہ ایک بحری کپتان اور ایک مجسٹریٹ نے مل کر ایک سکیم پر عمل کیا۔ جس کے بعد دریا اور لندن کی بندرگاہ میں چوری چکاری کی وارداتوں میں نمایاں

کمی آ گئی۔ یوں یہ دریائی نگران لندن میں پولیس کا پہلا بڑا پیشہ ورانہ پولیس کا محکمہ بنانے کے ذمہ دار ہوئے۔ چوروں اور سمگلروں کو اس پولیس سے زبردست بیر تھا چنانچہ ایک مرتبہ دونوں میں گھمسان کی لڑائی بھی ہوئی۔ مقابلہ ہوا اس میں ایک آدمی پولیس والوں کا بھی مارا گیا لیکن دریائی پولیس نہ صرف کامیاب ہوئی بلکہ لوگوں کے دلوں میں اس کا احترام اور عزت بھی پیدا ہوئی اور لوگوں نے پولیس کو امن و امان قائم کرنے کی فورس سمجھنا شروع کر دیا۔ بعد میں یہ دریائی پولیس بھی لندن کی میٹرو پالیٹن پولیس کا حصہ بن گئی۔

کچھ عرصہ بعد لندن میں سات مجسٹریٹ مقرر کئے گئے اور ان کے ساتھ چھ کانسٹیبل بھی تعینات کئے گئے جنہیں مہینہ وار تنخواہ دی جاتی تھی۔ انہیں اجازت دے دی گئی کہ اگر کسی پر شبہ ہو کہ وہ جرم کرنے والا ہے تو اسے گرفتار کرلیں اور مجسٹریٹ کے سامنے پیش کر دیں ۔ اسے دراصل جرم سرزدہ ہونے کے بعد کارروائی کے مقابلے میں جرائم کی روک تھام کے لئے پیشگی کارروائی سے منسوب کیا گیا۔

اس کے کچھ عرصہ بعد ایک گھوڑا سورا دستہ تیار کیا گیا جس میں سوار فوج کے پچاس کے قریب باقاعدہ تربیت یافتہ اور تجربہ کار سپاہی بھرتی کئے گئے۔ ان دنون لندن کی طرف آنے والی ہر شاہراہ پر ڈاکوؤں کا قبضہ تھا۔ایک طرح سے یہ قبضہ چھڑانے کے لئے طاقت کا مظاہرہ ضروری قرار دیا گیا۔ ان گھوڑ سواروں نے ان ''مقبوضہ'' سڑکوں پر گشت شروع کر دیا۔ ان کی باقاعدہ وردی بھی ہوتی تھی جس میں سرخ واسکٹ بھی شامل تھا اس بنا پر ان کا نام رابن ریڈ بریسٹس پڑ گیا تھا۔ ان کی وجہ سے سڑکیں صاف ہوئیں ۔اس کامیابی کی بنا پر اس فورس میں اضافہ ہوتا گیا اور پھر انہیں ملک کے دوسرے حصوں میں ہی نہیں بھیجا گیا بلکہ بیرون ملک بھی بھیجا جانے لگا۔ انگلستان میں بھی یہ پہلی باوردی پولیس بھی۔ شہر کے اندر ٹھگوں اور فریب کاروں کو ختم کرنے کرنے کے لئے پیدل افراد پر مشتمل دستہ کھڑا کیا گیا جو عام کپڑوں میں ملبوس شہر میں گشت کر کے ناپسندیدہ عناصر اور وارداتیوں کو روکنے میں ایک حد تک کامیاب ہوا۔

انیسویں صدی کی پہلی اور دوسری دہائی میں دیہاتی لوگوں نے شہروں کا رخ کرنا شروع کر دیا۔ شہروں میں فیکٹریاں لگنا شروع ہوئیں۔ فرانس سے جنگوں کے خاتمہ کے بعد تربیت یافتہ فوجی بھی فارغ ہونے لگے تھے۔ شہروں کی آبادی بھی بڑھنے لگی اور شہروں میں

بے روزگاروں نے احتجاج شروع کیا۔ 1819ء میں مانچسٹر میں ساٹھ ہزار افراد ایک معروف خطیب کی تقریر کے لئے اکٹھے ہوئے۔ دنگا فساد کے خطرے کے پیش نظر مقامی مجسٹریٹ نے گھوڑ سوار پولیس کو حکم دیا کہ خطیب ہنری ہنٹ کو گرفتار کیا جائے مگر اسے گرفتار کرنے کی بجائے پولیس والے ہجوم سے بھڑ گئے۔ گیارہ آدمی ہلاک ہوئے اور چار سو کے قریب زخمی۔ جن میں سو کے قریب عورتیں بھی شامل تھیں۔ اس واقعہ کو پیڑلو کا قتل عام کہا جاتا ہے جس سے حکومت بڑی بدنام ہوئی۔ اس کے بعد حکومت نے بڑے اجتماعات کو روکنے کے لئے قوانین بنانے پر زیادہ زور دیا اور اس مقصد کے لئے ایک ملیشیا بھی قائم کی جو ہجوم کو منتشر کرنے کے لئے پہلے سے بھی زیادہ تشدد اور مار پیٹ سے کام لیتی تھی۔

پولیس بدنام تھی، حالات بھی خراب تھے اس لئے پولیس اور عوام میں مقابلہ جاری رہا۔ پولیس کے اختیارات کے بارے میں عام سمجھنے لگے تھے کہ وہ ان کے تحفظ کی بجائے انہیں دبانے اور ان پر مظالم توڑنے کے لئے بنائی گئی ہے۔ ادھر پولیس کے مختلف شعبوں کو اکٹھا کر دیا گیا۔ سٹاف کی تعداد کئی گناہ زیادہ ہوگئی۔ لندن اور صنعتی شہروں برمنگھم، مانچسٹر اور لورپول میں پولیس اور عوام کے درمیان بار ہا تصادم ہوا۔ 1833ء میں لوگوں نے پولیس پر پتھراؤ کر کے ایک پولیس والے کو مار دیا جبکہ تین پولیس والوں کو خنجر مار کر ہلاک کر دیا گیا۔

پیل ایکٹ کی منظوری سے پہلے کے حالات کی کچھ تفصیل این۔ اے۔ رضوی نے بھی اپنی کتاب Our Police Heritage میں دی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان دنوں لندن میں آٹھ ہزار ایسی جگہیں تھیں جہاں چوری کا مال خریدا جاتا تھا اور چوری اور راہ زنی کی وارداتوں پر ہر سال دس لاکھ سے لے کر بیس لاکھ پاؤنڈ تک کی مالیت کا سامان بھینٹ چڑھ جاتا۔ شہر میں کم از کم تین ہزار افراد کا گزارہ چوری پر ہوتا تھا یا پیشہ ہی چوری تھا۔ دریائے ٹیمز کے کنارے پانچ ہزار کا رکن ایسے تھے جن کی پرورش ہی مجرموں کے درمیان ہوئی تھی۔ یہ تھے وہ حالات جن میں پیل ایکٹ بنا۔ پولیس کا ڈھانچہ معقول صورت میں استوار کیا گیا۔ مقامی پولیس کی خدمات اور معاوضے کی ذمہ داری بلدیاتی اداروں پر ڈالی گئی۔ کسی حد تک اسی قسم کے ڈھانچے اور روایات کو برصغیر پاک و ہند میں کوتوالی محکمہ کی روایات کے ساتھ ملا کر پولیس کی تشکیل کی گئی۔

برصغیر پاک و ہند میں بہر طور شہریوں اور ان کی جائیداد کے تحفظ کے لئے کسی نہ

کسی صورت میں ایک فورس ضرور قائم رہی ہے۔ معرف تاریخ دان رومیلا تھا پر نے اپنے ایک مضمون The Punjab Under Emperor Asoka میں (جو فوجا سنگھ کی مرتب کردہ کتاب History of the Punjab جلد اول میں شامل ہے) لکھا ہے کہ اشوک نے جو بڑے بڑے کتبے مختلف جگہوں پر نصب کیے تھے ان میں افسروں اور انتظامیہ کے بارے میں بھی اشارے موجود ہیں ۔ زبان سنسکرت ہے مگر یہ دو اڑھائی سو سال قبل مسیح کے نصب کے گئے کتبے بتاتے ہیں کہ ان میں اعلے افسروں کے لئے مہان متہ (سنسکرت مہامنتری) کا لفظ استعمال ہوا ہے اور یہ لفظ موریہ خاندان کے عہد میں کثرت سے استعمال ہوتا تھا۔ مہان متہ کے زمرے میں آنے والے افسروں کو بھی کئی حصوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ بدھ مت کی بعض کتابوں میں بھی یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ مہان متہ قابل احترام اور بلند رتبہ افسروں کو کہا جاتا تھا۔

یہ افسر مختلف صوبوں کی سب ڈویژنوں میں گرپوں کی صورت میں کام کرتے تھے۔ ایک گروپ میں تین بڑے افسر شامل ہوتے تھے پرانديسيكا ' راجوکا اور یوکتا ان کے ساتھ ان کے مددگار مزید افسر اور اہل کار بھی ہوتے تھے۔ پرانديسيكا وہ افسر کہلاتے تھے جو ایک انتظامی یونٹ میں عدلیہ اور انتظامی کے امور سرانجام دیتے تھے۔ گویا ان کاموں میں ایک تھا مالیہ اکٹھا کرنا اور دوسرا شہری اور دیہی علاقوں میں نظم ونسق اور امن وامان قائم کرنا پرانديسيكا زمرے کے افسروں کر مرتبہ تینوں گروپوں میں سب سے اعلیٰ ہوتا تھا۔

راجوکا افسر زیادہ تر دیہی علاقوں میں فرائض انجام دیتے تھے اور اشوک کے کتبے کے حوالے سے انہیں سینکڑوں ہزاروں لوگوں سے واسطہ پڑتا تھا یہ ایک طرح سے عوام کی فلاح و بہبود پر توجہ دیتے تھے۔ یوں انہیں اشوک کے الفاظ میں عوام کا مائی باپ بھی کہا جاسکتا ہے۔ وہ دیہی علاقوں میں صرف مالیہ ہی وصول نہیں کرتے تھے انتظامی اور عدالتی فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ گویا راجوکا افسر برصغیر میں آئی سی ایس یا سی ایس پی کے مرتبہ کے لوگ تھے۔ تیسرے افسر کو یاکتا کہا جاتا جو سب سے تیز ہوتا مگر وہ بھی ایک نچلی سطح پر اسی قسم کے فرائض سرانجام دیتا بلکہ اس کے ذمے دفتری اور مالی کام زیادہ ہوتے۔

افسروں کا ایک عہدہ پولیسیائی بھی تھا جو بادشاہ کے ایجنٹ کہلاتے تھے اور علاقوں کے دورے بھی کیا کرتے تھے۔ نظم ونسق اور امن و امان سے متعلق دو طرح کے اہل کار

تھے۔ فوج اکثر سرحدوں کا دفاع کرتی ۔عام کو دشمن کی یلغاروں سے بچاتی ۔ ہر طرح کا تحفظ کرتی اور انتظامیہ میں سول افسروں اور اہل کاروں کو بھی مدد دیتی اور ہنگامی حالات میں بھی شہری انتظامیہ کی مدد گار ہوتی۔

این۔اے۔ رضوی کے مطابق چھ سو سے لے کر تین سو سال قبل مسیح تک برصغیر کے شمال مغربی علاقے میں بستیوں کے نیم آزادانہ انتظامی ڈھانچے ہوتے تھے۔ اکثر دیہات خود مختار ہوتے۔ گاؤں کا انچارج ایک سپرنٹنڈنٹ ہوتا جو ایک طرف مقامی آبادی کو جنگ اور امن کے دنوں تحفظ فراہم کرتا اور امن کے دنوں میں مالیہ اکٹھا کرتا۔ ابتدا میں گاؤں کے لوگ ہی سپرنٹنڈنٹ کو منتخب کرتے مگر بعد میں انتخاب کے بعد بھی بادشاہ اس انتخاب کی تصدیق کرنا ضروری سمجھتا۔ اس سپرنٹنڈنٹ یا دیہی ناظم اوا مرونہی کے بارے میں فیصلہ کرتا۔ عدالتی کام کرتا تنازعات اور جھگڑوں کا فیصلہ کرتا اور جرمانے کی سزا دیتا۔ بدھ عہد کی داستانوں میں سے ایک میں ایک ایسے دیہی چودھری کا ذکر کیا گیا ہے جو نظم و نسق کا انچارج تھا مگر قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے موقع پر پکڑا گیا۔ اس نے اپنے مرتبہ کے باعث جارحانہ طریقے سے اپنا دفاع کیا لیکن لوگوں نے قانون کی خلاف ورزی پر اسے مارا پیٹا اور گاؤں سے نکال دیا۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ بادشاہ کے بعد سپہ سالار کا مرتبہ تھا جو امن کے دنوں میں عدالتی فرائض بھی سرانجام دیتا تھا۔

۵۰۰ قبل مسیح منو کے قوانین پوری شدت کے ساتھ نافذ تھے ۔ان کا اثر اور باقیات اب تک موجود ہیں۔ ان قوانین میں پولیس کے محکمہ کی موجودگی بھی منعکس ہوتی ہے ان قوانین کے مطابق بادشاہ کا اہم فرض یہ تھا کہ اندرونی اور بیرونی تشدد کو روکے، مجرموں اور بد کاروں کو سزا دے۔ ریاست میں دورے کرے۔ چوکیاں قائم کرے اور ایجنٹ یا جاسوس ملازم رکھے۔ رعایا کا کام یہ بھی تھا کہ جرائم کے سدباب اور مجرموں کو سرکوبی کے لئے بادشاہ کی مدد کرے۔

تین سال قبل مسیح میں کوٹلیا نے ارتھ شاستر کے نام سے جو ریاستی ضوابط مرتب کئے ان میں اس بات پر زور دیا گیا کہ روز گار فراہم کیا جائے۔ انتظام لائق وزیروں کے ذریعے کئے جائیں اور لوگوں پر جاسوس مقرر کئے جائیں۔ کوٹلیا نے جاسوسوں کے نو گروپ تجویز کئے تھے جو معاشرے کے مختلف طبقوں کی جاسوسی کرتے تھے۔ ان میں بادشاہ کے

درباری اہل کار، کسان، تاجر اور پروہت یا جوگی شامل تھے۔ ان کی جاسوسی کے باعث بادشاہ کے لئے کسی کے لئے کسی متوقع فساد کو روکنا آسان ہو جاتا۔

موریہ خاندان کے بعد گپتا خاندان کی حکومت رہی پھر مابعد مسیح برصغیر میں بے شمار سیاح آئے۔ ان میں چین کے دو نامور سیاح فاہین اور ہیون سانگ بھی شامل ہیں۔ اول الذکر نے اس عہد کے ڈھانچے پر تو کچھ نہیں لکھا مگر ریاست میں امن و امان اور نظم و نسق کی بڑی تعریف کی ہے۔ اس نے یہ بھی لکھا کہ ملک میں حالات بہت بہتر تھے اور امن و امان کی یہ حالت تھی کہ اس میں کسی چور اچکے راہ زن یا ڈاکو سے اس کا واسطہ نہیں پڑا۔ ہیون سانگ نے بھی اس عہد کی بڑی تعریف کی مگر وہ خود دوبار راہزنوں کے ہاتھوں لٹ گیا تھا۔ ان دونوں سیاحوں نے جرائم کی روک تھام یا قانون کے نفاذ کے ذمہ دار محکموں کے بارے میں کوئی تفصیل نہیں چھوڑی۔ 647ء میں ہرش کا دور حکومت ختم ہوا تو پھر برصغیر میں نااتفاقی کا راج ہو گیا۔ سلطنت ٹکڑوں میں بٹ گئی جو آپس میں دست و گریباں ہونے لگے یوں ایک پختہ نظام حکومت جس میں پولیس کا محکمہ شامل تھا بکھرتا چلا گیا۔

اسی عہد میں جب برصغیر زوال پر تھا عرب میں اسلام کا آغاز ہوا اور عرب تہذیب نے ہمہ جہت ترقی کی اور دنیا کے ایک بہت بڑے حصے پر پھیل گئی۔ عرب تہذیب سے پہلے ایک طرف یونان اور روم کی تہذیب تھی اور دوسری طرف ایرانی تہذیب۔ برصغیر کی ہندو تہذیب کے بعد اس کے شمال مغربی حصوں میں بہت دیر تک ایرانی تہذیب اور طریق حکومت رائج رہا درمیان میں کچھ عرصہ کے لئے یونانیوں کی حکومت بھی رہی جو سکندر اعظم کے چھوڑے ہوئے جرنیلوں نے چلائی۔ لامحالہ ان سب تہذیبوں میں شہریوں کی مدد مجرموں کی سرکوبی، قانون کے نفاذ اور چھوٹے چھوٹے باہمی تنازعے طے کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی محکمہ یا تنظیم تو بہر طور موجود رہی ہوگی۔

63ء قبل مسیح میں آگسٹس کے عہد حکومت میں روم کے شہر میں جرائم اور بدکاری کو روکنے کے لئے پولیس قائم تھی مگر ہوا یہ کہ بعد کے حکمرانوں نے پولیس کے اس ادارے کو ظلم و ستم اور جبر کا سب سے بڑا ہتھیار بنا دیا۔ زوال روم کے بعد پولیس کے محکمے کے تمام آثار اور شواہد ناپید ہو گئے بہت عرصہ تک روم کی تاریخ میں پولیس کی کوئی واضح صورت نظر نہیں آتی پھر آٹھویں اور نویں صدی میں روم میں پولیس کا احیاء ہوا۔

شواہد یہی ہیں کہ طلوع اسلام سے قبل عربوں کے پاس پولیس اور عدلیہ جیسے ادارے نہیں تھے۔ لوگ قبائل میں بٹے تھے۔ ان قبائل کے اپنے رسوم رواج تھے جو سینکڑوں برسوں سے چلے آرہے تھے۔ یوں ہر قبیلے کے پاس اقدار اور اقتدار کا ایک اپنا سیٹ تھا۔ 600 قبل مسیح سے اسلام کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جس کا ایک اپنا ضابطہ حیات ہے اور اس ضابطہ حیات کے نفاذ کے لئے الگ الگ ادارے بھی وجود میں لانے مقصود تھے۔ اسلام میں سب سے اہم اور بلند ترین مقصد حیات ہے حقوق العباد۔ یعنی انسانی حقوق کی سربلندی اور احترام۔ اسلام نے قبائل کو توڑ کر عرب قوم کو ایک وجود بخشا' عربوں نے نیا ضابطہ حیات قبول کر لیا اور اس کے ساتھ ساتھ ضروی ادارے بھی وجود میں آنے لگے۔ کہا جاتا ہے کہ رسول کریم ﷺ نے لوگوں کو اس درجہ فرشتہ صفت بنادیا کہ ان دنوں نہ کوئی زیادتی کرتا نہ حدود کی خلاف ورزی ہوتی۔ شریعت پر تقریباً مکمل عمل ہونے لگا اور اگر کہیں کوئی خلاف ورزی ہوتی ہوگی تو لوگ خود ہی ایک دوسرے کو سمجھا بجھا لیتے۔ چنانچہ اس زمانے میں جرائم کی پکڑا اور روک تھام کے لئے کوئی خاص محکمہ نظر نہیں آتا۔ مگر انہی دنوں جب رسول کریم ﷺ حیات تھے ایک صحابی سعد بن ابی وقاص نے رات کے وقت شہر مدینہ کی چوکیداری (پولیس کی ابتدائی شکل) شروع کر لی۔ بعض کا خیال ہے کہ حضرت عمرؓ کو رسول اکرمؐ ہی کی زندگی میں شہر کا نگران یا پولیس افسر متعین کر دیا گیا تھا۔ تاہم یہ مصدقہ بات ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں حضرت عمرؓ کو باقاعدہ طور پر گشت اور نگرانی کے فرائض سونپے گئے اور بعد میں حضرت عمرؓ نے اپنے عہد خلاف میں الا حداث کے نام سے پولیس کا شعبہ قائم کیا۔ مزید ثبوت یہ کہے کہ جب ابو ہریرہؓ کو الجرین بھیجا گیا تو انہیں پولیس کے اختیارات بھی سونپے گئے تھے۔

آخری خلیفہ حضرت علیؓ کے عہد میں بلدیہ کی سطح پر پولیس کی باقاعدہ تنظیم قائم کی گئی ان سپاہیوں کو شرط کا نام دیا گیا۔ پولیس کے سربراہ کا عہدہ صاحب الشرطہ کہلاتا تھا۔ ان پولیس والوں کے فرائض میں مندرجہ ذیل امور شامل تھے۔ منڈیوں میں اشیاء کے معیار' قیمتوں اور اوزان پر نظر رکھنا ۔ جرائم اور مجرموں کا سراغ لگانا مجرموں پر (عدالت میں) مقدمہ چلانا۔

عہد خلافت کے بعد کے زمانے میں امیہ خاندان نے یہ محکمہ تو قائم رکھا مگر اس کا

نام پھر احداث رکھ دیا گیا۔ محکمہ کے سربراہ کو صاحب الشرطہ کی بجائے صاحب الاحداث کہا جانے لگا۔ صاحب الا حداث ایک طرف امن و امان اور نفاذ قانون کے فرائض انجام دیتا تھا دوسری طرف باغیوں کو فوجی اعتبار سے کچلنے کی ذمہ داری بھی نباہتا تھا۔ یوں اس کا عہد اور اس کی پولیس فورس نیم فوجی طرز کی تھی۔ وہ اگر ایک طرف جرم کا سراغ لگاتا' مجرم کو سزا دیتا دوسری طرف جرائم وقوع پذیر ہونے کی وجوہات کا بھی خاتمہ کرتا۔ امیہ عہد میں پولیس بھرتی کرنے کی ذمہ داری مقامی گورنروں کے سپرد ہوتی تھی مگر صاحب الاحداث ان سب پر نظر رکھتا تھا۔

عباسی خلفا کا دور آیا تو نام پھر تبدیل کر کے صاحب الشرطہ رکھ دیا گیا۔ اور اس کو صدر مقام میں گورنر کی حیثیت یا مرتبہ دیا گیا۔ پھر ایک وقت میں اسے بادشاہ کے باڈی گارڈز کا نگران بھی بنایا گیا اور سزائے موت پر عملدر آمد کا کام بھی دے دیا گیا۔ اتنی ذمہ دار پوست پر معروف اشرف کا ہی تعین کیا جا سکتا تھا۔ وہ مقدمات کی تفتیش بھی کرتا اور اس کے مکمل ہونے کے بعد اس کی جو حد (سزا) ہوسکتی ہے اس کی نشان دہی بھی کر دیتا اور پھر یہ مقدمہ قاضی کے سپرد کر دیا جاتا جو مقدمہ سنتا اور پھر سزا کا اعلان کرتا۔

امیہ اور عباسی عہد میں پولیس کے اعلی افسر سے یہ توقع بھی کی جاتی کہ وہ ملزم سے اقبال جرم کرالے تا کہ قاضی کے لئے فیصلہ کرنا آسان ہوجائے تا کہ اس نظام پر عوام کے دل میں شک وشبہ بھی پیدا نہ ہو۔ عدلیہ اور پولیس کا اعتبار قائم رکھنے کے لئے صاحب الشرط ملزموں سے اقرار جرم کرانے کے لئے سخت اور ناروا طریقے بھی اختیار کر لیتا تھا۔ بہر حال پولیس چیف ماورائے عدالت ہی مجرم کو قصاص ادا کرنے کا حکم بھی دے دیتا۔

امیہ عہد میں احداث کو سینئر اور جونیئر میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ اور شاہی خاندان کے افراد اور اشرف یا بلند مرتبہ لوگوں میں سے اگر کوئی جرم کرتا تو احداث کا سینئر حصہ اس سے تفتیش کرتا اور قاضی کے سپرد کرتا یا چھوڑ دیتا۔ جبکہ جونیئر حصہ عام لوگوں پر مامور ہوتا۔ عباسیوں کے عہد میں پولیس چیف کا دفتر اس جگہ کے قریب ہوتا جہاں لوگ خلیفہ سے ملنے اور عرض داشتیں پیش کرنے کے لئے جمع ہوتے تھے۔ ان زمانوں میں صاحب الشرطہ کی تقرری میں یہ بات خاص طور پر دیکھی جاتی کہ وہ سخت گیر بھی ہو اور نڈر بھی ہو اور بہادر بھی۔

جب مسلمان سپین پہنچے تو وہاں پولیس (شرط) کے شعبہ میں مزید تقسیم اور توسیع

ہوئی ایک حصہ صاحب مدینہ (افسر شہر) اور دوسرا حصہ صاحب الیل (افسر شب) کے نام سے موسوم ہوا ۔ یہ دنوں عہدہ کوتوال سے ملتے جلتے تھے۔ تا ہم سپین میں پولیس کو پہرہ دار کی حیثیت سے مزید پہچان دی گئی ۔ اس کے لئے شہر میں خطرناک جگہوں پر مضبوط حجرے بنائے گئے۔ ان مضبوط بند کمروں میں مسلح پولیس متعین ہوتی جبکہ اس کے دروازے پر تربیت یافتہ کتے موجود ہوتے۔

سپین میں پولیس (شرط) صرف شہر میں ہی نہیں ہوتی تھی بلکہ دیہی علاقوں میں عوام کے جان و مال کے تحفظ کے لئے بھی شرطے مقرر ہوتے تھے۔ رات کو پولیس شہروں کی گشت کرتی مشتبہ اور بدکار عناصر کو روکتی پکڑتی اور صورت حال کے بارے میں صدر مقام کو رپورٹ بھیجتی ۔ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ صاحب الشرطہ کا کام جرائم کی روک تھام' امن و امان کا قیام تفتیش وتحقیقات اور مجرم کو سزا دینا(دلانا) تھا۔ وہ ان فرائض کو سرانجام دینے کے لئے ایک جگہ سے دوسری جگہ بھی جاتا مجرموں کو پکڑتا' ان کے بیانات لیتا' انہیں زیرحراست رکھتا اور سزا(تعزیر) دیتا۔تعزیر شریعت سے مختلف ہوتی۔شرط کے لئے دیانتدار اورلگن والے لوگ منتخب کئے جاتے ۔ ان کی تنخواہیں معقول ہوتیں اور تنظیم ملیشیا جیسی ہوتی۔

برصغیر میں محکمہ شرط کوتوال کے محکمہ کے برابر تھا۔ جبکہ عباسی کے عہد میں ایک دوسرا محکمہ محتسب کا بنا جو برصغیر میں مسلمانوں کے عہد میں ''حسبہ'' کے نام سے قائم کیا گیا۔ محتسب کے ذمے معاشرتی ' اخلاقی اور مذہبی امور کی دیکھ بھال تھی۔ بعض جگہ محتسب اعزازی ہوا کرتے جبکہ بعض جگہ وہ سرکاری ملازم ہوتے تھے۔ بغداد میں ان محتسبوں کے فرائض کی نشاندہی الماوردی نے اپنی کتاب'' الاحکام السلطانیہ'' میں کی ہے جو یہ ہیں۔ سڑکوں گلیوں میں سے تجاوزات کا خاتمہ' آقاؤں کا غلام کے ساتھ سلوک' جہازوں سے سامان اتروانے کی نگرانی' یہ دیکھنا کہ سب لوگ عبادت کریں اور شراب نوشی اور دوسرے غیراخلاقی افعال سے پرہیز کرانا۔

آئی۔ ایچ ۔قریشی الماوردی کے حوالے سے ہی برصغیر میں احتساب یا حسبہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ محکمہ دیوانی قضا کے ماتحت تھا۔ تاہم محتسب کے فرائض' قاضی کے فرائض' سے مختلف تھے۔ اصولی طور پر محتسب کے حوالے یہ کام تھا کہ اسلام کے ضابطہ اخلاق وسلوک کے نفاذ کو یقینی بنائے۔ مسلم معاشرہ بخیر وخوبی چلے۔عوام کے لئے مشکلات

پیدا نہ ہوں اور نہ ہی کسی کے حقوق پر تجاوز ہو۔ الماوردی کا کہنا ہے کہ حسبہ دراصل قاضی اور شعبہ مظالم کے درمیان رابطہ کا پل ہے۔ قاضی کا فرض تھا کہ جو معاملات اس کے سامنے پیش کئے جائیں ان کے بارے میں فیصلہ دے۔ قاضی کسی بات میں از خود دست اندازی نہیں کر سکتا تھا۔ یعنی ''سوموٹو'' نوٹس نہیں لے سکتا تھا۔ محتسب کی حدود میں جو معاملات تھے ان کا تعلق اوزان و پیمائش، ملاوٹ یا سامان تجارت میں دھوکہ دہی اور ایسے قرضوں سے تھا جن پر کوئی تنازعہ نہیں تھا لیکن وہ معاہدے کے مطابق بروقت ادا نہیں کئے جا رہے۔ دوسرے لفظوں میں اشیاء کے معیار اور قیمتوں پر نظر رکھنا بھی محتسب کا کام تھا۔ یعنی محتسب کے ذمے وہ کام تھے جو بالکل سامنے نظر آتے تھے اور جن کی تحقیق و تفتیش کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان کے ثبوت موقع پر ہی موجود ہوتے ہیں۔

حسبہ مظالم کے شعبہ سے سر بسر الگ شعبہ تھا۔ مظالم کا شعبہ ایسے مور کے بارے میں تھا جن میں قاضی براہ راست اپنے احکامات پر عمل نہیں کرا سکتا تھا۔ جبکہ قاضی کو ان امور کے بارے میں داخل اندازی سے روک دیا گیا تھا جو محتسب کی ذمہ داری میں تھے۔ احتساب کے شعبہ میں اگر ایسے امور بھی سامنے آتے جن میں حقائق پر اختلاف موجود ہو اور جن پر عدالتی فیصلے کی ضرورت ہوتی تو ایسے امور کے بارے میں محتسب فیصلہ کرنے کا مجاز نہ تھا مثلاً اگر قرض دار اس بات سے انکار کر دیتا ہے کہ اسے کوئی قرضہ دینا ہے تو یہ کام محتسب کی بجائے قاضی کے پاس چلا جائے گا۔ اسی طرح محتسب کے شعبہ کے جن جن کاموں پر عدالتی نوعیت کا اعتراف آ جاتا ان معاملات کو قاضی کے سامنے پیش کرنا ضروری ہو جاتا تھا۔ قاضی، مظالم اور احتساب میں فرق یہ تھا کہ قاضی جج ہوتا۔ مظالم عدالت کا سربراہ انتظامیہ کا وہ افسر ہوتا ہے جسے کچھ عدالتی اختیار بھی حاصل ہوتے۔ محتسب سر بسر ایک انتظامیہ ہوتا تھا۔ ان دو محکموں میں کہیں نہ کہیں پولیس کے فرائض بھی جھلکتے نظر آتے ہیں۔ محتسب کو پولیس کا نام دیا جائے یا نہ دیا جائے بہر طور یہ پولیس کے فرائض ادا کرتا نظر آتا ہے اسی طرح مظالم کا شعبہ بھی کسی نہ کسی حد تک پولیس کے فرائض سر انجام دیتا ہے۔ الماوردی، ابن خلدون اور فارن کریمر Kraemar اور حاجی خلیفہ کے مطابق ''محتسب کے مختلف ممالک میں مندرجہ ذیل فرائض شمار ہوئے ہیں جن میں بہت سے کام انسانی ہمدردی کے ہیں ۔ غلاموں سے بدسلوکی نہ ہونے دینا۔ جانوروں سے بدسلوکی اور ظلم نہ ہونے

دینا۔ ان پر زیادہ بوجھ نہ لادنے دینا۔ یتیموں اور مساکین کے مسائل حل کرنا۔ اساتذہ کے ہاتھوں بچوں کو زیادہ سزا سے بچانا۔ ضروریات زندگی کی اشیاء کی معمول کے مطابق فراہمی۔ پانی کی فراہمی۔ شہر پناہیں' راستے' منڈیاں' سرائیں' لاوارثوں معذوروں کی رہائش گاہیں صحیح حالت میں ہیں۔ شہر میں مسافروں کے قیام کے دوران انہیں ہر شے کی فراہمی' کاروان والوں کے لئے کھلے میدان اور ایک وقت میں زیادہ کاروانوں کے آجانے کے باعث متبادل جگہ کا انتظام اور نگرانی اس کا کام تھا۔ دریائی اور سمندری بندر گاہوں کی دیکھ بھال' کشتیوں جہازوں سے سامان اتارنے اور چڑھانے کا کام اور جہازوں یا کشتیوں کے قابل استعمال ہونے کا معاملہ بھی محتسب کے ذمے تھا۔ شہر میں سڑکوں اور چوراہوں میں تجاوز نہ ہونے دینا اور خطرناک دیواروں مکانوں کے گرانے کا کام بھی اس کے ذمہ ہوتا تھا۔ اس کسی مکان کی زیادہ بلندی تک تعمیر کے باعث ہمسایوں کے گھروں میں نظر پڑتی تھی' ان کی نجی زندگی زیر بصارت آتی تو ایسے مکان کی تعمیر رکوادی جاتی۔ گویا محتسب ایک ذمہ دار میونسپل افسر کی حیثیت رکھتا تھا۔

ہمارے ادب اور کلچر میں احتساب اور محتسب دو لفظ ایک اعتبار سے بدنام بھی ہوئے ہیں اس کی وجہ یہ تھی کہ اخلاقیات کے نفاذ اور غیر رعائتی مذہبی افکار کے اظہار پر محتسب کی پکڑ دھکڑ اور رپورٹا رپورٹی کچھ مناسب نہیں سمجھی جاتی تھی۔ ذمیوں یعنی غیر مسلم شہریوں کے مذہب کے بارے میں اسے کوئی اختیار نہیں تھا مگر کہیں نہ کہیں اس سے اپنی حد کی خلاف ورزی ہو جاتی۔ اسے یہ بھی دیکھنا ہوتا تھا کہ کیا لوگ مسجد میں نماز پڑھنے آرہے ہیں یا نہیں۔ مساجد کا انتظام و انصرام ایک کمیٹی کے ذمے ہوتا۔ محتسب بوقت ضرورت کمیٹی والوں کو مسجد کی مرمت اور تعمیر نو پر بھی راغب کرتا۔ بہر طور اس کا سب سے اہم فریضہ منڈیوں کی نگرانی وغیرہ تھا۔ یہ عہدہ یا شعبہ ایک طرح سے شرعی شعبوں کا ایک حصہ بن گیا تھا۔ یہ کام اتنا اہم سمجھا گیا کہ رسول کریمؐ نے فتح مکہ کے بعد وہاں پر منڈیاں کا ایک سپروائزر یا محتسب مقرر کر دیا تھا اور حضرت عمرؓ نے اپنے عہد میں احتساب کا ایک محکمہ بنا دیا تھا۔

قاضی عدالت' مظالم' محتسب اور کوتوال کا اندرونی طور پر بہت گہرا تعلق رہا ہے اور ان سب کا تعلق اسلام کے نظام سزا و جزا سے رہا ہے۔ اسلام نے جرائم کو چار حصوں

میں تقسیم کیا۔ الحدٗ القصاصٗ العرف اور تعزیر۔

الحد میں جو جرائم شامل ہیں وہ یہ ہیں'زنا' بدکاری' بدکاری کے بے بنیاد الزام' شراب نوشی' راہزانی اور چوری۔ اس شعبہ میں جرم ثابت ہونے پر سزا ہر صورت دینا لازم ہوتا ہے۔ ان میں سزا سو کوڑے یا سزائے موت بھی ہے۔

القصاصٗ دوسرے فرد کے خلاف ایسے جرائم جن پر مدعی اور مدعاعلیہ باہمی صلاح مشورہ سے معاملہ طے بھی کر سکتے ہیں۔

العرف ایسی سزائیں جو مروج اور تسلیم شدہ ہیں اور نافذ ہوتی ہیں۔

تعزیرٗ ایسے افعال جو مقامی قانون اور رسم و رواج کے مطابق اور مذہب فرقہ کا امتیاز کئے بغیر واقعی لائق سزا قرار پاتے ہیں۔

اسلام میں ضابطہ تعزیر کی صورت یہ رہی ہے کہ ابتدا میں دونوں فریق آپس میں مل کر معاملہ طے کر لیتے تھے اور قاضی کو بہت کم کام کرنا پڑتا تھا۔ قاضی کو حکم تھا کہ وہ سب فریقوں کے ساتھ مساوی سلوک کرے۔ ثبوت کی فراہمی دونوں فریقوں کی ذمہ داری گردانی جاتی تھی۔ ملزم اپنے حق میں دلیل نہ ہونے کی صورت میں قسم بھی اٹھا سکتا تھا۔ قاضی اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنے کا بھی مجاز تھا۔ مقدمہ کی تاریخ پیشگی مقرر کی جاتی تھی تاکہ جو مسلمان گواہی دینا چاہیں دے سکیں لیکن ضروری شرط یہ تھی کہ گواہ سزایافتہ نہ ہو۔ قاضی کی ذمہ داری یہ تھی کہ بڑے کے مقابلے میں چھوٹے کو تحفظ دیا جائے۔ مقدمات کے فیصلے کئے جائیں'حقوق بحال کئے جائیں۔ ناجائز تجاوزات کا خاتمہ کیا جائے اور اپنے ماتحت ملازمین کے کردار پر نظر رکھی جائے۔

تعزیرات' جج اور دوسرے امور واقعات کی روشنی میں یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ برصغیر یا جنوبی ایشیا میں انتظامی امور کس طور طے پاتے تھے اور ریاست کی ایک فورس پولیس نے کیا کیا رنگ روپ دھارے۔ ایک مرحوم پولیس افسر تنویر حمید نے اپنی مختصر کتاب Law and Order management in Punjab میں جے۔ سی۔ کری(J.C.Curry) میں سے ایک پیرا نقل کیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ" مغلوں کے عہد سے قبل ہمیں پولیس نام کا محکمہ یا تنظیم کہیں نظر نہیں آتی' پولیس کے بارے میں واضح تصور مغلوں کے عہد میں ابھرتا ہے۔ ابو الفضل کی کتاب" آئین اکبری" میں پولیس انتظامیہ کی تفصیل دی گئی ہے۔ اس

زمانے میں علاقے کی سیاسی یا انتظامی تقسیم کے مطابق ایک صوبہ دار یا ناظم گورنر کے ماتحت ہوتا تھا جس کا فرض یہ تھا کہ مجرموں کو سزا دے، نظم ونسق قائم رکھے۔ شاہراہوں پر تحفظ رفراہم کرے اور خزانے کی حفاظت کے لئے نگران دستے (پولیس) کھڑے کرے۔ صوبہ سرکاروں میں تقسیم ہوتا تھا اور ہر سرکار کا سربراہ فوجدار کہلاتا تھا اس کے ذمہ دیہی علاقوں اور سڑکوں کی حفاظت، جرائم کا انسداد، ڈاکوؤں اور باغیوں کی سرکوبی تھی۔ منوچی نے لکھا ہے کہ اگر کوئی تاجر یا مسافر دن دیہاڑے لٹ جاتا تو فوجدار اسے معاوضہ ادا کرنے کا پابند تھا۔ ہر فوجداری ضلع، تھانوں اور چوکیوں میں منقسم تھا جن کا انچارج تھانیدار یا داروغہ ہوتا تھا۔ بڑے شہروں میں کوتوال تھے جو شہری پولیس کے سربراہ ہوتے۔ یہ کوتوال قاضیوں (ججوں) کے ماتحت ہوتے۔ آئین اکبری میں اکبر کا یہ فرمان درج ہے:

''شہروں، قصبوں، قریوں اور دیہات کے کوتوال شاہی منشیوں کے تعاون سے اس علاقے کے گھروں اور عمارتوں کی فہرستیں تیار کریں گے۔ ہر محلے کو لوگوں کی تفصیل درج رجسٹر کی جائے گی تا کہ ہر گھر دوسرے گھر کے لئے ایک طرح کا سایہ حفاظت فراہم کرے۔ جواب میں دوسری طرف سے یہی سلوک ہو اور یوں لوگ ایک دوسرے سے یک جان ہو جائیں۔ ملک بھر کی آبادیاں اور علاقے اضلاع میں تقسیم کئے جائیں گے۔ ہر ایک کا سربراہ ناظم یا سربراہ کہلائے گا۔ یہ ناظم اپنی نگرانی میں شہر کے واقعات، لوگوں کی آمدورفت اور حالات کے بارے میں ریکارڈ رکھے گا۔ جب کوئی چوری چکاری، آتشزدگی یا ایسی ہی کوئی افسوس ناک واردات ہوگی تو ہمسائے فوری طور پر مدد کرنے کے پابند ہوں گے۔ اصل ذمہ داری ناظم اور مخبر پر ہوگی جسے اس موقع پر موجود رہنا چاہیے اور کسی معقول وجہ کے بغیر وہ موقعہ پر موجود نہیں ہوں گے تو انہیں اس غفلت یا نا اہلی کا ذمہ دار قرار دیا جائے گا۔ کوئی شخص اس علاقے کے ناظم، مخبر اور عام لوگوں کی اطلاع اور اجازت کے بغیر حدود میں نہ آسکے گا نہ باہر جاسکے گا۔ ہر علاقے میں رات کے پہریداروں کی بھرتی کی جائے گی جو ان شہروں قصبوں، دیہات وغیرہ کی گلیوں سڑکوں اور رستوں پر پہرہ دیں گے۔ تا کہ کوئی اجنبی ان علاقوں میں نہ آسکے۔ دوسرے یہ کہ وہ چوروں ڈاکوؤں اور بٹ ماروں کا تعاقب کریں گے اور انہیں حراست میں لیں گے۔ اگر کوئی شے چوری ہو جائے گی تو پولیس ہر صورت اسے برآمد کرے گی اور مجرموں کو پکڑ کر پیش کرے گی ورنہ اسے چوری

شدہ شے کی مالیت کے مطابق معاوضہ دینا ہوگا۔

کری کی بات اس صورت میں تو قبول ہوسکتی ہے کہ پولیس کی جو ہیئت اور تنظیم اس کے زمانے میں تھی ویسی تنظیم وغیرہ برصغیر پاک وہند یا دنیا کے کسی بھی ملک میں نظر نہ آئے۔ مگر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ پولیس سے ملتا جلتا محکمہ اور ان فرائض کے حامل افراد تھے ہی نہیں۔ رگ وید کے مطابق مقامی حکمران راجا کے ساتھ یہ مددگار حکمران ہوتے تھے (۱) سینانی Senani یہ سیناپتی یعنی فوجوں کا سپاہ سالار ہوتا تھا۔(۲) گرامانی دیہی انتظامی اور اخلاقی امور کا انچارج یا افسر کہلاتا تھا۔ غالباً اسی کے پاس معاشرتی معاشی' اخلاقی' سیاسی' اور قانونی' اور فوجداری ذمہ داریاں ہوتی تھیں۔ علاقے دیہات میں تقسیم تھے۔ ہر گاؤں کا ایک اپنا سردار ہوتا پھر چند گاؤں مل کر ایک ضلع بن جاتے بہت سے ضلعوں یا علاقوں کو ملا کر ایک ''جن'' Jana بن جاتا۔ جسے قبیلے کا نام دیا جاتا۔ خاندانی جھگڑوں میں کنبے کا سردار فیصلہ کرتا اور مختلف کنبوں کے باہمی معاملات میں ان کنبوں کے سربراہ مل کر فیصلے کرتے کسی نہ کسی حد تک یہی صورت حال برصغیر میں مسلمانوں کی آمد تک رہی اور ہر چھوٹی بڑی ریاست میں کم از کم دو محکمے ایسے ہوتے جو پولیس کے محکمہ کے برابر کہے جاسکتے تھے۔ ایک محکمہ تھا جو سیاحوں اور مسافروں کی خبر رکھتا' انہیں مدد دیتا۔ دوسرا محکمہ چور بازاری' ذخیرہ اندوزی روکنے اور ناپ تول کا نظام صحیح رکھنے کا ذمہ دار تھا۔ ہر حکومت میں کم از کم ایک شعبہ سراغ رسانی کا ضرور ہوا کرتا تھا کبھی یہ فوج کا حصہ ہوتا کبھی آزاد محکمہ جس پر براہ راست بادشاہ کی نگرانی ہوتی۔

مسلمانوں کی آمد سندھ میں کوئی خاص ایسے ادارے نہیں بنائے گئے جو نئے پرانے کے امتزاج سے اپنا الگ وجود منواسکتے۔ سندھ میں عرب 712ء میں آئے جبکہ پنجاب میں کوئی تین سو سال بعد محمود غزنوی کی سرکردگی میں مسلمان آئے۔ مسلمانوں کی مستقل سلطنت کے قیام کا کام خاندان غلاماں کے بادشاہ قطب الدین ایبک نے (جو لاہور میں دفن ہے) تیرہویں صدی میں شروع کیا۔ ایبک کا دور مختصر تھا۔ مستحکم حکومت شہاب الدین التمش نے قائم کی اور اس نے مسلم روایات کے مطابق کئی ادارے یہاں قائم کیے۔ خصوصاً احساب کا محکمہ اور محتسب کا تقرر۔ یاد رہے کہ جب جنگ جانشینی جاری تھی تب قاضی القضاۃ وجیہہ الدین نے بھی اس کی مخالفت کی کہ وہ نسب کے حوالے سے حکمرانی کے

اہل نہیں لیکن بعد میں التمش نے غلامی سے آزاد ہونے کا پروانہ دکھایا تو قاضی نے اس کے حق میں فتویٰ دے دیا۔ التمش نے بھی اپنے عہد میں محل کے اندر زنجیر عدل لگوائی تھی۔ (عہد سلاطین' معنف صلاح الدین ناسک) غیاث الدین بلبن کے بارے میں اگرچہ تاریخ دانوں کی بڑی اچھی رائے ہے مگر اس سخت گیر حاکم نے کس طور شاہراہوں پر راہزنی اور ڈکیتی ختم کرائی' اس کی تفصیل کہیں نہیں ملتی۔ غالباً بلبن کے عہد میں پولیس فورس کو اس مقصد کے لئے استعمال کیا گیا کیونکہ ایک بات طے ہے کہ کوتوال کا عہدہ قائم ہو چکا تھا جس کے ذمے دوسرے انتظامی فرائض کے علاوہ پولیس والی ذمہ داریاں بھی تھیں۔

مغلوں کے عہد میں بہت چیزیں روشن اور واضح ہوئیں مگر بابر کی وفات اور ہمایوں کے فرار کے بعد وہ روایت ختم ہوگئی جو بابر نے ڈالنا چاہی تھی۔درمیانی مدت میں شیر شاہ سوری نے تخت پر قبضہ کرلیا اور تمام اداروں کو اس نے انتہائی مستعد اور منظّم کر دیا۔ شیر شاہ سوری نے تعمیر و ترقی کا بے پناہ کام کیا اور اس ضمن میں پولیس کے محکمہ کو کافی تقویت ملی۔ جی ٹی روڈ کی تکمیل کے بعد اس سڑک کو محفوظ کرنے کے لئے اس پر خاص پولیس تعینات کی گئی۔ چوکیاں اور تھانے بنائے گئے' راتوں کو گشت ہوتی اس طرح مسافروں کے لئے بڑی پر امن اور محفوظ فضا بنا دی گئی۔حکومت کی استعداد کو بڑھانے کے لئے ڈاک کا گھڑ سوار اہتمام کیا گیا۔ اس کے عہد میں دیہات میں مقدم مقرر کئے گئے جو گاؤں کی پنچایت یا کونسل کے سربراہ بنائے گئے۔ انہیں شوری اور راہ زنی روکنے کا فرض دیا گیا۔ اگر راہ زنی کی واردات کا سراغ نہ ملتا تو مقدم کو خود مال مسروقہ کا معاوضہ صاحب مال کو حکما ادا کرنا پڑتا۔

شیر شاہ کے بارے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس نے پہلی بار برصغیر میں پولیس کے موجودہ قوانین میں ردوبدل کیا۔ شیر شاہ نے اضلاع میں شقدار (شقدار شقداراں) مقرر کئے۔ پہلے اس عہدے کا نام فوجدار تھا۔ شیر شاہ شقداروں کو فوری انصاف کرنے اور انصاف کر کے دکھانے کی ذمہ داری دی۔ اس نے مجرموں کو سخت سزائیں دینے کا حکم دیا اور منصف منصفین مقرر کئے جن کا کام یہ تھا کہ وہ پرگنہ کے افسروں کی نگرانی کریں تاکہ نہ تو وہ لوگوں کو نقصان پہنچائیں اور نہ ہی سرکاری مالیہ غبن کریں۔ اس نے کوتوال بھی مقرر کئے مگر نسبتاً چھوٹے شہروں اور قصبوں میں۔

این۔ اے ۔ رضوی کا خیال ہے کہ عباسی عہد میں جو مقام صاحب الشرطہ کا تھا جنوبی ایشیا میں وہی رتبہ کوتوال کو حاصل تھا۔ جہاں اب بھی کوتوال اور کوتوالی کے لفظ اور ان کی ٹھوس صورت یعنی تھانہ(کوتوالی) اور پولیس افسر(کوتوال) موجود ہیں ۔ پنجاب میں پولیس لائینوں میں اسلحہ خانوں کو بھی کوٹ کیا جاتا ہے۔کوتوال کی سربراہی میں گھڑ سوار اور برق انداز (پیادے) دستے ہوتے۔ اہم علاقوں میں چوکیاں قائم کرنا ۔ ہر چوکی میں کم از کم ایک سوار اور بیس پچیس پیادے ہوتے تھے۔کوتوال یا پولیس افسر کچہری بھی لگایا کرتے اور یہ کچہری عموماً ایک چبوترے پر لگائی جاتی۔ یہ کچہری ان امور کے بارے میں ہوتی جن میں مقصد یہ ہوتا کہ عدلیہ میں جانے سے پہلے ہی معاملہ ٹھیک کرلیا جائے یا مقصد دو فریقوں کے درمیان تنازعہ کا حل ہوتا یا تفتیش اور پوچھ گچھ کی جاتی۔ پولیس افسر ضرورت مند یا سائل شہریوں سے ملاقات بھی یہیں کیا کرتے۔

اس زمانے میں کوتوال پورے شہر کا انچارج ہوتا تھا یعنی اسے پولیس والے اختیارات بھی حاصل ہوتے اور شہر کے سول ایڈمنسٹریٹر کے اختیارات بھی۔ گویا ایس پی چیف افسر بلدیہ وغیرہ کے اختیارات کوتوال میں مرکوز ہوتے۔ ماتحت سپاہی دن اور رات کو پہرہ دیتے اور سڑکوں راستوں کی نگرانی کرتے ۔کوتوال جرائم کی روک تھام بھی کرتا۔تفتیش بھی اور پھر رپورٹ تیار کر کے عدلیہ کو مقدمے بھیجتا۔ علاقے کی ساری آبادی کا رجسٹر رکھتا۔جس کے ذریعے وہ لوگوں کی آمد و رفت' روزگار' پیشہ ور کردار سے باخبر رہتا۔ اسی طور اس کے علاقے میں آنے جانے والے ہر باشندے کی اطلاع درج رجسٹر ہوتی۔سرائے پر کڑی نگرانی ہوتی۔

کوتوال بعض اوقات مجسٹریٹ کے اختیارات بھی استعمال کرتا اور مقدمات کی فائل بنا کر اعلیٰ عدالتوں میں پیش کر دیتا ۔ستی کی رسم جب ممنوع قرار پائی تو اس کے ذمے اس کو روکنا بھی تھا' طوائفوں کے ڈیرے پر آنے جانے والے سے بھی باخبر ہونا ضروری ہوتا۔ بعض اوقات وہ محتسب کے فرائض بھی سر انجام دیتا۔ لاوارث جائیداد کو مناسب طریقے سے ٹھکانے لگانے کا کام بھی اسی کے ذمے ہوتا۔ منڈیوں میں اوزان پیمائش پرنگاہ رکھتا امن و امان قائم رکھتا۔ سرائے میں ملازم چوکیداروں(راہ داروں) کی نگرانی کرتا۔غنڈہ عنصر' چور ڈاکوں اور دوسرے مجرم گرفتار کرتا۔مواصلات کے انتظامات بھی

اس کی ذمہ داری ہوتے (ٹریفک پولیس)۔شہروں کو قحبہ خانوں سے پاک رکھتا۔آتشزدگی کی صورت میں آگ بجھاتا (فایر بریگیڈ) شراب کی کشید روکتا (ایکسایز) منڈیوں میں قیمتوں پر نظر رکھتا (مارکیٹ کمیٹی) گمشدہ لوگوں کی جائیداد یا اشیاء کی فہرستیں بناتا' چیزوں کو محفوظ کرتا' لاوارث لاشوں کو ٹھکانے لگاتا سرعام جانوروں کی ذبح نہ کرنے دیتا' خزانہ کی حفاظت کرتا۔ وہ جیل اور حوالات کا بھی انچارج ہوتا حکومت کی طرف سے اہم مقدمات بھی کوتوال دائر کرتا اور ان مشتبہ افراد پر نظر رکھتا جن کا جرم فی الحال ثابت کرنا مشکل ہوتا۔

کوتوال علاقے کے لوگوں کے تعاون سے اپنے فرائض سر انجام دیتا۔ ہر محلے میں معتبر لوگوں کو وارڈن مقرر کرتا۔ ان کی ذمہ داری یہ تھی کہ ان کے علاقے میں جرائم پیشہ کوئی کارروائی نہ کریں نہ مقیم ہوں۔ بنیادی طور پر کوتوال کا عہدہ غیر فوجی تھا اور اس کی فورس بھی غیر فوجی شمار ہوتی تھی (بحوالہ این ۔اے۔ رضوی) مستریق نے Early Travels in India میں لکھا ہے کہ کوتوال مجسٹریٹ ہوتا ہے جو ضلعی قاضی کے ماتحت ہوتا ہے یہ قاضی کوتوال کی طرف سے دیئے گئے عدالتی احکامات کے خلاف اپیل بھی سنتا ہے۔

عدالت فیصلہ دینے کے لیے مجرموں کو کوتوال کے حوالے کر دیتی جو اس سزا پر عمل کرتا۔ کوتوال ہی جیل خانہ کا انچارج ہوتا وہی سزا یافتگان سے جرمانہ وصول کرتا۔ ایک ضلع میں ایک کوتوال مجسٹریٹ' ناظم پولیس اور بلدیہ کے افسر کے فرائض سر انجام دیتا۔ مجسٹریٹ کی حیثیت سے وہ سرکار (ضلع) کے تمام جرائم کا نوٹس لیتا۔ سیکولر (غیر مذہبی) یا غیر شرعی مقدمات اس کے پاس جاتے۔ جبکہ دیوانی میں وراثت' طلاق' اور دوسری نوعیت کے معاملے اور مذہبی امور کے مقدمے قاضی کی عدالت میں جاتے۔ چھوٹے شہروں اور قصبوں میں شقدار کے فرائض اور اختیارات کوتوال جیسے ہوتے تاہم اس کا اصل کام مالیہ کی وصولی ہوتا لیکن اسے جرائم کی روک تھام کی بھی ذمہ داری سونپی گئی ہوتی ۔ ایک پرگنہ میں شقدار' کوتوال کے' مجسٹریٹی اختیارات' انتظامی اختیارات اوار فوج دار کے پولیس والے اختیارات استعمال کرنے کا مجاز ہوتا۔شقدار کے حکم یا فیصلے کے خلاف اپیل کوتال سے کی جاتی اس کے خلاف گورنر یا ناظم کے پاس اور پھر آخری اپیل بادشاہ کے پاس ہوتی۔

دارالحکومت (دہلی) کے کوتوال کی تقرری بادشاہ خود کرتا جو دربار میں افسر تقریبات (ماسٹر آف ایٹیکیٹ بھی ہوتا۔صوبائی صدر مقامات پر بھی کوتوال کی تقرری مرکزی

حکومت ہی کرتی جبکہ چھوٹے شہروں اور علاقوں میں کوتوال کی تقرری صوبہ دار یا ناظم صوبہ کیا کرتے تھے۔ کوتوال گورنر کے برابر کا افسر تو نہ تھا مگر اس کی تنخواہ کافی ہوتی اور معاشرہ میں مقام بھی خاصا بلند ہوتا۔ یہ بلند مرتبہ عہدہ تھا۔ دارالحکومت کے کوتوال کی حیثیت بہت ہوتی۔ مغلوں سے پہلے کے سلطانوں کے عہد میں (عہد سلاطین) ضیاء الدین برنی کے مطابق ایک کمانڈر انچیف کو اس عہدہ کے لئے نامزد کیا گیا تھا۔ دہلی کے ایک کوتوال کو ملک الامرا کے عہدہ پر بھی ترقی دی گئی مختصر یہ کہ کوتوال بڑے وفادار' مہذب اور باوقار' خاندان میں سے منتخب کیا جاتا اور یہی روایات انگریزوں نے بھی کسی حد تک نبھائی۔ پنڈت نہرو کے پڑدادا 1857ء کی جنگ آزادی سے پہلے دہلی کے کوتوال تھے۔ ان کا نام گنگا دھر نہرو تھا۔

ابتداء میں پولیس کا کام شہروں میں نفاذ قانون اور قیام امن تک محدود تھا۔ دیہات کا معاملہ پنچائیتوں اور مقامی کونسلوں یا قبیلوں کے اختیار میں تھا۔ ہنگامی صورت میں یہ معاملات فوجی یا نیم فوجی محکمے طے کرتے۔ حکومتیں بوجوہ شہری علاقوں کے بارے میں زیادہ حساس ہوتیں۔ دیہات میں حکومتوں کے خلاف ردعمل میں کافی دیر لگتی اس لئے حکومتیں شہروں میں دفاعی پیش بندی پر زیادہ دھیان دیا کرتیں۔ شاہ ایران کے عہد میں پولیس اسی طور دو حصوں میں تقسیم تھی ایک شہروں کے لئے دوسری دیہی علاقوں کے لئے۔ برصغیر میں شہروں کے لئے کوتوال ہوتے تھے جبکہ دیہی علاقوں کے لئے فوجدار۔ جرائم کی بہتات والے دیہی علاقوں پر قابو پانے کے لئے فوجدار کو معمول سے زیادہ انفرادی قوت اور ساز و سامان بھی فراہم کیا جاتا۔

فوجداروں کی تقرری ناظم یا گورنر' سرکار (ضلع) میں کیا کرتے تھے اور فوجدار ہر علاقہ یا آبادی میں پولیس کے فرائض مقامی آبادی کے سپرد کردیا کرتے۔ ان افراد کی اسی طور تربیت بھی ہوجاتی اور حفاظتی اصولوں ضابطوں کا پتہ بھی چل جاتا۔ ہر گاؤں میں لوگ اپنا ایک چوکیدار مقرر کرتے۔ جس کی تنخواہ یا معاوضہ وہ خود ادا کرتے اور اس پر حکومت کا براہ راست کوئی کنٹرول نہیں ہوتا تھا۔ فوجدار کی ماتحتی میں سوار بھی ہوتے اور برق انداز بھی۔ اس کے علاوہ مختلف جگہوں پر تھانے اور چوکیاں بھی قائم کی جاتیں۔ فوجدار باقاعدہ سرکاری افسر ہوتا تھا۔ اور بعض معمولی معاملات کے فیصلے کرنے کا بھی اسے اختیارات تھا۔

اس کے فیصلوں کے صوبہ کے ناظم یا گورنر سے اپیل کی جاتی تھی۔ ایک فوجدار ہمسایہ فوجدار سے رابطہ رکھتا اوار بوقت ضرورت ایک دوسرے کی مدد کرتا جس چوری یا رہزنی کا سراغ نہ لگ سکتا اس کی مالیت کے مطابق معاوضہ کوتوال یا فوجدار کو ادا کرنا پڑتا۔

سلاطین کے عہد یا مغلیہ عہد یا اس کے بعد یعنی انگریزوں کی آمد سے قبل پولیس کی بہرطور وہ مشکل نہیں تھی جو آج کل ہے۔ یعنی آج کا نوجوان جب ماضی کی پولیس اور اس کی حیثیت کا اندازہ لگانا چاہے تو شاید نہ لگا سکے۔ اس لئے لازم ہے کہ ہم ماضی میں پولیس کے کوتوال کی حیثیت کا تعین دوسرے محکموں کے حوالے اور مقابلے سے کریں۔ بادشاہوں کے لئے عملاً یہ ناممکن تھا کہ وہ حکومت کے ہر شعبے کا ہر کام خود کریں۔ اس لئے روزاول کی روایت کے مطابق نظام حکومت مختلف شعبوں اور وزارتوں میں تقسیم کیا جاتا۔ چنانچہ انتظامی طور پر جو لوگ بادشاہ کے سب سے زیادہ قریب ہوتے وہ وزیر تھے۔ وزیر عربی لفظ ہے جس کا مطلب ہے بوجھ اٹھانے والا' گویا وزیر بادشاہ کا بوجھ اٹھانے میں شریک کار ہوتا۔ وزرا کو آج کی طرح ماضی میں مختلف شعبوں (وزارتوں) کا چارج یا قلمدان دیا جاتا اس طرح متعدد وزیر بادشاہ کی کابینہ میں شامل رہتے۔ ان وزرا کے درمیان شاہی محل کے عہدہ داروں کے درمیان اور صوبائی ناظموں کے درمیان چپقلش اور سازش بھی جاری رہتی۔ ایک دوسرے سے شکایات بھی عام ہوتیں کیونکہ بہرطور اس عہد میں قوانین اور طریق یا ضابطوں کی موجودگی کے باوجود اختیار کا ذاتی استعمال ہوتا اور جب یہ ذاتی استعمال ہوتا تو پھر گویا کہ اصولی اور نظم وضبط کی خلاف ورزی کا سلسلہ شروع ہوجاتا۔ وزیر بادشاہ کے سامنے جواب دہ ہوتا' وزیر کا فرض ہوتا کہ وہ طلب کرنے پر بادشاہ کو مشورہ دے' امور مملکت سرانجام دینے میں مشورہ دے اور بعض اوقات یوں بھی ہوتا کہ مشورے کی بنا پر اگر نتائج حسب ضرورت یا حسب خواہش برآمد نہ ہوتے تو بادشاہ اس کا ذمہ دار وزیر کو قرار دیتا۔ بہرطور وزیر کو بہت اہم مقام حاصل ہوتا۔ تنخواہ یا معاوضہ (جاگیر کی صورت میں بھی) بہت ہوتا۔ اس کو پروٹوکول بھی اعلےٰ ملتا۔ اس کی خیمہ گاہ بادشاہ کی خیمہ گاہ کے بعد سب سے نمایاں ہوتی۔ اس کا نام کبھی دیوان' صدر عالی اور خواجہ جہاں بھی رہا ہے۔

وزیر کے ساتھ ایک یا دو نائب وزیر ہوتے۔ شمس سراج اور ضیاء الدین برنی کی تاریخ فیروز شاہی میں ان نائب وزیروں کا بھی ذکر ہے۔

اس زمانے کے آڈیٹر جنرل کو مشرف ممالک کہا جاتا ۔ اسی شعبہ میں دوسرا عہدہ دار مستوفی ممالک کہلاتا جو پوری مملکت کے حسابات کی جانچ پڑتال کرتا۔ سبھی مرکزی اور صوبائی محکموں کے اخراجات و آمدنی کے گوشوارے (اور غالباً بجٹ بھی) ہوتے جو ان آڈیٹروں کے پاس ہوتے ۔ فیروز شاہ تغلق کے عہد میں آمدنی کی تفصیل کا جائزہ لینے کے لئے مشرف ممالک کو ذمہ دار قرار دیا اور مستوفی ممالک کو اخراجات کا شعبہ دے دیا گیا۔ پھر ان کے ماتحت ناظر ہوتے پھر وقوف کا عہدہ نکالا گیا جس کا کام تھا مقامی ادارے کے اخراجات کی نگرانی کرنا ۔ یعنی اسے لوکل آڈٹ آفس کہا جاسکتا ہے۔

اہم وزارتوں میں دیوان رسالت تھی جس کی ذمہ داری مذہبی امور کی نگرانی اور مذہبی اداروں اور علماء اور فقہا کے وظائف مقرر کرنا تھی۔ اس وزارت کے سربراہ کو صدر الصدور کہا جاتا۔ اسے قاضی ممالک کا نام بھی دیا جاتا ۔

دیوان عرض دراصل وزارت دفاع تھی اور اس کا سربراہ فوج کا سپہ سالار اعلیٰ ہوتا تھا۔ ہر صوبہ میں وزارت دفاع کے نمائندے ہوتے جو باقاعدہ تنخواہ پر سپاہی بھرتی کرتے اور ان کی تربیت کا بھی انتظام کرتے۔

دیوان انشا احکامات تیار کرنے' خوش نویسی' بادشاہ اور حکومت کی ترجمانی اور مواصلات کی ترسیل کی وزارت تھی۔ گویا آج کی وزارت اطلاعات ونشریات اس زمانے میں دیوان انشاہ کہلاتی ۔ ہمارے عہد میں بھی وزارت اطلاعات کے (وزیر نہیں) سیکرٹری صاحبان حاکم اعلیٰ کی نطق بنے رہے ہیں خصوصاً قدرت اللہ شہاب اور الطاف گوہر کو بڑا مرتبہ حاصل ہوا۔ اسی طور ماضی میں دیوان انشا کے سربراہ دبیر اعلیٰ کو بڑا مرتبہ حاصل ہوتا تھا ۔ لیکن وزارت اطلاعات کے مقابلے میں اس کی اہمیت یوں بھی بڑھ جاتی کہ بادشاہ کے ہر قسم کے فرمان (جاگیر اور اراضی کی الاٹمنٹ' تقرر نامے) پر بھی اسی شعبہ میں شاہی مہر لگتی اور پھر اسے بادشاہ کے دستخطوں کے لئے بھیجا جاتا۔ بادشاہ کی نجی خط و کتابت تحریر کرنے والے کاتب خاص کہلاتے ۔ فرمان بھیجنے والے خریطہ دار کہلاتے ۔ خریطہ دار جونیئر سرکاری اہل کار ہوتے۔

ایک دوسرا شعبہ جس کی سربراہی وزیر ہی کرتا تھا۔ برید ممالک کہلاتا۔ پورے ملک میں مختلف نوعیت کے اعلیٰ اور ادنیٰ مخبر مقرر کئے جاتے۔ انہیں گماشتے کہا جاتا جو

پورے ملک سے برید ممالک کو حالات کے بارے میں رپورٹیں بھیجا کرتے۔ یہ رپورٹیں عام بھی ہوتیں اور خفیہ بھی ۔ ان کے ذمہ سرکاری اہل کاروں کی کارکردگی وغیرہ کے بارے میں رپورٹیں بھیجوانے کا کام بھی تھا۔اس شعبہ میں حکومت کوشش کرتی کہ ثقہ' معتبر اور قابل احترام لوگوں کہ خدمات بھی حاصل ہوں تاکہ نظم ونسق' مالیات' زراعت' کسانوں کے حالات' انصاف فوجی اور سیاسی صورت حال' تقریب' کرنسی وغیرہ کے بارے میں دربار کو بالکل صحیح صحیح رپورٹیں ملتی رہیں ۔ برید کے اہل کاروں کو بڑا اچھا معاوضہ دیا جاتا برید کی وزارت دراصل ایک طرح کی خبر رساں ایجنسی اور خفیہ پولیس کے شعبہ کا امتزاج کہلا سکتی ہے یا محکمہ داخلہ بھی۔ اس کے علاوہ جو خفیہ فوجی ایجنسیاں آج کل کام کرتی ہیں' ماضی میں برید کے ذمے بھی کچھ کچھ ایسے ہی کام تھے ۔مگر ماضی میں سراغ رسانی اور مخبری کا ایک الگ شعبہ بھی تھا اس شعبے میں مخبری کی صورت دوسری تھی۔ یعنی اس محکمہ کے لوگ فقیروں' تکیہ داروں' جوگیوں' تاجروں' باربرداری کا کام کرنے والے ٹھیکیداروں' دوکانداروں اور مختلف شعبوں سے وابستہ لوگوں پر مشتمل ہوتے جن کا پتہ چلانا مشکل ہوتا۔ یہ سرداروں' امیروں' غیر ملکیوں' اعلیٰ عہدہ داروں پر بھی کڑی نظر رکھتے اور ان کے بارے میں اطلاعات مرکز میں پہنچایا کرتے تھے ۔ان میں سے بہت سے لوگوں کا رابطہ براہ راست بادشاہ یا اس کے شہزادے سے ہوتا تھا۔

وزارت دفاع یا وزارت جنگ کا نام دیوان عرض ہوتا۔ سربراہ عارض ممالک کہلاتا جو سپہ سالار ہوتا۔فوجی نظم ونسق اور فوج کی کارکردگی اس کی ذمہ داری ہوتی۔ اسے کمانڈر انچیف کا دفتر یا جنرل ہیڈ کوارٹر بھی کہا جاسکتا ہے۔ آج کی وزارت جنگ یا وزارت دفاع جو کچھ ذمہ داریاں اور فرائض ادا کرتی ہے ماضی میں دیوان عرض کے ذمے یہی فرائض تھے۔ پھر فوج کی چھاؤنیاں ہوتیں' کور کمانڈر اور گیریزن کمانڈر ہوتے۔ اس زمانے میں فوج میں شامل کیئے جانے والے گھوڑوں کو داغ دیا جاتا تھا کہ نسبتاً کم ترنسل کے گھوڑے فوج میں شامل نہ کردیئے جائیں اسی طرح تمام سپاہ کے حلیے تیار کیئے جاتے ان کا ریکارڈ رکھا جاتا (واضح رہے کہ اسی قسم کے حلیے پولیس والے آج بھی رکھتے ہیں مگر سبھی کے نہیں صرف سزایافتہ افراد یا اشتہاری مجرموں کے۔ ان ضمن میں ایک انگریز ایس پی واربرٹن کی طرف سے ضلع امرتسر میں حلیے اکھٹے کرنے کے سلسلے میں جو شرمناک زیادتی کی

گئی اور کم وبیش تیس ہزار مردوزن کے ساتھ جو سلوک کیا گیا اس کا تفصیلی ذکر کسی دوسری جگہ پر درج ہے) فوج میں حلیے اس لئے درج کئے جاتے کہ بعض اوقات بددیانت سردار اور امیر جو مستعد اور تربیت یافتہ سپاہی دینے کے پابند ہوتے (کیونکہ ان کی تنخواہیں انہی کے ذریعے دی جاتیں) غیر تربیت یافتہ یا کرائے کے آدمی بھرتی کرادیتے۔ اس بدعنوانی کو روکنے کے لئے حلیے والا طریقہ رائج کیا گیا تھا۔

شاہی فوجی رسالہ کو خاصہ خیل کہا جاتا۔ دارالحکومت میں جو فوج متعین ہوتی اسے حشم قلب کہا جاتا جبکہ ملک کے دوسرے صدر مقامات اور چھاؤنیوں میں تعین فوج کو حشم اطراف کہا جاتا۔ سوار سپاہ تین حصوں مرتب' سوار اور دواسپہ میں تقسیم ہوتی (پولیس فورس میں بھی سواروں کی اسی نوعیت کی تقسیم لازمی امر تھا) مرتب وہ سپاہی جس کے پاس اپنا گھوڑا نہ ہوتا۔ سوار کے پاس اپنا گھوڑا (سرکاری طور پر منظور شدہ) اور دواسپہ جس کے پاس اپنے دو گھوڑے ہوتے۔

پیادہ فوج کو پائک کہا جاتا اس کا زیادہ تر استعمال بطور دربان یا ذاتی محافظ (پرسنل گارڈ) کے ہوتا تھا آج پولیس کی بھی اس نوعیت کی ایک شاخ (گارڈ) ہے ان کے فرائض اعلیٰ سرکاری افسروں' وزیروں' گورنروں' ججوں کے دفتروں اور گھروں میں نگرانی کے فرائض سرانجام دینا ہے۔ پائکوں میں تیر انداز ہوتے جن کا نام دھانک ہوتا پیادہ فوج میں ایک شعبہ یزکی ہوتا یہ لوگ خفیہ طریقوں سے باہر کی خبریں حاصل کرتے اور فوج تک پہنچاتے' ملٹری انٹیلی جینس والا کام یہ لوگ کرتے بعد میں پولیس میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا گیا۔ یعنی ماضی میں جو کام مختلف محکموں میں بکھرا ہوتا تھا وہ عہدہ حاضر مربوط کر دیا گیا۔ تاہم اب بھی بعض اوقات فوج' پولیس' رینجرز' لیوی' سکاؤٹس' ملیشیا میں شدید قسم کی غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں کیونکہ بعض اوقات غیر معمولی حالات میں فرائض میں ایک دوسرے کی حدود کو پھلانگ لیا جاتا ہے۔

فوج کا اسلحہ خانہ قور خانہ اور اس کا انچارج قور بیگ کہلاتا' فوج کا سگنل اور مواصلات کے شعبہ ساتھ ہوتا اسی طرح طبی امداد کا شعبہ بھی ہوتا۔ مواصلات کے شعبے کو برید لشکر اور افسر انچارج کو صاحب برید لشکر کہا جاتا ہے فوج کی مزید تقسیم یوں ہوتی۔

سرخیل' دس سواروں کا انچارج

سپہ سالار، دس سرخیلوں کا انچارج

ملک، دا امرا کا قائد

خان، ہر دس ملک کا انچارج جس کی کمان میں دس ہزار سے زائد ہوتے۔ دریائی کشتیوں کے بیڑے کو بحر کہا جاتا اور اس کے کمانڈر کو امیر البحر کا نام دیا جاتا، اس میں بیڑے اور اس کی فوج (نیوی) کو پولیس کے فرائض انجام دینا پڑتے۔

سول انتظامیہ میں کوتوال اور امیر دار اہم عہدے تھے۔ تاہم ان میں سے کسی کو بھی وزیر یا نائب وزیر کا مرتبہ حاصل نہ تھا۔ کوتوال کو براہ راست بادشاہ تک رسائی حاصل ہوتی تھی اور بعض اوقات وہ دربار کے افسر تقریبات کے طور پر بھی کام کرتا تھا۔ کوتوال کے ذمے شہر میں امن وامان اور انسداد جرائم کا کام ہوتا بہرطور کوتوال اور پہرہ دار دونوں کو اہم مگر دوسرے درجے کے افسر میں شمار کیا جاتا تھا۔

انتظامی اور فوجی عہدوں اور تنظیموں کے علاوہ سب سے اہم، تنظیم، محکمہ یا مرکز شاہی محل تھا جس سے بعض اوقات ہزاروں کی تعداد تک افسر، اہل کار، مشیر وغیرہ وابستہ ہوتے۔

شاہی محل کے عملے کا کنٹرولر وکیل در کہلاتا۔ یہ بہت ہی اہم عہدہ ہوتا اور بادشاہ اپنے کسی بہت ہی معتبر امیر کو اس عہدہ پر فائز کرتا جس کی ذمہ داری ذاتی عملہ کے مشاہرے، وظائف، اخراجات کی نگرانی، محاسبہ وغیرہ ہوتی۔ وکیل در، درحقیقت شاہی محل کا اسٹیٹ افسر بھی ہوتا اور باقی امور بھی اس کی نگرانی میں چلتے۔ باورچی خانہ سے لے کر شاہی محل کی خواتین تک سبھی معاملات وکیل در کے ذمے تھے۔ اس کے ساتھ نائب وکیل در ہوتے۔

اس کے بعد امیر حاجب، یا باربک تھا۔ دربار کی تمام تقریبات کا انعقاد کرنا، پروٹوکول کا فرض سرانجام دینا، محل کے عملے کی گریڈنگ، حاجت بادشاہ اور کسی دوسرے اہل کار افسر یا عام آدمی کے درمیانی پل کی حیثیت رکھتا یعنی reception کا کام بھی امیر حاجب کے پاس ہوتا۔ بادشاہ کے نام لکھی ہر درخواست، اپیل، شکائت پہلے حاجت کے پاس پہنچتی حتیٰ کہ مختلف محکموں سے آنے والے کاغذات بھی حاجب ہی کے ذریعے بادشاہ کے پاس پہنچتے۔ یعنی یہ بادشاہ کا پرسنل سیکرٹری بھی قرار پاتا اور کیبنٹ سیکرٹری بھی۔ چیف

آف پروٹوکول بھی اسے کہہ لیں۔ کچھ حاجب خاص ہوتے تھے جو کچن کیبنٹ کی میٹنگ میں بھی موجود رہتے۔ ایک حاجب فصل ہوتا جو بادشاہ کو ملنے والے تحائف وصول کرتا اور تفصیل اور ریکارڈ رکھتا۔ حاجب عموماً ایکٹو سروس کے لوگ ہوتے اس لئے ان میں سے کئی ایک کو افواج کا کمانڈر بھی بنایا گیا اور صوبوں کا ناظم بھی۔ اگر بادشاہ جو درحقیقت تمام افواج کا کمانڈر انچیف ہوتا خود میدان جنگ میں ہوتا اس وقت یہ حاجب اس کے پاس موجود ہوتے۔

ماضی میں بادشاہ کی آمد کی اطلاع نقیب دیا کرتے جن کا افسر اعلیٰ نقیب النقبا کہلاتا۔ اب اس کی جگہ پولیس کے دستے نے لے لی ہے۔ گویا ماضی میں پولیس کا ایک یہ فرض کوتوال کی بجائے نقیب کے پاس تھا۔ مگر بہر طور وہاں ہر شہر میں حفاظت کے فرائض فوج کے علاوہ کوتوال کی ذمہ داری شمار ہوتا ہوگا کیونکہ جلال الدین فیروز خلجی کے عہد میں اس کے خلاف ایک سازش ہوئی جس میں وسطی ایشیا سے آنے والا ایک عالم سیدی مولا بھی ملوث تھا۔

سیدی مولا پہلے بابا فرید سے ملنے پاک پتن پہنچا۔ باباؒ نے اس کے عزائم کو بھانپتے ہوئے مشورہ دیا کہ وہ دربار اور حاکموں سے دور رہے کہ ان کی قربت فقیروں اور عالموں کو جچتی نہیں۔ سیدی مولا نے دہلی میں بڑا نام پایا۔ کچھ معجزہ نما باتیں بھی اس سے منسوب ہوئیں۔ حکام نے اپنے طور پر اس کے لئے خانقاہ تعمیر کرائی اور اسی خانقاہ میں مسلم' غیر مسلم افسروں' امیروں کی بہت آمدورفت رہتی۔ یہیں ایک سازش کی گئی جس کے تحت جلال الدین خلجی کو قتل کر کے راہ سے ہٹا دینا تھا۔ سازش پکڑی گئی۔ سیدی مولا گرفتار ہوا۔ قاضیوں نے سزائے موت دی اور اسے سر عام ہاتھی کے پاؤں تلے کچلوا دیا گیا۔ اس سازش میں مقامی کوتوال بھی شامل تھے ان میں سے ایک کوتوال ملک فخر الدین تھا جسے بعد میں نہ صرف معاف کر دیا گیا بلکہ عہدے پر بحال بھی کر دیا گیا۔ اس واقعہ سے اس زمانے میں دہلی میں کوتوال کے عہدے کی حیثیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

آج کی طرح بادشاہوں کے زمانے میں شاہی محل کے گارڈ ہوا کرتے تھے۔ ان کی تعداد خاصی ہوتی اس سپاہ کو جانداد کہا۔ یہ خاص الخاص دستہ ہوتا جو منتخب جوانوں پر مشتمل ہوتا۔ ان کے مشاہرے معقول خاصی خوبصورت وردی اور قیام عموماً محل کے اندر

ہوتا۔ بادشاہ رعایا میں آتا تو یہ اس کے گرد حصار ڈال کر چلتے۔ ان کا کمانڈر سر جاندار کہلاتا تھا۔ دوسری مسلح گارڈ سپاہ سلاح دار کہلاتی ۔ یہ بھی اس وقت سلطان کے ساتھ ہوتی جب وہ دربار عام میں جاتا یا محل سے باہر جاتا یا محل کے اندر ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتا ۔

حفاظتی نوعیت کے شعبے اور بھی تھے مثلاً سپاہ سراپردہ داران خاص کہلاتی۔ اس کا امیر عہدہ دار ورہا کہلاتا وہ تمام راستوں کا معائنہ کرتا۔ سلطان کی نجی مجلسوں کا انعقاد امیر مجلس کی ذمہ داری ہوتی۔ شاہی شکار کا شعبہ امیر شکار کے ماتحت ہوتا اور اس میں بھی ایک حفاظتی شعبہ (پولیس) کا ضرور ہوتا۔ شاہی لائبریری کا انچارج کتاب دار' مطبخ کا ایک عہدہ دار چاشنی گیر ہوتا جو شاہ کا کھانا چکھنے کا ذمہ دار تھا۔ شراب دار' مشعلہ دار خیموں وغیرہ کے انچارج فراش' چھتر بردار' سر چتر دار' شاہی نشانات کا نگران امیر توزک' قلمدان بردار دوات دار اور ذاتی ملازم آغاچی وغیرہ ہوتے۔ فیل خانہ کے انچارج کو شحنہ فیل کہتے اور گھوڑوں کا محکمہ پائے گاہ کہلاتا۔

شاہی محل' ملکی اور صوبائی انتظامیہ کے اہم عہدہ داروں اور افسروں کے اس مختصر سے تعارف کو ملحوظ رکھ کر کوتوال پولیس کے محکمہ اور آج کے حوالے سے ماضی میں پولیس فرائض کی ترتیب وتقسیم یا پھیلاؤ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور پولیس کی نوعیت' اہمیت وغیرہ کو بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ انتظامی امور سے ہٹ کر پولیس کا جو تعلق عدلیہ سے ہے اس کو اجاگر کرنا اور بھی ضروری ہے کیونکہ اصلاً خود پولیس کا اولین فرض یہ ہے کہ نا انصافی نہ ہونے دے ۔ معاشرہ میں توازن (جو اصل حسن اصل انتظام' اصل حکومت ہے) قائم رکھا جائے۔ اس اعتبار سے ایک طرف پولیس اور عدلیہ لازم وملزم ہیں دوسری طرف انتظامیہ اور پولیس کا گہرا تعلق ہے۔ ایک دوسرے پہلو سے دیکھیں تو ایک طرف عوام اور دوسری طرف حکومت کے ساتھ پولیس کا تعلق ہے۔ مسلمانوں میں پولیس کے فرائض کبھی محتسب بھی ادا کیا کرتا تھا بلکہ یوں ہے کہ پولیس کا محکمہ اصلاً نکلا ہی احتساب کے محکمہ سے تھا۔ بہرطور اب انصاف کے میدان سے متعلق شعبوں کی کچھ پرانی صورت کا تعین کرنا لازم ہے تاکہ ان سے پولیس کے پرانے اور نئے تعلق کا بخوبی اندازہ ہوسکے۔

عدلیہ یا انصاف کا تصور مسلمان اپنے ساتھ عرب وعجم اور وسطی ایشیا سے لائے تھے۔ محمد بن قاسم کے حوالے سے عرب سندھ' ملتان' پنجاب میں جبکہ عربوں ہی کے حوالے

سے برصغیر کے مشرقی ساحلوں یعنی بنگال وغیرہ میں یہ خیالات عام ہوئے۔ سلطان محمود غزنوی کے حوالے سے وسطی ایشیا اور ایران وافغانستان کے اثرات آئے جو مجموعی طور پر عربی الاصل ہی قرار پاتے ہیں۔

بادشاہ بہر طور حاکم مطلق ہوتا تھا۔ اپنے آپ کو مسلمان سمجھنے کے ناطے شرعی قانون اور ضابطے کو مانتا تھا۔ اس لئے برصغیر میں شروع سے دو قسم کے قوانین چلے۔ ایک مسلمانوں کے لئے اور دوسرے غیر مسلموں کے لئے۔ غیر مسلموں کے دیوانی مسائل ان کی رسوم و رواج اور مذہبی اصولوں کے مطابق فیصلہ کرنے والے غیر مسلم ہی ہوتے تاہم ان کی سرکاری حیثیت کا سوال کبھی پیدا نہ ہوتا تا آنکہ کوئی ایسا معاملہ آجاتا جو ریاست کے قانون اور ضابطہ کی حدود میں آتا۔

بادشاہ ہی انصاف دینے کا ذمہ دار ہوتا جو وہ تین صورتوں میں دیا کرتا۔ مذہبی امور اور شرعی معاملات کے لئے دیوان قضاہ بنایا گیا تھا' رعایا کے تنازعات میں ایک دیوان مظالم تھا اور فوجی اور سیاسی امور (بغاوت علیحدگی وغیرہ کے جرائم) کے سلسلے میں دیوان سیاست قائم کیا گیا۔ یہ آخری محکمہ بن تغلق کے عہد میں قائم کیا گیا۔

دیوان قضاۃ کا سب سے اہم اور بڑا عہدہ دار قاضی ممالک یا قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) ہوتا۔ یہ عہدہ نہ صرف ملک کی انتظامیہ اور عدلیہ کا سب سے بڑا عہدہ تھا بلکہ یہ وہ عہدہ تھا جسے بارہا حاکم اعلیٰ یعنی بادشاہ سے ٹکرانا بھی پڑا۔ قاضی القضاۃ مختلف مقامات پر قاضیوں کا تقرر کرتا بعض اوقات دارالحکومت کا قاضی الگ سے مقرر کیا جاتا مگر وہ بھی عدلیہ ہی کے سلسلے کی کڑی ہوتا۔

ہر شہر میں قاضی کا تقرر لازم ہوتا۔ اس کا ابتدائی کام یہ تھا کہ وہ شریعت کے مطابق دیوانی اور فوجداری معاملات کا فیصلہ کرے۔ پہلے مرحلے پر فیصلہ صرف پیش کئے گئے شواہد پر کیا جاتا مگر بعد میں قاضیوں سے یہ توقع بھی کی جانے لگی کہ وہ سارے معاملے کا اپنے طور پر جائزہ لیں براہ راست یا بالواسطہ طور پر معلومات حاصل کریں۔ متفحص کے ذریعے واقعات کی چھان بین کروائیں اور تحقیقات رپورٹ بھی منگوائیں اور اس کے بعد آزادانہ طور پر فیصلہ کریں۔ ان فیصلوں کے علاوہ قاضی بعض سماجی ذمہ داریاں (جو کبھی حکومت کی سماجی ذمہ داریاں سمجھی جاتی تھی) بھی دے دی گئیں۔ وہ یتیموں' بیواؤں اور ذہنی

طور پر معذور لوگوں کی جائیداد کا انتظام بھی کرتا۔ اوقاف کی نگرانی اور وصیتوں پر عملدرآمد کراتا ۔ بے وسیلہ بیواؤں کے لئے دوسری شادی کا انتظام کرتا۔ جو املاک متنازعہ ہوتیں وہ قاضی کی سپرد داری میں ہوتیں۔ ان کے علاوہ سڑکوں کی مرمت' نگرانی ناجائز تجاوزات کی روک تھام' بعض اوقات بازار کی صورت حال بھی اس سے یہ توقع کی جاتی کہ وہ ناانصافی نہیں ہونے دے گا۔ قاضی بہرطور مرکزی حکومت بلکہ چیف جسٹس کے ماتحت ہوتا۔ وہ کسی طور مقامی ناظموں (گورنروں) کے ماتحت نہیں ہوتا تھا۔کوئی اس کے معاملے میں مداخلت نہیں کر سکتا تھا ۔ قاضی کو ہر صورت شرعی قوانین کو سامنے رکھنا پڑتا۔ وہ فریقین میں صلح کرانے کا بھی مجاز تھا اور فیصلہ دینے کا بھی ۔ قاضی کو نئے شواہد آنے یا لغزش کے احساس کے تحت یا غلطی کے احتمال کے سبب اپنے فیصلے پر نظر ثانی کا بھی اختیار تھا۔

قاضی القضاہ یا قاضی صاحبان سے بادشاہ اور حکمران مشورے بھی لیا کرتے تھے اور بعض اوقات انتہائی متضاد اور متحارب کیفیت پیدا ہوجاتی اور مسائل الجھنے بھی لگتے علاؤالدین خلجی بڑا خوش قسمت حکمران تھا' شروع میں ہی اسے بے پناہ کامیابیاں حاصل ہوئیں اور اس نے نہ صرف دوسرا سکندراعظم بننے کی تیاری شروع کی بلکہ اسلام کے مقابلے میں ایک دوسرا عقیدہ بھی رائج کرنے کا خیال کیا۔ برنی کی تاریخ فیروز شاہی میں درج ہے کہ خلجی نے قاضی علاء الملک سے جو برنی کے چچا تھے اور بعد میں دہلی کے کوتوال بھی بنائے گئے۔ کہا'' اللہ تعالیٰ نے رسول کریمؐ کو چار یار عطا کئے تھے جن کی قوت سے اسلام اور شریعت پھلے پھولے۔ اسی استحکام کے باعث آپؐ کا نام نامی تاقیامت زبان زدعام رہے گا۔ بعینہٖ اللہ تعالیٰ نے مجھے چار یار یعنی ظفر خان' الپ خان' نصرت خان اور الغ خان عطا کئے جنھوں نے میری آسودہ حالی کے سبب عروج ووقار حاصل کرلیا۔ میں بھی ان کی مدد سے ایک نئے عقیدے کی بنیاد رکھ سکتا ہوں میرے ساتھ میرے ان چار یاروں کی تلوار سبھی کو نئے عقیدے کی اطاعت پر مجبور کر سکے گی اور پھر میرا اور میرے یاروں کا نام تاقیامت زبان زد عام رہے گا۔ اپنے پاس دولت' لشکر' فوج ہاتھوں اور وسائل کی کمی نہیں ۔خواہش تو یہ ہے کہ اپنے نائب کو دہلی کے تخت پر بٹھا کر خود سکندر بن کر تسخیر عالم کے لیے نکل جاؤں اور اس ارض کے ہر کونے میں موجود ہر انسان کی گردن میں اپنی اطاعت کا جواء ڈال دوں۔''

قاضی علاء الملک نے علاؤالدین خلجی کو اس ارادے سے روکا اور کہا کہ ''خدا کی وحی سے ہی دین وشریعت کا آغاز ہوتا ہے۔ حضرت آدم سے اب تک صرف پیغمبران دین ہی کو یہ شرف حاصل رہا ہے۔ یہ درست ہے کہ بعض پیغمبران دین کو بھی مناصب بادشاہیت اور حکومت ملی مگر کسی بادشاہ کو منصب رسالت نہ مل سکا۔ (عہد سلاطین از صلاح الدین ناسک ص)

برنی ہی کے مطابق علاؤالدین خلجی جیسے جابر' برخود غلط اور طاقت کے نشے میں چور حاکم کو قاضی کی بات کی سمجھ آگئی جو بہرطور سہر کا قاضی تھا' قاضی القضاۃ نہیں تھا۔

قاضی کے ساتھ ایک عہدہ درمیرداد کا ہوتا تھا۔ بعد میں اسے میر عدل بھی کہا جاتا تھا۔ یہ عہدہ دار ہر قاضی کے ساتھ ہوتا تھا اور بقول ابوالفضل ایک کا کام نتیجہ اخذ کرنا اور فیصلہ دینا تھا جبکہ دوسرے کا فرض اس پر عملدر آمد تھا۔ گویا میرداد کا عہدہ ایک زمانے میں آج کی پولیس اور محکمہ جیل کے مطابق تھا۔ تاہم میرداد کو یہ اختیار حاصل تھا کہ اگر فیصلے میں کوئی نقص رہ گیا ہے تو وہ قاضی کی توجہ اس طرف مبذول کرادے۔ اسی طرح اگر قاضی کے فیصلے کے خلاف اپیل ہو جائے تو عملدر آمد میں تاخیر کے بارے میں قاضی کو باخبر رکھے۔ بعض زمانوں میں میر عدل (میرداد) قاضی سے برتر تھا اور فیصلہ سنایا کرتا تھا۔

قاضی کی مدد کے لئے فقیہہ یا مفتی بھی ہوتا جو فقہ کا ماہر ہوتا اور قاضی کو فقہ کے بارے میں صلاح مشورہ دیتا۔ میرداد یا میر عدل مقدموں میں ملوث افراد کو قاضی کی عدالت میں پیش کرنے کا بھی ذمہ دار ہوتا۔

عدلیہ سے متعلق ایک دوسرا شعبہ دیوان مظالم کا تھا۔ یہ شعبہ حضرت علیؓ نے قائم کیا تھا۔ عباسیوں کے عہد میں بھی رہا۔ سلاطین کے زمانے میں دیوان مظالم کی صدارت خود سلطان کرتا اس کی عدم موجودگی میں یہ فرض میرداد سرانجام دیتا۔ محمد بن تغلق ہفتہ میں دو بار عام مقدمات اور شکایات کی سماعت کرتا۔ سب سے پہلے درخواست صاحب کے پاس دی جاتی وہاں کوئی کارروائی نہ ہوتی تو یا تو یہی درخواست قاضی ممالک کے پاس چلی جاتی یا براہ راست اسے دی جاتی اس کے بعد بادشاہ خود ان کی سماعت کرتا۔ جب بادشاہ عدالت نہ لگاتا تو یہ درخواستیں صاحب کے پاس جمع رہتیں۔

صوبائی حاکموں کو شکایات سننے اور عدالت مظالم کی صدارت کرنے کا اختیار تھا۔

قاضی اور عدلیہ کے دوسرے اعمال ان سے تعاون کرتے تھے۔ یہی عدالتیں سرکاری افسروں کی خلاف شکایات سنا کرتیں۔ ہمیں مختلف ادوار میں اس کی مختلف نوعیت کی صورتوں کی مثالیں بھی ملتی ہیں چند مثالیں این۔ اے۔ رضوی نے بھی دی ہیں۔ غیاث الدین بلبن کا ایک بڑا چہیتا گورنر تھا ملک فیض۔ اس نے شراب کے نشے میں ایک آدمی کو ماردیا۔ اس پر مقدمہ چلا اور اسے سرعام پھانسی دی گئی۔ اکبر کے ٹریڈ کمشنر نے ایک ہندولڑکی کی عصمت دری کی۔ مقدمہ چلا اور بادشاہ کے حکم کے تحت اسے پھانسی دی گئی۔ اکبر کے زمانے میں خان اعظم مرزا عزیز خان کو کہ تھا اس نے کسی معمولی خطا پر اپنے ایک نوکر کو ماردیا۔ کو کہ اکبر کا بچپن کا دوست تھا مگر جب مجرم پایا گیا تو اس کے لئے بھی سزائے موت ہی تجویز کی گئی آخر اسے مقتول کے وارثوں سے قصاص کے ذریعے اپنی جان بچانی پڑی۔

جہانگیر کے زمانے میں ایک کوتوال نے اپنے ایک ماتحت کو حکم کی تکمیل کرانے کے لئے دور بھیج دیا اور اس کی غیر موجودگی میں اس کی بیوی سے ہم بستری چاہی۔ ماتحت کی ماں نے عدل جہانگیری کی زنجیر جا ہلائی اور کوتوال کو قید کی سزا ہوگئی۔ لاہور کے ایک کوتوال مرزا بیگ نے کسی جرم پر قاضی کو گرفتار کرنا چاہا۔ قاضی محصور ہوگیا اور اس عمل میں پولیس کے ہاتھوں مارا گیا۔ (پولیس مقابلہ)۔ مقدمہ کوتوال پر چلا جو مجرم پایا گیا اسے قاضی کے وارثوں کے سپرد کردیا گیا۔ بہرحال اس نے سزا کے خلاف اپیل کر رکھی تھی دریں اثنا جیل میں ہی مرگیا۔

اورنگزیب نے ایک مقدمے میں قاضی کے فیصلے میں ناجائز طرفداری محسوس کی تو اسے سرزنش کی۔ بعد میں برطرف بھی کردیا۔ اورنگ ذیب نے ایک عام عورت کی شکائت پر ایک فوجدار کو تبدیل کردیا۔ گجرات کاٹھیاواڑ کے بادشاہ کے داماد احمد شاہ نے کسی کو قتل کردیا۔ قاضی نے فیصلے میں کہا کہ وہ مقتول کو معاوضہ ادا کردے مگر بادشاہ نے فیصلے پر نظر ثانی کی اور داماد کو موت کی سزا دے دی۔

ایک طویل عرصہ تک عدلیہ پر لوگوں کا بے پناہ اعتماد تھا' مشکل وقت میں کیا بادشاہ کیا فقیر سبھی عدالت عالیہ کا رخ کرتے۔ غیاث الدین بلبن نے متعدد رباغیوں کو قتل کرنے کا حکم دے دیا۔ مقتولین جج کے پاس پہنچے تو قاضی نے انہیں معافی دے دی۔ سلطان جلال الدین خلجی ایک قاضی سے ناراض ہوا اس پر بغاوت کا الزام لگایا مگر جب

مقدمہ چیف جسٹس کے پاس پہنچا تو اس نے قاضی کو بالکل بری کر دیا۔ بادشاہ محمد تغلق نے عدالت میں ایک ذاتی مقدمہ دائر کیا مگر جب دیکھا کہ مقدمہ کمزور ہے اور عدالت حق میں فیصلہ نہیں دے گی تو مقدہ واپس لے لیا۔ اکبر گجرات کاٹھیاواڑ کے دورے پر تھا اس کے ایک ملازم نے ایک دیہاتی کے جوتے چھین لئے بادشاہ نے ملازم کے پاؤں کٹوا دیئے۔

جرائم اور ناانصافیوں کے خلاف لڑائی اور جرات مندانہ فیصلوں کی بہت سی مثالیں ہیں جو اگر مناسب طریق سے مرتب کر کے لوگوں تک خصوصاً متعلقہ محکموں تک پہنچائی جائیں تو شاید ہمارے عدالتی اور انتظامی امور میں ایک تبدیلی کی خواہش فزوں تر ہو سکے اور لوگوں کو یہ اچھی مثالیں عادلانہ فیصلے کرنے پر مائل کر سکیں۔ پولیس رولز I- 22 کے مطابق ''پاکستان کا فوجداری قانون اور اس پر مبنی نظام پولیس' ہر دو اسی اصول پر قائم ہیں کہ امن عامہ کا انحصار رعایا کے ہر فرد کی ذمہ داری پر ہے۔ عدالتیں اور پولیس اس لئے بنائی گئی ہیں کہ وہ اس ذمہ داری کی انجام دہی' نگرانی اور امداد کا ذریعہ ہیں۔''

محمد بشیر احمد نے اپنی کتاب The Muslim Year Book of india1948-49 میں عدالت' انتظام اور پولیس کے بارے میں کچھ باتیں لکھی ہیں۔ مثلاً اورنگ زیب کے عہد میں الہدایہ کی طرز پر فتاویٰ عالمگیری مرتب کی گئی مملکت کے قانون (شریعت) کے مطابق جو فیصلے ہوئے ان میں سے اہم فیصلے اس کتاب میں شامل بھی کئے گئے اور لوگوں کو قانون کا شعور دینے کے لئے اور آئندہ نظیریں مہیا کرنے کی خاطر اورنگ زیب کی ہدایت پر ان فیصلوں کی نقول عام تقسیم کی جاتیں۔ سر تھامس رو (1615.16) کی رائے تھی کہ برصغیر میں نہ صرف قانون تعزیر میں موجود ہے بلکہ عام طور پر سمجھا بھی جاتا ہے۔'' ہر چند مسلمان بادشاہ عملاً چیف جسٹس بھی ہوا کرتے تھے مگر وہ اپنے انتظامی اختیارات کو انصاف کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننے دیتے تھے۔ بلکہ قوانین کو ہر ممکن صورت میں بے داغ اور پاکیزہ رکھنا چاہتے تھے۔ کیونکہ شریعت یہ نہیں مانتی کہ حکمران غلطی سے مبرّیٰ ہوتا ہے۔

مسلم عہد میں فقہ کے اساتذہ کو قاضی مقرر کیا جاتا تھا مگر انہیں کوئی خطاب نہیں دیا جاتا تھا نہ وہ قبول کرتے تھے ۔ وہ دعوتوں اور اجتماعات میں نہیں جاتے تھے۔ لوگوں سے ملنا جلنا کم ہوتا تھا۔ اس طرح عہدہ میں کچھ اس قسم کا خوف' احترام اور تقدس یکجا ہو گیا تھا کہ قاضیوں کی تقرری کے لئے جب نام یا درخواستیں طلب کی جاتی تھیں تو کوئی خود کو اس

کے اہل نہیں سمجھتا تھا۔ کوئی بھی یہ بھاری ذمہ داری قبول کرنے کے لئے آسانی سے تیار نہیں ہوتا تھا۔

عدالت میں فریقین کو آزادی تھی کہ وہ اصل مسئلہ کے بارے میں شرعی' قانونی دلائل کے لئے فقہ کے ماہرین کی خدمات حاصل کرلیں جنہیں وکیل کہا جاتا تھا ۔ وکیلوں کے فرائض فقہ فیروز شاہی اور فتاویٰ عالمگیری دونوں میں تفصیل سے درج رہیں۔ عبدالقادر بدایونی نے بھی خان زمان کے ہندو وکیل رائے ارزانی کا ذکر منتخب التواریخ میں کیا ہے۔ اس طرح حکومت بھی وکیلوں کی خدمات حاصل کرتی اور سرکاری وکیل کو ایک دن کی پیشی کا معاوضہ ایک روپیہ ملا کرتا تھا۔

حکومت یا ریاست صرف مجرموں کو سزا ہی نہیں دیتی تھی نظم ونسق کے انچارج افسروں اور گورنروں تک سے مال بازیافت نہ ہونے کی صورت میں متاثرین کو معاوضہ دلاتی تھی۔ ایک ڈچ نو آبادی میں رہزنی ہونے کی شکایت کی گئی۔ مال برآمد نہیں ہوا۔ چنانچہ حکومت نے اس علاقے کے گورنر سے مال مسروقہ کی مالیت کا معاوضہ وصول کیا اور شکائیت کنندگان کو ادا کیا۔ شہر مانڈو میں رات کے وقت ایک ہندولٹ گیا' اس نے قاضی کی عدالت میں لوٹے جانے کا واقعہ ثابت کردیا۔ مال نہیں ملا۔ حکومت نے پولیس افسر کو اتنی ہی مالیت کا جرمانہ کر کے رقم تاجر کو دے دی ۔ شیر شاہ سوری نے تو حکما کو پابند کر دیا تھا کہ اگر چوری' ڈاکہ رہزنی کا مال برآمد نہیں ہوگا تو گاؤں کا مکھیایا سربراہ اس کا ذمہ دار گردانا جائے گا اور وہی معاوضے کی ادائیگی کرے گا۔ شیر شاہ نے تو قتل کی واردات کو بھی مکھیایا پولیس کے محکمے کی ذمہ داری قرار دیا تھا اور دوسرے بہت سے یورپی سیاحوں نے اس بارے میں برصغیر کے نظام حکومت اور حکمرانوں کو خاص خراج تحسین پیش کیا ہے۔

یہ حقیقت بھی اپنی جگہ پر ہے کہ قاضیوں کی عدالتوں کی عمارتیں الگ ہوتی تھیں اور خاصی کھلی تاکہ اگر عوام کارروائی سننا چاہیں تو انہیں پریشانی یا تکلیف نہ ہو۔ انہیں دارالقضاۃ' دارالعدل' عدالت خانہ یا کچہری کہا جاتا تھا۔ محمد بشیر احمد نے کچھ فیصلوں کی جھلکیاں بھی دی ہیں۔ گورنر کے حکم کے خلاف اپیل (وقائع عالمگیری میں سے)

عدالت: شہنشاہ اورنگ زیب

فیصلہ۔ خان جہان بہادر نے تاجروں کے گھوڑے ضبط کر لئے ہیں۔ اس حکم کے

خلاف یہ اپیل اس (خان جہان) کے خلاف ہے۔ خان جہان فیصلہ کرتے ہوئے قیامت کو بھی بھول گیا ہے اور اپنی موت کو بھی جو جلد ہی آنے والی ہے۔ لگتا ہے کہ نہ اسے خدا کا خوف ہے اور نہ ہی بادشاہ کا ڈر-----

سول اپیل

عدالت: شہنشاہ اورنگ زیب

فیصلہ : کشمیریوں اور ابراہیم خان کے درمیان مقدمہ کا فیصلہ حفیظ اللہ خان نے مناسب طریق سے نہیں لکھا ۔اس نے نتائج پر غور نہیں کیا اور بھاری لغزش کی ہے۔ اس مقدمہ کی صرف دلاور خان کے ذریعہ تحقیقات مناسب نہیں اس لئے طے کیا گیا ہے کہ مقدمہ یا واقعہ کی پوری اور غیر جانبدارانہ تحقیقات قاضی اور امین (میرداد' یا میر عدل) کروائیں اور محض اقرار یا انکار کی بنا پر مقدمہ کا فیصلہ نہ کریں نہ ہی ذاتی پسند یا نا پسند کو درمیان میں آنے دیں۔ ایسے لوگ پہلے بھی ہوا کرتے تھے ۔لگتا ہے کہ شیطان نے پھر ان کی حس انصاف وتمیز پر غلبہ پانا شروع کر دیا ہے۔''

محمد بشیر احمد نے بعض مخطوطوں اور بعض معروف کتابوں سے' جن میں سے اکثر کے ترجمے انگریزی میں بھی ہو چکے ہیں' مندرجہ ذیل مقدمات کی مثالیں بھی دی ہیں۔

ریاست بنام کوتوال سعید (عدالت شاہجہان) مجرم کو سرعام پھانسی دی گئی۔

سر ولیم فوسٹر نے (انڈیا ریکارڈ آفس (40۔1600 ص 90) ایک ایسے مقدمے کا ذکر کیا ہے جس میں ایک انگریز ملاح کو گرفتار کر کے قید کر دیا گیا تو اس نے ایک کوتوال کو رشوت دی اور آزاد ہو گیا۔

منوچی کہتا ہے کہ ایک مقدمہ کا فیصلہ کرتے وقت مجھے شبہ ہوا کہ قاضی نے رشوت وصول کر رکھی ہے۔

سر تھامس رو 1615ء نے گورنر (شہزادہ خرم) سے کسٹم ہاؤس کے مقامی جج کے خلاف شکائت کی۔ اس کے باوجود سر تھامس رو نے طے کر رکھا تھا کہ انگریزوں اور مقامی افراد اور محکموں کے درمیان جو تنازعات ہوں گے وہ سب قاضیوں کی عدالتوں میں پیش کئے جائیں گے کیونکہ قاضی جلدی اور منصفانہ فیصلہ کرتے ہیں۔

اورنگ زیب کی عہد میں لاہور کے گورنر مرزا کو چک کوشک ہوا کہ قاضی علی اکبر نے دو لونڈیوں کو قتل کر دیا ہے۔ اس نے اس کے گھر کی تلاشی کا حکم دیا۔ قاضی نے خودکشی کرلی اورنگ زیب نے مرزا کو چک سے جواب طلب کیا کہ اس نے پولیس کو تلاشی کا حکم دے کر پولیس سے ہی قاضی کو مروا دیا۔ وجہ بیان کرے کیوں کہ اس کے خلاف کارروائی کی جائے؟ اس پر گورنر نے خودکشی کرلی۔ دراصل قاضی گورنر کے ماتحت نہیں ہوتے تھے۔

ایک دوسری طرح کی مثال منوچی نے دی ہے۔ ایک کوتوال منوچی کی ضمانت لینے کے لئے بھی تیار نہ تھا۔'' تاہم جب نیا گورنر فدائی خان آیا تو کوتوال کو علم تھا کہ وہ میرا دوست ہے اس لئے وہ فوراً مجھے رہا کرنے کے لئے فکر مند ہوگا۔''

کہا یہ جاتا ہے کہ عدلیہ' قانون وغیرہ کا جو طریقہ اور روایت برصغیر میں مسلمانوں کے عہد سے چلی آتی تھی انگریزوں نے بھی اسی طریقے کو معمولی سی تبدیلی کے ساتھ جاری رکھا۔ قانون شرعی نہ رہے سیکولر ہوگئے اور ہندو' مسلم' سکھ اور باقی مذاہب کے لوگوں کے لئے بھی یکساں ہوئے۔ سوائے ان رسوم اور قواعد کے جن کا تعلق مذہب سے تھا۔

عدلیہ کے ساتھ ساتھ پولیس کی پرانی طرز کو ایک حد تک انگریزوں نے بھی اختیار کیا اور بنگال اور مدراس میں انہوں نے مقامی پولیس ڈھانچے کو سامنے رکھ کر اپنا ڈھانچہ کھڑا کیا اور قوانین بنائے۔

لندن کی پولیس کا ایکٹ منظور ہونے سے بہت پہلے برصغیر میں انگریزوں نے اپنے مقبوضات میں اپنے مال و جان کے تحفظ کے لئے پولیس کھڑی کر لی تھی یہ پولیس کسی حد تک یہاں پر رائج ڈھانچے کے مطابق کھڑی کی گئی تھی۔ اس کے باوجود تنظیموں میں بڑا فرق تھا۔ پہلا فرق تو یہ کہ مسلمان یا غیر مسلمان عہد میں پولیس جیسی بھی تھی بنیادی طور پر ملکی نفری پر مشتمل تھی اور اگر کہیں کوئی غیر ملکی یا نو وار داد پولیس میں آ بھی جاتا تو وہ اصلاً اس ملک میں آباد ہو چکا ہوتا جبکہ انگریز کی پولیس اس اعتبار سے مختلف تھی۔ ایک تو یہ کہ انگریز نے جب پولیس قائم کی تو وہ خود اس ملک میں کسی جگہ بھی حکمران نہ تھا۔ اس نے اراضی یا علاقے اپنے کاروبار کی خاطر پٹے پر حاصل کئے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی یا دوسری یورپی تجارتی کمپنیاں برصغیر میں تاجرانہ سرگرمیوں کے لئے آئی تھیں۔ ان یورپی اقوام میں

سے کسی کا بھی یہاں آباد ہونے کا خیال تھا اور نہ ہی حکومت کرنے کا اس لیے صرف ایسی پولیس کی ضرورت تھی جو ان کے تجارتی مفادات اور جان کی حفاظت کرے۔ یعنی ایک پرائیویٹ قسم کی پولیس جس طرح آج کل پرائیویٹ سیکورٹی ایجنسیاں کام کررہی ہیں۔

برصغیر میں انگریز پولیس یا یورپی پولیس اولاً ان علاقوں میں قائم کی گئی جہاں ان کے تجارتی مفادات کی ضروت تھی ۔ پہلے ساحلی علاقوں میں یہ ضرورت پیدا ہوتی یہ ساحلی علاقے ہی تھے جہاں یورپی اقوام نے سب سے پہلے آکر ڈیرے ڈالے تھے۔ ان میں سورت، بمبئی، مدراس اور بنگال ایسے علاقے تھے جہاں انگریزوں کی تاجرانہ سرگرمیاں فروغ پا رہی تھیں۔ مغل حکومت کی طرف سے انہیں انہی علاقوں میں تاجرانہ حقوق دیے گئے۔ دوسری اہم بات یہ کہ یہ علاقے دارالحکومت (دہلی) سے بہت دور واقع تھے ان پر مرکزی حکومت کا کنٹرول آہستہ آہستہ کم ہونے لگا تھا بلکہ اکثر مقامات پر تو حکومتیں نیم آزاد ہوچکی تھیں یا اگر مرکزی حکومت کا کچھ کنٹرول تھا بھی تو وہ صرف دکھاوے کا تھا۔

جنوبی برصغیر میں معاملات ہمیشہ سے مختلف رہے یہاں دہلی کا کنٹرول کبھی ہوتا اور کبھی صدیوں آزادانہ ریاستیں چلتی رہتیں۔ خصوصاً بہمنی ریاستیں بہت دیر تک چلیں، مغل جب عروج پر تھے تب بھی یہ علاقے یا ان سے آزاد رہے یا مغلوں کے لئے مستقل دردسر۔ شاہجہاں کا عہد مضبوط دورحکومت شمار ہوتا ہے مگر اس زمانے میں شہزادہ اورنگ زیب کو اپنی جوانی کے بہترین سال جنوب میں جنگ وجدل میں گزارنے پڑے اورتو اور اس کی راجوری والی بیوی سے بیٹا اور شاہی خاندان والی بیوی سے بیٹی بھی وہیں پر پیدا ہوئی اور آخر میں اسے موت بھی آئی تو اورنگ آباد میں۔ انگریز سے معرکہ کے وقت سلطان ٹیپو آزاد تھا اور اس کا دہلی سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ اسی طور بنگال والے آزاد تھے اور سراج الدولہ اکیلا ہی انگریزوں سے لڑا تھا۔ مرکز یعنی دہلی سے آزاد ہوئے۔ بہاول پور کی ریاست آزاد تھی، ملتان دہلی سے الگ ہوکر کابل کا باج گزار بن چکا تھا۔ سندھ کی بھی بڑی حد تک یہی کیفیت تھی۔ اودھ والے دہلی والوں سے کٹ چکے تھے۔ برصغیر کے وسط میں چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہو چکی تھیں جو دباؤ پڑتا تو خراج دہلی یا کسی دوسرے مرکز کو ادا کردیتیں ورنہ آزادانہ زندگی گزارتیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یورپی اقوام کے آنے کے بعد سے لے کر 1857ء تک مختلف علاقوں میں نظم و انتظام کے مختلف طریقے آزمائے گئے۔ اسی حوالے سے پولیس

(کوتوال) کا نقشہ بھی ہر جگہ دوسرے سے تھوڑا بہت مختلف رہا۔ اکثر جگہوں پر فوج پر زیادہ زور اور انحصار رہا اور پولیس پر توجہ کم رہی۔ کیونکہ ہر ایک کو دوسری آزاد ہونے والے ریاست سے خطرہ تھا۔ کہا جاسکتا ہے کہ اٹھارہویں انیسویں صدی میں برصغیر میں دفاع پر جتنی رقم خرچ ہوئی ہوگی اس کی مثال نہ تاریخ میں پہلے پائی جاتی ہوگی اور نہ ہی اس کے بعد۔

یہ حالات اس لئے پیدا ہوئے کہ دہلی کی حکومت دور کے علاقوں کو نہ تحفظ فراہم کرسکتی تھی نہ انصاف۔ اگر تحفظ اور انصاف فراہم نہ کیا جاسکے اور بوقت ضرورت (قحط سیلاب آفات) مرکز مدد مہیا نہ کرسکے تو پھر یہ سارے حل مقامی طور پر ڈھونڈے یا پیدا کئے جاتے ہیں اور مرکز سے رابطہ نہ صرف کٹ جاتا ہے بلکہ رویہ مخاصمانہ بھی ہوجاتا ہے۔ یہی کچھ اورنگ زیب کی وفات (1707ء) کے بعد ہوا۔ مقامی حاکموں' گورنروں یا قبائلی سرداروں نے سر اٹھانا شروع کیا اور اس عمل میں پہلا نشانہ عدالتیں یا قاضی بنے۔ کیونکہ مقامی حاکموں نے اپنی آزادانہ حیثیت کے جواز کا فیصلہ اپنی عدالتوں سے حاصل کیا اور انہی عدالتوں کے ذریعے جمعہ کے خطبہ میں سے دہلی کے بادشاہ کا نام حذف کرایا۔ عدالت کے بعد دوسرے ریاستی ادارے بھی گرنے لگے اور لوگوں کی زندگی میں بیزاری اور لاتعلقی نے جنم لینا شروع کردیا۔

یورپ خصوصاً لندن میں برصغیر سے تجارت کی خواہش تو اکبر اعظم ہی کے عہد میں جنم لینے لگی تھی اور ڈچ لوگ عارضی پایہ تحت لاہور میں بطور پادری پہنچ ہی چکے تھے مگر ملکہ الزبتھ کی اشیرباد سے ایسٹ انڈیا کمپنی 1600ء میں تشکیل پائی۔ تیس چالیس کے عرصے میں اس نے شاہجہاں سے سورت' کلکتہ مسولیپٹم وغیرہ میں تجارت کرنے کے حقوق یا اجازت حاصل کرلی۔ انگریزوں نے یہاں اپنے کارخانے' گودام بنائے اور ان کے تحفظ کے لئے انہوں نے پہلے تو سرکاری پولیس کی طرف دیکھا مگر پھر مقامی لوگوں کی دست درازیوں اور دستبرد سے بچنے کے لئے انہوں نے اولاً اپنی رہائش کو محفوظ بنایا اور پھر کاروبار کو بھی محفوظ کرنے کے لئے ذاتی یا نجی انتظامات کئے۔

مدارس اور بمبئی میں انگریزوں کے کارخانے بھی تھے گودام بھی اور یہاں کمپنی کی بڑی برانچیں بھی تھیں۔ ہر برانچ کا منتظم صدر (پریذیڈنٹ) ہوتا تھا چنانچہ ان دونوں علاقوں

مدارس اور بمبئی کو پریذیڈنسی کا نام دے دیا گیا۔ پہلے یہ پریذیڈنسی صرف شہروں یا ملحقہ علاقوں میں تھی بعد میں بڑے بڑے صوبوں کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ ان دفاتر میں تاجر بھی ہوتے اور سامان کی نگرانی کرنے والے بھی' حساب کتاب کرنے والے بھی اور چپڑاسی اور محافظ بھی۔ فرنگیوں نے جان اور مال کو محفوظ کرنے کے لئے مرکزی حکومت سے اجازت کے بعد سب سے پہلے مدراس میں ایک قلعہ بنایا (1640ء) جس کا نام قلعہ سینٹ جارج رکھا گیا۔

مدراس میں پولیس کا نظام کچھ ایسا تھا کہ یہاں پیڈانائک نام کا ایک محافظ یا پولیس والا ہوتا تھا۔ یہ کام اسے ورثے میں ملتا تھا اسے تنخواہ نہیں ملتی تھی بلکہ ایک تو اجناس میں سے کچھ حصہ ملتا دوسرے اسے دھان بونے کے لئے کچھ اراضی دی جاتی جس پر مالیہ وصول نہیں کیا جاتا تھا۔ انگریزوں نے بھی شروع میں یہی طریقہ اختیار کئے رکھا اور کم وبیش ڈیڑھ سو سال تک پولیس کی شکل یہی رہی۔ مگر 1832ء میں پیڈی نائک کا عہد ختم کردیا گیا۔ یا یوں کہئے کہ اس کا نام بدل کر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس رکھ دیا گیا۔ یہ ڈی ایس پی یا پیڈانائک شہر کے اندر فرائض سرانجام دیتا تھا بلکہ دیہی علاقوں میں تحصیلدار کا مالیہ بھی وصول کرتا' محکمہ مال کے دوسرے کام بھی کرتا اور ایک دوسرے عہدہ (دراوغہ) کے ساتھ پولیس کے بھی فرائض سرانجام دیتا۔ چھوٹے چھوٹے مقدمات کے فیصلے بھی کرتا' معاملات کی تفتیش بھی کرتا تھا۔ سزائیں بھی سناتا اور ان پر عمل بھی کراتا۔ داروغہ کا عہدہ بھی دراصل مغلوں اور ان سے پہلے کے مسلمانوں سے چلا آتا تھا۔ کہیں اسے فوجدار کہا جاتا کہیں داروغہ۔ بنگال میں داروغہ انہی معنوں میں استعمال ہوتا جبکہ پنجاب میں محکمہ جنگلات کے سپاہی کو داروغہ کہا جاتا۔ میونسپل کمیٹیوں میں عملہ صفائی کے انچارج کو داروغہ کہا جاتا اور بعض اوقات جیل کے درمیانے درجے کے ملازمین کو بھی دارغہ کہا جاتا تھا۔

مدارس میں ڈی ایس پی اور دارغہ کا یہ نظام چھتیس سال تک جاری رہا۔ 1770ء میں گورنر اور اس کی کونسل نے پولیس کے معاملات کو بہتر طور پر کنٹرول کرنے کے لئے ایک پولیس بورڈ بھی بنادیا مگر اس سے زیادہ کام نہ لیا جاسکا۔ بہر طور 1802ء میں پولیس کے بارے میں ریگولیشن نمبر 35 منظور ہوا جس کے تحت پولیس کو یہ اختیار بھی دے دیا گیا کہ کمپنی کے ٹھیکیداروں اور مزدوروں سے جبراً وہ کام بھی مکمل کرائیں جو وہ درمیان میں چھوڑ

جاتے ہیں یا چھوڑ گئے ہیں۔ 1843ء تک کام اسی طرح چلتا رہا اور پولیس کا کنٹرول کورٹ آف سرکٹ یا علاقے کی عدالت کے پاس رہا۔ جبکہ اس کے بعد پولیس کا کنٹرول یا نگرانی سیشن جج کو دے دی گئی۔ تجربہ یہ بھی کامیاب نہیں رہا کیونکہ پہلی بات یہ کہ عدالتی یا دوسرے افسروں کو اپنے کام بھی بہت ہوتے ہیں۔ دوسرے پیشہ ورانہ اعتبار سے وہ پولیس کے کام کو پوری طرح سمجھ نہیں سکتے تھے اور تیسرے پولیس کی کمان خود پولیس والے ہی بہتر کر سکتے تھے۔ چنانچہ پولیس کو دوسرے افسروں (سیشن جج) تحصیلدار وغیرہ) سے آزاد کر کے ضلعی سپرنٹنڈنٹ پولیس کے ماتحت کر دیا گیا۔ یہ عہدہ پہلے بھی موجود تھا اور سیشن جج کے رتبہ کا تھا۔ یہ تبدیلی مرکزی حکومت سے 1855ء میں کروائی گئی۔ مرکزی حکومت کو بتایا گیا تھا کہ صرف ایک سال 1854ء میں ڈکیتی کی 1728ء وارداتیں ہوئیں جن میں سے صرف 481 کے بارے میں کوئی کارروائی کی جاسکی ایک وجہ یہ تھی کہ مجسٹریٹ دوسرے کاموں میں بے حد مصروف رہے اور پولیس بھی ادھر ہی مصروف رہی۔

مدارس کی فرنگیوں سے قبل کی پولیس یا نظام تحفظ خاصا بگڑ چکا تھا تاہم فرنگیوں نے بھی تقریباً اسی کو اپنی بنیاد بنایا۔ وہ نظام تھا دیہی جس میں ایک گاؤں کا سربراہ ہوتا تھا اس کے ساتھ محرر ہوتا اس کے بعد ایک چوکیدار اور دوسرے چھوٹے چوکیدار۔ یہ سب پرگنہ افسر یا ضلع افسر کے زیر کمان ہوتے۔ خرابی یہ تھی کہ مالیہ، مال، عدالت، پولیس، فوج ان سب کے فرائض اس عملے کے ذمے ہوتے نتیجہ یہ کہ کوئی ایک کام بھی نہیں ہوتا تھا۔ صورت حال کو بہتر بنانے کے لئے مدراس ایکٹ مجریہ 1859ء کے تحت پولیس کی نگرانی کی تمام ذمہ داری پولیس افسروں (کمشنر اور ایس پی صاحبان) کو دے دی گئی جنہوں نے مختصر سے عرصے میں اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کیا اور اپنی فورس کو بھی بہتر طور پر منظم کرلیا۔ پرانی سے بھی موثر طریق سے کام لیا گیا اور باقاعدہ کانسٹیبل بھی اب اس تنظیم کے بنا دئے گئے۔

مدراس کے بعد بمبئی پریذیڈنسی میں پولیس کی باقاعدہ تشکیل 1818ء اور 1833ء کے درمیان منظور کئے گئے مختلف قوانین کے تحت ہوئی۔ ابتداً میں پولیس کے بہت سے اختیارات ممتاز زمینداروں اور معتبرین کو دئے گئے جن کی نگرانی فوجداری عدالت کرتی تھی۔ بمبئی والوں نے مدراس والوں سے کوئی خاص سبق نہیں دیکھا تاہم جب سر چارلس نیپئر نے آئیرلینڈ کی پولیس کی طرز پر سندھ پولیس کھڑی کی تو بمبئی والوں نے اس سے اثر

قبول کیا۔ اتفاق کی بات یہ تھی کہ سندھ کو الگ صوبہ نہیں رہنے دیا گیا بلکہ اسے بمبئی پریذیڈنسی کا ہی حصہ بنا دیا گیا۔ لامحالہ یا بمبئی کی پولیس والا ڈھانچہ سندھ میں رائج ہو جاتا یا معاملہ اس کے برعکس ہوتا۔ اور برعکس ہی ہوا کیونکہ بمبئی والوں نے سندھ والا ڈھانچہ 1853ء میں قبول کر لیا پولیس کو ایک خود مختار ادارہ سنایا گیا۔ ہر ضلع میں اسے ایک سپرنٹنڈنٹ پولیس کے تحت رکھا گیا جس پر ڈپٹی کمشنر یا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی ایک رسمی سی نگرانی رکھی گئی تھی۔ اسی طرح ہر تحصیل میں بھی پولیس افسر اور تحصیلدار (جسے سندھ میں معالمت دار کہا جاتا تھا) کے درمیان اسی قسم کا (ڈی سی ۔ ایس پی والا) تعلق رکھ دیا گیا۔ مجموعی طور پر کنٹرول فوجداری عدالت سے لے کے حکومت کو دے دیا گیا۔ یعنی یہ کام عدلیہ کے سیکٹری کے سپرد کر دیا گیا مگر اس کے پاس بھی قوت نہیں تھا چنانچہ محکمہ کو کمشنر پولیس (یا انسپکٹر جنرل پولیس) کے ماتحت ایک خود مختار حیثیت دے دی گئی۔

اتنی تبدیلی کے باوجود 1856ء میں پولیس اور انتظامیہ کے درمیان اسی قسم کا تعلق اور افسری ماتحتی تھی جیسی مدراس میں تھی یعنی تحصیلدار کو پولیس پر کنٹرول بھی تھا' وہ کچھ پولیس والے کام بھی کرتا اسے کچھ معاملات میں تفتیش' مقدمہ چلانے اور فیصلہ دینے کا بھی اختیار تھا یہ کام بمبئی کے صوبہ (پریذیڈنسی) میں ہو رہا تھا لیکن حکومت کے خیال میں اس طور بھی پولیس کی پوری کارکردگی کا مظاہرہ نہیں ہو رہا تھا۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد تجربات کی بنا پر فیصلہ کیا گیا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ انتظامی اور عدالتی امور پر زیادہ توجہ دیتا ہے اس لئے اس پہ کام مختص کر دیئے جائیں اور پولیس کو ان سے آزاد کر دیا جائے۔ یعنی پولیس جرائم کی روک تھام اور انسداد کے لئے بغیر کسی رکاوٹ اپنے طور پر مصروف رہے ان کا ضلعی سربراہ ایس پی ہو جو صرف رسمی طور پر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے ماتحت تصور کیا جائے کیونکہ پورے ضلع کی مجموعی ذمہ داری بہرطور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ پر ہی عائد ہوتی ہے۔ اب ایس پی کو اپنی پوری تنظیم کو زیادہ مربوط بنانے کے لئے ایک اور نفر دے دیا گیا جس کا عہدہ نائب پولیس عملدار تھا۔ بمبئی کے اس پولیس عملدار' مدراس کے تحصیلدار اور بنگال کے داروغہ کے فرائض میں ایک طرح کی مطابقت پائی جاتی تھی انہیں بعض جرائم' معالمت اور مقدمات کی تحقیق و تفتیش کا بھی اختیار تھا اور مقدمہ چلا کر سزا سنانے اور اس پر عمل کرانے کا بھی کہا جاسکتا ہے کہ بعض عدالتی نوعیت کے چھوٹے چھوٹے کام بالواسطہ طور پر پولیس ہی کے ذریعے

طے پانے لگے تھے۔

مدراس اور بمبئی میں انگریز پولیس کی تنظیم سے غالباً پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی کو حفاظتی پولیس کی ضرورت بنگال میں پڑی۔ شاہجہان کے بعد اورنگ زیب کے عہد میں بھی یورپی تاجر اور ایسٹ انڈیا کمپنی مصروف کاروبار تھے۔ اورنگ زیب 1658ء میں تخت نشین ہوا اس وقت شاہ شجاع بنگال کا گورنر تھا جس نے 1652ء میں انگریزوں کو بنگال میں تجارت کرنے کے مزید اختیارات دے دیئے تھے۔ شجاع اورنگ زیب کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس کے بعد 1660ء میں میر جملہ کو بنگال میں گورنر مقرر کر دیا گیا۔

اورنگ زیب کے عہد میں بنگال کے وہ حصے بھی فتح ہوگئے جو اس سے پہلے مغل سلطنت کا حصہ نہ تھے ان میں جنوبی بہار' چٹا گانگ کے علاقے شامل تھے۔ دراصل شاہجہاں کی زندگی میں ہی جانشینی کی جو جنگ شروع ہوگئی تھی اس کے دوران بنگال کے دور افتادہ علاقوں میں مرکز سے گریز کرنے والے عناصر زور پکڑنے لگے تھے۔ ان میں ہندو راجے بھی تھے اور مسلمان بھی ۔ ان کی دیکھا دیکھی انگریز بھی کچھ کچھ نئے روپ دھار رہے تھے۔ آسام' گڑھ گاؤں' اہوم میں بھی اورنگ زیب کے گورنروں کو خاصی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ مغل فوج اگرچہ غالب رہی مگر جانی اور مالی نقصان بہت ہوا۔ قحط اور اس کے بعد وبا نے بہت نقصان کیا۔ لیکن یہ معاملہ ختم نہیں ہوا۔ وقتاً فوقتاً یہاں (بنگال کے شمال مشرقی حصے آسام وغیرہ) میں دہلی سے آزادی کا پرچم بلند ہوتا رہا۔ یہ ہندو راجے ایک طرف تھے تو دوسری طرف ساحلوں پر انگریز غلبہ پارہا تھا یا کم ازکم حکمرانی کی دیوار میں شگاف پڑتا دیکھ رہا تھا اور اپنے تجارتی مفاد کی خاطر خود اس شگاف کو پاٹنے کی سوچتا رہتا تھا۔ چٹا گانگ کے ساحلوں پر بحری قزاقوں کا قبضہ تھا انہیں پرتگالیوں کی سرپرستی حاصل تھی ان کا دریائے فینی پر مکمل قبضہ رہا۔ نئے گورنر شائستہ خاں نے کچھ صورت حال بہتر کی اور مغلوں کی بحری فوج کی از سرنو تنظیم بھی کی ۔

انگریزوں نے 1651ء میں بنگال کے مقام پر پہلا تجارتی دفتر کھولا جو مختلف علاقوں سے چینی' ریشم اور دوسری اشیا خرید کر برآمد کرتا تھا۔ گورنر شہزادہ شجاع تھا اس نے تین ہزار روپے کے عوض تجارت کی اجازت دی تھی۔ 1661ء میں برصغیر میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے تمام دفاتر کی تنظیم نو کی گئی۔ یہ فعل دراصل ایک الگ حکومت قائم کرنے کے

مترادف تھا۔ کمپنی کا صدر دفتر مدراس میں تھا اور سورت کا دفتر بھی اس کے ماتحت تھا لیکن بنگال میں آنے کے بعد ان کے کاروبار نے دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی شروع کر دی۔ 1679ء میں انگریز جہازوں نے خلیج بنگال میں پہلی بار سفر کیا۔

انگریزوں نے بنگال میں طاقت پکڑنا شروع کر دی اور اورنگ زیب کے جاری کردہ ایک فرمان کے حوالے سے شکائت کی۔ یہ فرمان 1680ء میں جاری کیا گیا تھا۔ انگریزوں کا کہنا تھا کہ اس فرمان کے مطابق انہیں مزید ساڑھے تین فی صد ڈیوٹی ادا کرنی پڑتی ہے جبکہ انہیں مغل سلطنت میں تمام مقامات پر کسٹم کی ادائیگی کے بعد تجارت کی اجازت دی گئی تھی۔ ایک مطالبہ یہ تھا کہ راہ داری کی فیس تحائف' کلرک یا منشی کی فیس اور شہنشاہ کی حکومت کے مطابق بعض افسر تجارتی سامان کھول کر معائنہ کرتے اور بہت سا سامان کم نرخ پر خرید لیتے پھر یہی سامان کھلی مارکیٹ میں مہنگے داموں بیچ دیتے تھے۔

اس ضمن میں معروف مورخ جادو ناتھ سرکار نے اورنگ زیب کا موثر دفاع کیا ہے اور کہا ہے کہ مجموعی طور پر ڈیوٹی اڑھائی فی صد تھی لیکن صرف مسلمانوں اور جزیہ ادا کرنے والوں کے لئے۔ جبکہ انگریز جزیہ ادا نہیں کرتے تھے اس لئے ان کی ڈیوٹی ساڑھے تین فی صد تھی۔ اورنگ زیب نے اپنے بیٹے اعظم تک کو انگریزوں سے زبردستی کوئی شے خریدنے سے منع کر دیا تھا۔ لیکن سرکار کے کہنے کے مطابق '' خود انگریز تاجروں نے بعض افسروں (مغل) کے ساتھ بل کر بدعنوانیاں شروع کیں تو ان افسروں نے بھی انگریزوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا شروع کر دیا۔''

مغل حکومت نے انگریزوں کے مطالبات ماننے سے انکار کر دیا مگر انگریز اب خود کو اتنا طاقتور محسوس کرنے لگے تھے کہ وہ مغلوں سے اپنے مطالبات طاقت کے ساتھ منوا سکیں۔ نومبر 1686ء میں اسی وقت جنگ شروع ہوگئی جب ہگلی کے مغل کمانداد نے تین باغی انگریز سپاہیوں کو گرفتار کر لیا۔ انگریز نے ہگلی شہر کو نذر آتش کر دیا۔ مغل جہاز قبضے میں لے لیا اور شاہی کشتیوں کو آگ لگا دی۔ مغل گورنر نے انگریزوں کے تمام کارخانوں پر قبضہ کر لیا۔ انگریز فرار ہوئے مگر تباہی کرتے گئے۔ مغل گورنر نے بڑی سختی سے ان کی سرکوبی کی اور نومبر سے لے کر اگست 1687ء تک انگریز پسپا ہوتا رہا۔ لیکن اسی ماہ دوبارہ معاہدہ کے تحت انہیں ہگلی میں قیام کی اجازت مل گئی۔ انگریزوں نے چٹا گانگ کو محفوظ سمجھ کر اسے اپنا

اڈہ بنا لیا جہاں انہوں نے لوگوں پر بڑے مظالم توڑے۔ چنانچہ اورنگ زیب نے پوری سلطنت میں انگریز کی تجارت پر پابندی لگا دی۔ لیکن سمندر میں یورپی اقوام ایک ناقابل شکست طاقت بن چکی تھیں۔ ان میں برطانیہ والے سرفہرست تھے۔ مسلمانوں کا ایک نازک مسئلہ حج تھا۔ سمندر میں اب نہ مغل فوج محفوظ تھی اور نہ حجاج۔ چنانچہ 1690ء میں انگریزوں کو اپنا ہیڈ کوارٹر مدراس سے تبدیل کر کے کلکتہ میں لے آنے کی اجازت دے دی گئی۔ گویا برصغیر میں ایک دوسری آزاد حکومت کا صدر مقام کلکتہ ہوا جہاں سے 1857ء تک پورے برصغیر کا تسلط قائم ہو گیا۔

اس پس منظر میں دیکھا جاسکتا ہے کہ بنگال میں انگریزوں نے کب زور پکڑا اور پھر کس کس طور اپنی طاقت بڑھائی اور اپنے دفاع اور تحفظ کا سامان کیا۔ ہگلی میں کارخانہ یا گودام قائم کرنے کے بعد انگریزوں نے تعلق داری کے حقوق حاصل کئے یعنی اب وہ اپنے علاقے میں نہ صرف پہرے اور حفاظت کے لئے پولیس رکھ سکتے تھے بلکہ اس علاقے میں ہونے والے جرائم کی سزا بھی وہ اپنے وضع کردہ عدالتی ضوابط کے تحت دینے کے حق دار ہو گئے تھے۔ 1726ء میں انہوں نے ایک عدالت بھی قائم کرلی جیسے میئر کورٹ کہا جاتا تھا۔ یہ عدالت مقامی اور یورپی باشندوں میں تجارتی امور پر تنازعات کے فیصلے کرتی تھی۔ انگریزوں کا علاقہ پھیلتا چلا گیا۔ ظاہر ہے اگر وہ باقاعدہ جنگ پر اتر آئے تھے تو اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے پاس کس قدر فورس تھی۔ اور اس سے یہ اندازہ لگانا بھی مشکل نہیں کہ ان کے قبضے میں کتنا وسیع رقبہ آچکا تھا۔ اسی زمانے میں انہوں نے اپنے پولیس کے نظام میں بھی توسیع کی اور جنگ پلاسی سے بہت پہلے مقامی زمینداروں کو کوتوال یا فوجدار کی حیثیت سے فرائض سرانجام دینے پر تیار کرلیا تھا۔ ان پولیس افسروں کے ماتحت کئی کئی پیادے ہوتے تھے۔ بنگال میں انگریزوں کا مقدر ڈولتا رہا۔ ایک بار بے دخل ہوئے پھر آئے پھر فرانس والوں سے طویل عرصہ (1746-61) تک جھگڑتے رہے تا آنکہ کمپنی کے انچارج لارڈ کلائیو نے جنوری 1757ء میں نواب سراج الدولہ سے جو دہلی کے تخت سے آزاد ہو چکا تھا کلکتہ میں قیام کے نہ صرف حقوق دوبارہ حاصل کر لئے بلکہ اسے ایک قلعہ میں تبدیل کرنے کا حق بھی حاصل کیا۔ اس معاہدہ کے فوراً بعد سراج الدولہ اور انگریزوں میں مخاصمت شروع ہو گئی۔ کلائیو کو شک تھا کہ سراج الدولہ فرانسیسی تاجروں کو زیادہ قریب لا

رہا ہے۔ کلائیو نے سراج الدولہ کے ناتجربہ کار ہونے کا فائدہ اٹھایا۔ سراج الدولہ اپنے دادا علی وردی خان کی جگہ ایک سال قبل ہی تخت نشین ہوا تھا۔ سراج الدولہ کے سپہ سالار میر جعفر خان پر کلائیو نے ڈورے ڈالے۔ ہندو تاجر امیر چند یا امی چند نے اہم کردار ادا کیا۔ پلاسی کی جنگ انگریزوں سے ہوئی سپہ سالار میر جعفر انگریزوں سے ملا ہوا تھا چنانچہ سراج الدولہ ہار گیا۔ میر جعفر کو بنگال کا حکمران انگریزوں نے بنایا اور مالی مراعات حاصل کیں۔ کلائیو نے اپنے عمل کو دہرایا۔ بوڑھے جعفر کی جگہ اس کے کمانڈر انچیف میر قاسم کو نواب بنایا اور قاسم سے مدنا پور' چٹا گانگ اور بردوان کے بھی حقوق حاصل کر لئے۔ میر قاسم کس باغ کی مولی تھا۔ دوپاٹن کے بیچ میں ثابت رہا نہ کو۔ انگریز میر جعفر کو پھر مقابلے میں لے آئے۔ بکسر میں لڑائی ہوئی جس میں میر قاسم کا ساتھ اودھ کے شجاع الدولہ اور دہلی کے شاہ عالم ثانی نے دیا۔ قاسم وغیرہ ہار گئے کلائیو نے فصل کاٹی۔ الہ آباد کا معاہدہ ہوا جس میں دہلی کے مغل حکمران شاہجہاں ثانی نے بنگال بہار اور اڑیسہ کے تمام دیوانی اختیارات کمپنی کے نام لکھ دیئے ۔ بظاہر اس معاہدہ کا مطلب یہ تھا کہ کمپنی مالیہ اکٹھا کرنے کی ذمہ دار ہوگی عملاً کمپنی کو اس علاقے پر حکومت کرنے کے مکمل اختیارات حاصل ہوگئے یعنی سارے سول اور فوجداری حقوق کمپنی کو حاصل ہوگئے۔

بنگالیوں خصوصاً مسلمان بنگالیوں پر معاشی' انتظامی اور سماجی اعتبار سے جو کچھ گزری اس کا ذکر عبداللہ ملک نے اپنی کتاب '' بنگالی مسلمان کی صد سالہ جنگ آزادی'' (1757ء۔1857ء) میں کیا ہے ۔ انہوں نے مختصراً یہ نتائج نکالے ہیں۔

کمپنی کے آنے سے پہلے بنگال کے حکمران مسلمان تھے۔ فوج تھی تو اس میں مسلمان کی اکثریت تھی ۔ پولیس تھی تو اس میں مسلمانوں کی کثیر تعداد تھی۔ پلاسی کے میدان میں مسلمانوں کو شکست ہوئی تو فوج اور پولیس سے مسلمانوں کو علیحدہ ہونا پڑا۔

دوسرا حملہ اس وقت ہوا جب میر قاسم' شجاع الدولہ اور شاہجہاں ثانی نے دیوانی کے اختیارات کمپنی کو دے دیئے۔ مال گزاری وصول کرنے کے زیادہ اختیارات مسلمانوں کے پاس تھے۔ انگریز نے ان کی جگہ اپنے گماشتے رکھے۔ تیسرا شدید حملہ بندو بست دوامی کی آڑ میں کیا گیا کہ پہلے نظام کے تحت اراضی ایک مقررہ مالیہ ادا کرنے کے معاہدہ پر مستقلاً ایک شخص کے نام منتقل ہو جاتی تھی' انگریزوں نے اس انتقال کے لئے نیلام کو ذریعہ

بنایا۔ مسلمانوں کے پاس نقد روپیہ نہ تھا- ہندو اور کمپنی ملازموں اور گماشتوں کے پاس کیش تھا۔ زمینیں مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل کر غیر مسلموں کے ہاتھ میں چلی گئیں۔

اس کے ساتھ ہی دیہی انتظامیہ بھی بدل گئی۔ جو نئے زمیندار دیہات میں آئے انہوں نے دیہی انتظامی عہدہ دار' پولیس چوکیدار' محرر وغیرہ ہٹا دئے ان کی جگہ اپنے اہل کار لے آئے ۔پھر اس کے بعد پورے پچاس برس بنگال میں امن چین غائب ہوگیا۔ کمپنی کے مزدور کارندوں' نوزمینداروں اور تاجروں کی چیرہ دستیوں نے بنگال کے کاشتکاروں' خصوصاً چھوٹے چھوٹے اور مسلمانوں کاشتکاروں کو بار بار بغاوت اور مزاحمت پر مجبور کر دیا۔ ان زیادتیوں کا اعتراف خود کمپنی کے ایک مقرر کردہ کمیشن (1788۔1772) کے زمانے میں حالات نے دوسرا رخ اختیار کرنا شروع کیا اور مختلف محکموں کی واضح صورت گری ہونے لگی۔

وارین ہیسٹنگز نے پہلا کام یہ کیا کہ کمپنی کے ملازمین خرید نے سے منع کر دیا۔ نواب کے عدالتی افسروں کو تبدیل کر کے کمپنی کے آدمیوں کو جج وغیرہ مقرر کیا اور جو نگران افسر پہلے مقرر ہو چکے تھے انہیں ضلعی ناظم یا کلکٹر مقرر کردیا۔اس نے پورے علاقے کو چودہ اضلاع میں تقسیم کردیا۔ ہر ضلع کی اپنی فوجداری اور سول انتظامیہ مقرر کی۔ دیوانی عدالتوں کے ججوں اور مجسٹروں کو متنازعہ رقم بطور تنخواہ ادا کی جاتی تھی لیکن یہ طریقہ بھی منسوخ کردیا گیا اور کلکتہ میں فوج داری اور دیوانی کی دو دو عدالتیں قائم ہوئیں۔

بنگال میں وارین ہیسٹنگز کمپنی کا پہلا سربراہ تھا جس نے مغلوں کی طرز پر تنخواہ دار پولیس کوتوال ملازم رکھے۔ انہی دنوں جب ڈاکے کی وارداتوں میں بہت اضافہ ہوا تب اس نے زمینداروں' کسانوں اور مالیہ وصول کرنے والے اہل کاروں کی بھی پولیس کے کچھ اختیارات دے دئے۔ کلکٹروں یا ڈپٹی کمشنروں سے عدالتی اختیارات لے لئے گئے اور دیوانی اوار فوجداری عدالتیں یورپی ڈسٹرکٹ ججوں کو دے دی گئیں۔ یورپینوں کی تقرری کا تجربہ کامیاب نہ ہوا کہ کیونکہ ان کے اور صاحبان مقدمہ کے درمیان زبان کا سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ دارین ہیسٹنگز نے متعدد شہروں اور اضلاع میں فوجدار مقرر کئے جنہوں نے زمینداروں اور ان کی پولیس کو کنٹرول کیا عدالتوں کو بہت کم اختیارات دیئے گئے جس کے نتیجے میں نظام موثر طریق سے نہ چل سکا۔ زمینداروں کو بھی جرائم روکنے اور مجرموں کو

پکڑنے کا اختیار دیا گیا۔ شہروں میں یہ ذمہ داری محلّہ داروں پر ڈالی گئی اور دیوانی عدالتوں کو بھی اختیار دیا گیا کہ وہ مجرموں کو پکڑ کر فوجداری عدالتوں کے سپرد کریں۔ یہ سب کچھ کرنے کے باوجود ڈکیتی راہ زنی اور قتل کی وارداتوں میں زیادہ کمی نہیں آئی۔

برطانوی حکومت نے کمپنی کے معاملات پر بھی کچھ مزید کنٹرول حاصل کرنے کے لئے قانون بنایا جس کے تحت بنگال میں کمپنی کے انتظام (حکومت) کو پریزیڈنسی کا نام دیا۔ اس کے گورنر کو گورنر جنرل بنایا اوار مدارس اور بمبئی کے سربراہوں کو گورنر جنرل کا ماتحت بنا دیا۔ گورنر جنرل کی مدد کے لئے ایک کونسل اور عدلیہ کے لئے سپریم کورٹ بنائی گئی جس میں ایک چیف جج اور باقی تین جج شامل تھے۔ ججوں کی تقرری حکومت برطانیہ کرتی اور وہ گورنر جنرل اور اس کی کونسل سے بھی آزاد ہوتے۔ اس طرح انتظامیہ اور عدلیہ میں اور کمپنی اور حکومت میں اختیارات کا ایک نیا توازن قائم کیا گیا۔

اگلے گورنر جنرل کارینوالیس نے پولیس کے بارے میں کچھ قوانین منظور کئے جو 1792ء میں بنگال، بہار اور اوڑیسہ میں نافذ کئے گئے ۔ انہیں میں سے قانون کے تحت تاجروں، دکانداروں اور درآمد برآمد کنندگان پر پولیس ٹیکس لگایا گیا۔ اسی برس اضلاع میں زمینداروں سے جرائم کے متعلق نہیں۔ ان کی جگہ چار سو مربع میل رقبے پر مشتمل ایک ایک حلقہ بنایا گیا جس میں ایک داروغہ اور کچھ کانسٹیبل مقرر کئے گئے۔ جو کوتول اور داروغہ مقرر کئے جاتے ان سے پانچ اور ایک ایک ہزار روپے کی ضمانت لی جاتی۔ ڈاکوؤں چوروں کو پکڑنے والے اور ان کے سزا پانے پر دس روپے نقد کا انعام یا توتعریفی اسناد کا سلسلہ شروع ہوا جو اب تک جاری ہے اور پولیس والے بھی اس سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ مزید یہ کہ اگر چرایا ہوا یا لوٹا ہوا مال برآمد ہو جاتا تو اس کی مالیت کی دس فی صد رقم داروغہ کو بطور انعام دی جاتی۔

اب کچھ کچھ نئے قوانین بھی بننے لگے جن کی خلاف ورزی کی روک تھام یا نفاذ کا اہتمام پولیس کے سپرد کیا جانے لگا۔ یورپی باشندوں اور کمپنی کے ملازمین کو برصغیر کے شہزادوں اور دوسرے موقر لوگوں کو سود کی بڑی شرح پر قرض دینے کی ممانعت کر دی گئی۔ گنگا میں بچوں کی قربانی اور ستی کی رسم پر بھی پابندی لگانے کا سوچا جانے لگا۔ کچھ معتبر مسلمانوں اور ہندوؤں کو پولیس کا امین بھی مقرر کیا جانے لگا جو مجرموں کو پکڑوانے میں

پولیس کے مدد گار ہوتے مگر لگتا ہے کہ یہ طریق کامیاب نہیں ہوا اور 1810ء میں اسے ترک کردیا گیا۔

1808ء میں پولیس اور عدلیہ کے دوسرے افسروں کے عہدوں سپرنٹنڈنٹ پولیس اور جسٹس آف پیش مقرر کئے گئے۔ انہیں کلکتہ' ڈھاکہ اور مرشد آباد ڈویژنوں کے ڈسٹرکٹ مجسٹریوٹوں کے برابر رتبہ دیا گیا۔ اکیس برس بعد یہ عہدہ اڑا دیا گیا مگر آٹھ سال بعد دوبارہ بحال کردیا گیا۔ پولیس کے بعض اختیارات (جیسا کہ مدراس میں تھا) تحصیلداروں کے پاس بھی تھے۔ پھر بنگال' بہار اور اوڑیسہ میں 1817ء سے تمام پولیس افسروں کی تقرری ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کے سپرد کر دی گئی۔ یہ طریق 1861ء تک جاری رہا جب پولیس ایکٹ بنایا گیا۔

سندھ میں چارلس نپئیر کا تجربہ

جن علاقوں پر اب (1997ء) پاکستان مشتمل ہے یہاں برطانوی پولیس کا پہلا سایہ صوبہ سندھ پر پڑا جو اس وقت بلوچ ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ ادھر افغانوں کی بھی یلغار رہتی تھی سکون صرف بلوچستان کی طرف سے تھا۔ ٹھٹھہ اور کراچی سے ملحقہ علاقوں میں یورپی کوٹھیوں کو موثر کنٹرول تھا اور سندھی اور پنجابی کے صوفی شاعر سچل سرمست اپنے اشعار میں انگریزوں کی آمد اور غارت گری کے خدشات سے اہل سندھ کو آگاہ کر کے رخصت ہو چکے تھے۔

جب انگریز (1842ء میں) افغانوں سے پہلی جنگ کر رہے تھے اس وقت انہوں نے سندھ کی رضا مندی حاصل کئے بغیر سندھ کے دریاؤں اور سڑکوں کو اپنی فوج کارروائی کی خاطر استعمال کیا۔ زمانہ لارڈ ایلن برو کا تھا۔ سندھی ریاستوں کے میر صاحبان ناراض تو بہت ہوئے تھے۔ مگر ع

نے ہاتھ باگ رتھانہ پا تھار کاب میں

اس لئے دانت پیس کر رہ گئے اور جیسے ہی جنگ ختم ہوئی تو سرچارلس نپئیر (کراچی اور سندھ کے کئی شہروں میں اس نام سے سڑکیں آبادیاں اور دوسرے مقامات منسوب ہیں) پوری فوج طاقت اور پورے سول اختیارات کے ساتھ سندھ پر قابض ہو گیا (1843ء)۔ نپئیر ہر چند کہ ایک استعماری اور سامراجی قوت کا نمائندہ تھا مگر بے شمار صفات کا مالک بھی تھا۔ ذہین سبک رفتار اور جاہ جلال حاصل کرنے کی خواہشات رکھنے والا۔ اس نے ایک کتاب بھی لکھی ہے جس میں لکھا ہے کہ اگر میں بارہ سال تک ہندوستان کا بادشاہ بن جاتا تو ریل کے جال بچھا کر اور دریاؤں پر پل باندھ باندھ کر ایسی صورت پیدا کر دیتا کہ نہ کوئی شہزادہ راجہ باقی رہ جاتا۔ یعنی جو ریاستیں نیم آزاد بچ گئی تھیں وہ بھی برطانوی سلطنت کا برابر کا حصہ ہوتیں' نہ کسی کو نظام (حیدر آباد دکن) کی خبر ہوتی کہ کون تھا اور نہ

نیپال کا الگ ملک کی حیثیت سے باقی بچا ہوتا۔''

این۔ اے رضوی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ سرچالس نیپئر تازہ تازہ انگلستان سے آیا تھا جہاں کوئی چودہ برس پیشتر سرچارلس پیل کی وضع کردہ پولیس اصلاحات نافذ کی گئی تھیں۔ چنانچہ نیپئر نے سندھ میں پہنچتے ہی یہ سوچا کہ تازہ مفتوحہ علاقہ میں سرتاسر سول پولیس قائم کرنا درست نہیں اس لئے اس نے سول پولیس اور فوج کو ملا کر پولیس کا ڈھانچہ آئرلینڈ کی کنسٹیبلری طرز پر کھڑا کردیا۔ یہ بظاہر ایک مکمل خودمختار یونٹ تھا اور اس کو شروع میں ہی جو کامیابیاں ہوئیں اس کی بنا پر پہلے بمبئی کے گورنر نے یہی طریق بمبئی میں رائج کرنا چاہا پھر پنجاب پر انگریزوں کی کامیابی کے بعد نیپئر کی تخلیق کردہ پولیس سے استفادہ کیا گیا۔ پھر گورنر جنرل لارڈ ایلن برو نے اس پولیس کی کامیابی کی بنا پر آگرہ اور اودھ میں یہی پولیس کا محکمہ اسی طور مرتب کرنے کا حکم دیا۔ سرچارلس نیپئر کا پولیس کا انتظام بہت دور دور تک پسندیدہ گردانا گیا۔ پنجاب کے سرہنری لارنس نے بھی کچھ تبدیلیوں کے ساتھ یہی انتظام اپنے ہاں رائج کیا۔

انگریزوں کے آنے سے پہلے تالپوروں کا انتظام یہ تھا کہ ریاست پرگنوں اور تپوں میں انتظامی طور پر تقسیم ہوتی۔ ہر تپہ محکمہ مال کے کاردار کے ماتحت ہوتا۔ بڑے شہروں پر کوتوال کا انتظام ہوتا۔' کوتوال اور فوجدار کے ماتحت گھوڑ سوار پولیس ہوتی مگر یہ تعداد میں زیادہ نہیں ہوتی تھی۔

رواج انتظام یہ تھا کہ ہر گاؤں اپنی چوری کا خود ہی ذمہ دار ہوتا۔ اگر چور نہ ملتا اور مال برآمد نہ ہوتا تو سارے گاؤں والوں کو بھرنا پڑتا۔ قبیلے کے سردار یا آبادی کے وڈیرے کا حکم عموماً بڑا منصفانہ غیر جانبدارنہ اور کم خرچ ہوتا۔ گویا نظام عدل اور نظم ونسق دونوں بڑے سادہ اور کم خرچ تھے۔ قبائلی ڈھانچہ بڑا مضبوط تھا مگر گاؤں میں پنچائت ہوتی جو تمام دیوانی اور فوجداری معاملات کا فیصلہ کرتی۔ جب نیپئر نے گورنر جنرل ایلن برو کے کہنے پر سندھ پر دھاوا بول دیا تو سندھ کے حاکم اس صورت حال سے نمٹنے کے لئے تیار نہ تھے۔ بہر حال فروری 1843ء میں میانی اور مارچ میں دوآب کی جنگ میں سندھی ہار گئے اور نیپئر نے ایک قسم کی مارشل لائی حکومت قائم کرلی۔ نیپئر نے حکومت کو چار حصوں میں تقسیم کیا۔ پہلا سول انتظامیہ کا حصہ تھا دوسری فوج یعنی خالصتاً فوجی شعبہ۔ تیسرے گھوڑ سوار

دستے جو فوجی شعبہ سے الگ تھے۔ یہ دستے ہر وقت تیار رہتے ۔ چوتھا شعبہ پولیس کا تھا اور یہی شعبہ حاکموں اور رعایا کے درمیان تنازعہ کی صورت میں سب سے بڑا وسیلہ تھا۔ اگر معاملات پولیس کے قابو سے باہر ہو جاتے تو پھر گھوڑ سوار آگے کر دئے جاتے جب بات ان سے بھی نہ بنتی تو پھر باقاعدہ فوج کو میدان میں اتار دیا جاتا۔

نیپئر نے سندھ کو بھی تین حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا اور پھر بالائی سندھ کو (جس کی سرحد ایک طرف سکھوں کی آزاد ریاست' دوسری طرف ریاست بہاول پور اور تیسری طرف بلوچستان سے ملتی تھی) بھی ایک فوجی افسر کے سپرد کر دیا تھا۔ سندھ کے حالات یہ تھے کہ قبائلی سربراہ سابق ریاستوں کے حکمران اور ان کے رشتہ دار کہیں نہ کہیں بغاوت یا نافرمائی کا جھنڈا بلند کر لیتے۔ نیپئر نہیں چاہتا تھا کہ ان سویلین لوگوں کو باقاعدہ فوج کے ذریعے مطیع کیا جائے۔ اس کی نظر میں فوج کو ان لوگوں سے دور رکھنا چاہئے (اتفاق سے اس فوج میں بنگال' یوپی اور سی پی والے زیادہ تعداد میں تھے۔ پنجابی اس سے کوئی پندرہ سال بعد انگریزی فوج میں بھرتی کئے گئے تھے۔) چنانچہ نیپئر نے دوہزار بہترین افراد کی شہری پولیس تیار کی جو بہترین تربیت یافتہ تھے ان کو تین حصوں میں تقسیم کی گیا۔ ایک حصہ شہروں کے لئے ایک نیم دیہی علاقوں کے لئے اور تیسرا اصلاً دیہی علاقوں کے لئے بچا۔ مگر وہ پولیس شہروں میں بھی بوقت ضرورت استعمال کی جاسکتی تھی۔ پہلا حصہ پیادہ افراد پر مشتمل تھا دوسرے حصے میں پیادہ بھی اور گھوڑ سوار بھی۔ شہری پولیس تین بڑے شہروں کراچی' حیدر آباد اور شکار پور کے لئے مخصوص تھی ۔ نیپئر کے ساتھی ایڈورڈ چارلس مارسٹن نے کراچی والی پولیس کو خود تیار کیا اور اسی کراچی والی پولیس کو بعد میں سارے ہندوستان میں نظیر بنایا گیا۔

1859ء میں سندھ میں گھوڑ سوار پولیس دوحصوں میں تقسیم تھی ایک باقاعدہ اور دوسرے بے قاعدہ۔ گھوڑے سوار پولیس کا کاربین اور تلوار سے مسلح کیا گیا تھا جبکہ دوسری قسم کی پولیس کی وردی تو عام طور پر یکساں ہوتی یعنی سفید کپڑے ہوتے مگر ان کے پاس ہتھیار طرح طرح کے ہوتے ۔ ان میں گھوڑ سوار بھی ہوتے اور پیدل بھی ہوتے جن کے پاس تلوار' ڈھال اور توڑے دار بندوق ہوتی۔ اس فورس کے گھوڑ سوار دستے ضلع شکار پور میں متعین تھے ۔ ان میں صرف چانڈیہ' جھکرانی' ڈومبکی اور دوسرے سرحدی قبائل کے لوگ

شامل تھے۔

دیہی پولیس دوسرے مقامی پیادہ دستوں کی طرح مسلح ہوتی ۔ اس کی وردی بھی اسی قسم کی ہوتی۔ ان کے فرائض محافظوں جیسے تھے۔ انگریز کے سامراجی انتظامی ڈھانچے میں پولیس کا یہ شعبہ بہت اہمیت کا مالک تھا۔ کیونکہ یہ حکمرانوں' دفاتر خزانوں اور جیلوں کی حفاظت پر مامور تھا۔ دیہی پولیس سرکاری دیوانی اور فوجداری احکامات کی تعمیل بھی کرواتی' اسی پولیس نے آ کر فوجیوں کو ان فرائض سے سبکدوش کرایا تھا۔ یہی دیہی پولیس کسی علاقائی جنگ کی صورت میں فوج کی بہترین راہ نما اور مددگار ثابت ہوتی۔

تھانے کے سربراہ کا فرض تھا کہ وہ پورے علاقے اور وہاں کے سربراہوں اور دوسرے لوگوں سے پوری طرح واقف ہو۔ یہ تھانے صوبے کے حاکموں کو ہر وقت ضروری اطلاعات فراہم کرتے' ان تھانوں کے پاس گھڑ سوار دستے ہوتے جو اپنے اپنے علاقوں میں باقاعدگی سے گشت کرتے اور گشت کے دوران یہ اہتمام کیا جاتا کہ ایک تھانے اور دوسرے تھانے کے گشتی دستوں میں ملاپ بھی ہوتا رہے یوں اطلاعات اور خبر تیزی سے متعلقہ تک پہنچائی جا سکتی تھیں۔ تمام تھانیداروں اور پولیس کے شعبوں کو ہدایت تھی کہ وہ حالات و واقعات پر نظر رکھیں جن کا براہ راست یا بالواسطہ طور پر انتظامیہ سے تعلق ہے یا انتظامیہ ان سے متاثر ہوگی۔ ان کے ذمہ مشکوک اور مشتبہ افراد کی نگرانی بھی تھی۔ مطلوبہ اطلاعات فراہم کرنے کا کام صرف ایک قسم کے عہدہ دار کا فرض نہ تھا بلکہ ہر پولیس والے کا فرض تھا کہ اسے جو خبر ملتی ہے یا جو وہ مشاہدہ کرتا ہے فوری طور پر اپنے سینئر کو پہنچائے اور یوں شدہ شدہ یہ اطلاعات مرکز میں پہنچ جاتیں۔ یوں سندھ میں فرنگی سرکار کے خلاف کسی قسم کی سازش یا باغیانہ سرگرمی کی گنجائش کم سے کم تر ہوتی گئی۔

صوبہ سندھ یا کسی بھی علاقے میں جس طور پولیس کو مستعد ہونا چاہیئے اور بوقت ضرورت دوسرے فرائض بھی ادا کرنے کا اہل ہونا چاہیئے سندھی پولیس اس معیار پر پورا اترتی تھی۔ یہ پولیس محکمہ مال اور دوسرے محکموں کے دورہ کرنے والے افسران یا مسافروں کے لئے سواری کا بندوبست بھی (فرمائش پر) کر دیتی اور بعض اوقات لوگوں کو بیگار میں بھی پکڑ کر لے جاتی۔

کراچی کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ پولیس کو حکم تھا کہ رات گیارہ بجے کے

بعد وہ تمام افراد گروپوں سے پوچھ گچھ کرے اور دیکھے کہ کیا ان کے پاس مجسٹریٹ کے جاری کردہ پاس ہیں یا نہیں‘جن قیدیوں سے جیلوں سے باہر مشقت لی جاتی تھی ان کی نگرانی بھی پولیس کے ذمے تھی۔ سندھ میں سب سے پہلے تین جیل خانے کراچی‘ حیدرآباد اور شکار پور میں قائم کئے گئے جن کے انچارج فوج کے لفٹین بنائے گئے۔ محکمہ مال کے افسروں کے اختیارات اور دبدبہ کو قائم کرنے کے لئے پولیس سے بہتر کون ذریعہ تھا حتیٰ کہ نیپئر نے ضلع کا اعلیٰ انتظام اعلیٰ ایک طرح سے پولیس کپتان کو ہی سونپ رکھا تھا جس کے کام میں کلکٹر کو بھی دخل دینے کی اجازت نہ تھی۔ کلکٹر کو یہ اختیار تھا کہ وہ پولیس کو حکم دے کہ فلاں نادہندہ کو گرفتار کر لائے یا فلاں سے مالیہ وصول کرائے ۔ نیپئر کی نظر میں اس حکمت عملی کا فائدہ یہ تھا کہ دونوں شعبے ایک دوسرے کی کارکردگی یا بدعنوانی پر نظر رکھتے تھے یوں چیک اور بیلنس کا سلسلہ بھی چلتا رہتا۔

اس زمانے میں جرم و سزا کی تعریف اور حدود اور سزائیں طے پا چکی تھیں۔ سزاؤں میں جرمانہ‘ قید سادہ یا بامشقت‘ کوڑے‘ عبور دریائے شور اور سزائے موت شامل تھیں۔ چارلس نے اپنی پولیس کو یہ سکھایا تھا کہ ملزم کی سب سے پہلے اچھی طرح دھنائی کرو۔ بعد میں اس سے ہمدردی کرو۔ چارلس کی نظر میں کوڑوں کی سزا پھانسی کی سزا سے بھی زیادہ موثر ثابت ہوتی تھی ۔ اس کی نظر میں آدمی کو محض تقدیر سمجھ کر کچھ مطمئن ہو جاتا ہے مگر کوڑوں کی سزا کی ایسی تعبیر نہیں کی جاسکتی۔

چارلیس نیپئر نے پولیس کو ان اصولوں پر کھڑا کیا تھا۔ پہلا یہ کہ اس کی وضع قطع تربیت اور مزاج نیم عسکری (فوجی) ہونا چاہئے ۔ ان کا مقامی آبادی سے کم سے کم رابطہ ہونا چاہئے۔ اس لئے انہیں بیرکوں (لائنز) میں الگ تھلگ رکھا جانا چاہئے اور تیسرے یہ کہ اس کا کنٹرول مرکزی ہونا چاہئے۔ سندھ میں قائم کی گئی یہ پولیس اس سے پہلے سو ڈیڑھ سو سال کے عرصہ میں کئے گئے پولیس کے انتظامات سے بہت بہتر نکلی۔ چنانچہ پورے ہندوستان (آج کے پاکستان سمیت) میں سندھ پولیس کا نمونہ قابل تقلید قرار پایا۔

1857ء میں پولیس کا کردار

اے۔ڈی۔اعجاز 1857ء کی جنگ آزادی کے مجاہد احمد خان کھرل کے بارے میں اپنی پنجابی کتاب ''کال بلیندی'' میں لکھتے ہیں اس دن (26/27 جولائی) اسسٹنٹ کمشنر برکلے نے کتار مکھی بٹالین کے ساتھ اس ہنگامے (گوگرہ جیل کوتوڑنے کے ہنگامے) پر قابو پالیا تھا۔کتار مکھی پنجاب میں انگریز پولیس کا پہلا سراپا تھا۔

جب چناب پار گجرات کے علاقے میں لڑی جانے والی سکھوں اور انگریزوں کی لڑائیاں ختم ہوئیں اور پنجاب کو انگریزی علاقے میں شامل کرلیا گیا تب مسٹر ہنری لارنس کا کمپنی کی طرف سے انتظامات کا حکم دیا گیا۔ چنانچہ اس نے پہلا کام یہ کیا کہ کمشنر اور ڈپٹی کمشنر مقرر کردیئے اور نہیں پہلے دو کام یہ سونپے گئے کہ وہ اپنے گھروں کی مرمت کرائیں اور دوسرے اپنے اپنے علاقے میں پولیس کی بھرتی کریں۔ کیونکہ اب نیم فوجی یا فوجی بٹالین جو پولیس کا سا کام کرتی تھی ختم کر دی گئی ہے۔اس خلا کو پر کرنا ضروری تھا۔ مرکزی حکومت کی طرف سے یہ ہدایت بھی آئی تھی کہ سندھ پولیس کا نقشہ ملحوظ رکھا جائے۔ پنجاب میں اسے قبول بھی کیا گیا اور ترامیم بھی کیں۔ پہلی سطح پر کمشنروں نے ملیشیا کے ساتھ فوجی گھوڑ سوار اور پیدل بٹالینیں بھی رکھ لیں۔ ان کا افسر اعلیٰ چیف کمشنر (جسے بعد میں لیفٹیننٹ گونر اور گورنر کا نام دیا گیا تھا۔) اس کے ساتھ ساتھ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی سربراہی میں برقندازوں کو از سرنو منظم کر کے اسے پولیس کا نام دیا گیا۔

پولیس کی جو پہلی چار بٹالینیں قائم کی گئی تھی ان میں زیادہ وہ سکھ سپاہی لئے گئے جو رنجیت سنگھ کی پولیس میں تھے اور انگریز انہیں بہت بہادر اور وفادر قرار دیتا تھا۔ زیادہ سکھ وہ تھے جو گجرات کی لڑائیوں کے دوران انگریزوں کے وفادار رہے۔ پہلی بٹالین کا نام لاہور بٹالین رکھا گیا دوسری بٹالین کو رنجیت سنگھ کی من پسند شیر دل کا نام دیا گیا۔ پھر تیسری اور چوتھی بٹالینیوں کے نام کتاریا کو تارمکھی اور سورج مکھی رکھا گیا یہ دونوں نام بھی پرانی سکھ فوج

کی بٹالینیوں کے تھے۔

ہر بٹالین کا سب سے اعلیٰ افسر یورپی تھا' جبکہ باقی افسر اور سپاہی مقامی تھے پہلی بٹالین میں تقریباً سبھی سکھ تھے جبکہ دوسری بٹالین میں مسلمان بھی تھے۔ بٹالین کے سب سے سینئر افسر کو کمیدان کہا جاتا تھا۔ کمانڈنٹ کی بدلی شکل والا یہ لفظ سکھ فوج میں رائج تھا جبکہ بٹالین کے انگریز سربراہ کو کپتان کہا جاتا کیونکہ وہ فوج میں کپتان رہ چکا ہوتا۔ پولیس میں اس کا عہدہ اسی کے برابر ہوتا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس کو آج بھی پولیس کپتان کہا جاتا ہے۔

بٹالین کے انگریز افسر کا کام اپنی بٹالین کی نگرانی' راہ نمائی' تربیت اور حوصلہ افزائی ہوتی۔ جبکہ افراد کی وفاداری' استعداد اور نظم و ضبط کی پابندی کروانا کمیدان کا فرض ہوتا۔ این۔ اے۔ رضوی نے ایچ۔ ایل۔ او گیرٹ Garrett کی کتاب Old Battalions of Police in the Punjab سے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ انگریز افسر کو ایک کمیدان فتح سنگھ کی وفاداری پر کچھ شک گزرا۔ اس وقت کوئی کارروائی ہو رہی تھی چنانچہ اس نے فتح سنگھ سے کہا کہ اگر یہ مرحلہ کامیابی سے سر ہو گیا تو اسے حکومت سے جاگیر دلوائی جائے گی۔ مرحلہ کامیاب ہوا اور فتح سنگھ کو ایک ہزار روپے سالانہ کی جاگیر دی گئی جبکہ دوسرے کمیدانوں کو ایک سو روپے کا ماہانہ ذاتی الاؤنس دیا گیا۔

ان چار بٹالینوں کے کمیدانوں کے نام تھے موتا سنگھ' عطر سنگھ' بدری ناتھ اور فتح سنگھ۔ یہ سب لوگ بڑے تجربہ کار تھے۔ انہوں نے سکھ فوج کے ساتھ رہ کر کئی مقامات پر معرکوں میں حصہ لیا تھا جسم پر گولیوں اور تلواروں کے نشان تھے۔ موتا سنگھ کو لاہور پر قبضہ کے بعد کورٹ لینڈ کے توپ خانہ میں میجر بنا دیا گیا۔ اس وقت اس کی عمر چھیالیس برس تھی اور انگریزوں کی پالیسی تھی کہ وہ مقامی لوگوں کو تجربہ وغیرہ کی بنیاد پر ادھیڑ عمر میں جا کر ہی اہم عہدہ دیتے تھے۔ انگریزوں کو ان اولڈ سکھ بٹالینوں پر بڑا اعتماد تھا۔ ان کی کارکردگی سے بہت خوش تھے اور 1852ء میں انگریزوں نے رنجیت سنگھ کے ان سپاہیوں کی کارکردگی' وفاداری اور مستعدی پر اطمینان کا اظہار کیا۔ انہیں پنشن اور دوسری مراعات دینے کا فیصلہ کیا۔

ان ابتدائی چار بٹالینوں کے بعد پانچویں بٹالین راولپنڈی میں قائم کی گئی۔ اسے راولپنڈی بٹالین کا نام دیا گیا۔ اس کا قیام پنجاب کے الحاق کے بعد عمل میں آیا اس کا

کمیدان پچاس سالہ مصدی مل تھا۔ چھٹی بٹالین لیفٹیننٹ جے ڈبلیو ینگ ہسبنڈ نے کھڑی کی جو بعد میں میجر جنرل ہوا اور پنجاب پولیس کا دوسرا انسپکٹر جنرل۔ اس بٹالین نے فوجی بٹالینوں کے ساتھ مل کر اہم فرائض انجام دیئے۔ اس کا کمیدان سید اکبر علی شاہ تھا جسے انگریز بڑا ذہین اور لائق قرار دیتے ہیں۔ اکبر علی شاہ دس گھوڑ سوار لے کر پہلی افغان جنگ میں انگریزوں کی مدد کو پہنچا۔ پنجاب میں اسے متعدد سرٹیفکیٹ دیئے گئے مگر مالی اعتبار سے اس کی حالت ٹھیک نہ تھی۔ پھر اسے سندھ کے گھوڑ سوار دستے میں صوبیدار بنادیا گیا' ینگ ہسبنڈ نے اسے ترقی دے کر رسالدار بنادیا۔ ینگ ہسبنڈ کی طرف سے میر علی مراد وائی خیر پور سے بات چیت کی ۔ گورنر جنرل کی طرف سے ایک ہزار روپیہ ملا' یہ مختلف جنگوں میں تین بار زخمی ہوا اسے سر چارلس نیپئر کی سفارش پر ایک تمغہ بھی دیا گیا۔

ساتویں بٹالین 1850ء میں امرتسر بٹالین کے نام سے قائم کی تھی اس کا کمیدان دیوا سنگھ تھا۔ آٹھویں بٹالین 1857ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد دہلی متعین کرنے کے لئے کھڑی کی گئی۔ برق اندازوں پر مشتمل نویں بٹالین 1858ء میں قائم کی گئی۔

1860ء میں بچت کی خاطر بٹالینوں کی نفری کم کر دی گئی اور دسویں بٹالین بٹھنڈہ حصار میں بھیجنے کے لئے تیار کی گئی۔ اس کی افرادی قوت کشمیر کے ڈوگر حکمران کے بھائی جواہر سنگھ نے فراہم کی تھی۔ اس کے علاوہ سرحد کی تین پولیس کمپنیاں بھی اس میں شامل کی گئیں۔ مدعا یہ بھی تھا کہ مشکل وقت میں کام آنے والوں کو روزگار فراہم کیا جائے۔

ابتدائی آٹھ سالوں (1857-1849) میں پنجاب (جس میں صوبہ سرحد اور دہلی بھی شامل تھا مگر بہاول پور نہیں) کی نفری یہ تھی۔

کل نفر	8,100
پیادہ	5,400
گھوڑ سوار	2,700

ان میں سے اکثر کی تعیناتی سرحدی امن برقرار رکھنے کے لئے کوہاٹ' بنوں اور ہزارہ میں کی گئی۔ تین بٹالین ڈیرہ جات میں تھیں جو لیہ کی ڈویژن تھیں۔

1853ء میں ایک بٹالین آسنی (ڈیرہ غازی کان) میں تھی' دوسری ڈیرہ اسمٰعیل خان اور ایک بنوں میں۔ ہر بٹالین میں نوسوتیس افراد تھے۔ کپتان کی ماہانہ تنخواہ آٹھ سو

روپے تھی یوں چار کپتانوں کو (38) ہزار چار سو روپے سالانہ ملتے جبکہ باقی سات بٹالینوں کا ماہانہ خرچہ سات لاکھ روپے سے بھی کم تھا۔

ان دنوں پنجاب (بشمول صوبہ سرحد، دہلی) پولیس کی چار ڈویژن تھیں جن کے ہیڈ کوارٹرز لاہور، ملتان، جہلم اور ڈیرہ جات میں تھے۔ 1857ء کی جنگ آزادی شروع ہونے سے پہلے ایک ایک بٹالین لاہور، راولپنڈی، ملتان ور امرتسر میں تھی جبکہ تین ڈیرہ جات میں تھیں۔ 1857ء میں ان پولیس والوں نے انگریزوں سے انتہا درجے کی وفاداری کا مظاہرہ کیا اور سینکڑوں فوجی باغیوں یا مشکوک فوجیوں کو پکڑنے، مقابلے میں مارنے اور آزادی کی جنگ کو ناکام بنانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔

دہلی، سیالکوٹ، لاہور، راولپنڈی، امرتسر، ملتان، کانگڑہ، ساہیوال (منٹگمری) ان سب مقامات پر پولیس کی بٹالینوں نے جنگ آزادی کو ناکام بنانے کے لئے ایسے جوہر دکھائے کہ انگریزوں کو یہ کہنا پڑا کہ اگر پنجاب میں سول پولیس ہنگامی صورت حال میں ہمارا ساتھ نہ دیتی تو خدا جانے ہمارا انجام کیا ہوتا۔ نور پور (کانگڑہ) میں انہی پولیس والوں کی مدد سے باغی فوج سے ہتھیار چھینے گئے اور انہیں قید کیا گیا۔ پھر اسی پولیس کا ایک حصہ دہلی بھیجا گیا جو ساتویں پنجاب انفنٹری کا حصہ بنا۔ دہلی پر اسی پولیس کی مدد سے قبضہ کیا گیا۔ جھجر کو سر کیا گیا۔ ساہیوال میں احمد خان کھرل کو ناکام کیا۔ نور پور کے راجے ناکام بنائے۔ ملتان میں فوج کے 1,322 سپاہیوں نے بغاوت کی تو انہیں پولیس کی تھرڈ بٹالین نے قابو کیا اور ان میں سے 719 سپاہیوں کو قابو بھی کر لیا۔ اسی طرح قبائلی علاقے میں اسی پولیس نے مجاہدوں کی راہ میں دیواریں کھڑی کر دیں۔

پنجاب کے الحاق کے بعد کھڑی کی گئی پولیس دراصل ملٹری پولیس کا ہی ایک طرح کا حصہ تھی یعنی پولیس نے بنیادی طور پر فوج کی کوکھ سے جنم لیا جیسا کہ سندھ میں سر چارلس نیپیئر نے 1842ء میں کیا۔ پنجاب کی صورت حال تاریخی اعتبار سے تھوڑی سی مختلف ہے۔ انگریزوں نے مغلوں کی بے اثر حکومت کے بعد ہر چند بہادر شاہ ظفر کو وظیفہ خور بادشاہ سمجھا لیکن عملاً ان کی حکومت 1844ء سے بہت پہلے لدھیانے کی حدود (دریائے ستلج) تک آ چکی تھی سکھوں سے ان کی لڑائی اسی دریائے ستلج کے آس پاس ہوئی۔ لدھیانہ کے پاس انگریز اپنی مرضی سے ادارے قائم کرتا اور حکومت کے ڈھانچے یا نقشے ترتیب دیتا

تھا۔ ہر چند اس نے الگ سے پولیس کا محکمہ تو نہیں بنایا کہ بے شمار کام (مثلاً خفیہ امور مخبری) اسے اپنے سول ملازمین یا مخبروں سے کرانے پڑتے تھے۔ یوں اندرون خانہ ایک پولیس نما ادارہ بن چکا تھا۔ دوسری طرف ایک اہم بات یہ بھی تھی کہ پنجاب میں بہت سی مقامی ریاستیں بھی تھیں جو مغلوں سے مکمل طور پر آزاد ہو چکی تھیں ان میں مسلمانوں کی ریاستیں بہاول پور' مالیر کوٹلہ اور لوہارو تھیں جبکہ سکھوں اور غیر مسلموں کی ریاستوں میں پٹیالہ' نابھہ' جنید' فرید کوٹ وغیرہ قریباً اٹھارہ کے قریب علاقے شامل تھے ان ریاستوں میں فوج اور پولیس کا اپنا اپنا ڈھانچہ تھا جو یقیناً زیادہ تر مغل طریق کا چربہ ہی تھا۔

جہاں تک بہاول پور والوں کا تعلق ہے وہ انیسویں صدی کے شروع میں ہی فرنگیوں کے گوشہ عاطفت میں چلے گئے تھے۔ انہوں نے انگریز سے معاہدے کر لئے تھے چنانچہ جب ملتان کے نواب مظفر خان کو مزید ٹیکس ادا نہ کرنے کے الزام میں سکھوں نے ہٹانے کا فیصلہ کیا اور مظفر خان نے لڑنے کا تہیہ کر لیا تو بہاول پور کے نوابین اس لئے مظفر خان کی مدد کو نہیں پہنچے کہ اس طرح ان کے انگرزوں سے معاہدہ کی خلاف ورزی ہوتی تھی۔ دوسرے وہ خود رنجیت سنگھ سے بہت خائف تھے جسے جنوبی پنجاب میں آہستہ آہستہ سبقت حاصل ہو رہی تھی اور معروف با اثر قبائل لغاری وغیرہ اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ مالیر کوٹلہ' ہوہارو یا کنج پورہ زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھیں۔ البتہ سکھ ریاستیں اہم تھیں اور یہ اتفاق کی بات ہے کہ یہ تمام ریاستیں اگرچہ لاہور کی سکھ ریاست کے طفیل پیدا ہوئی تھیں مگر سبھی کی سبھی لاہور کی مخالف تھیں۔ اس لئے 1844ء سے پہلے بھی ان کی ہمدردیاں انگریزوں کے ساتھ تھیں جو لدھیانہ میں ڈیرہ جمائے بیٹھے تھے اور منتظر تھے کہ کب رنجیت سنگھ کی آنکھیں بند ہوں اور وہ اپنے اور روس کے درمیان سارے علاقے پر قابض ہو جائیں۔ ہر طور 1844ء تک لدھیانہ فیروز پور اور اس سے آگے (دہلی کی طرف) کے علاقے میں انگریزوں کے وفادار پیدا ہو چکے تھے اس لئے اس علاقے سے محکمہ مال' محکمہ پولیس اور محکمہ تعلیم میں خاصی بھرتیاں ہوئیں۔

انگریز جب آیا تو ظاہر ہے کہ وہ اسی عملے اور فوج کے ساتھ آیا جس میں پنجابی نہ ہونے کے برابر تھے اور اصلاً بنگال' یوپی' سی پی' مدراس وغیرہ کے لوگ تھے۔ الحاق کے بعد وہ صرف انہی کی مدد سے پنجاب پر حکومت کر سکتے تھے۔ چنانچہ 1857ء میں پنجابیوں

خصوصاً سکھوں کی طرف سے انگریزوں کے ساتھ تعاون کی ایک وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ پنجابی، انگریزوں کے غیر پنجابی افسروں اور اہل کاروں کو پسند نہیں کرتے تھے اور وہ بھی انگریز کی سخت پالیسی کی نمائندگی کرتے ہوئے مقامی لوگوں کو کچھ ڈھیل دینے یا ان سے نرمی برتنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ ایک تیسرا فرق یہ بھی تھا کہ انگریزوں کے ساتھ آنے والے صرف ہندو اور مسلمان تھے، جبکہ پنجاب میں انہیں ایک تیسری مذہبی طاقت سے بھی واسطہ پڑا جو اس علاقے میں اقلیت کے باوجود مسلمانوں اور ہندوؤں پر حکمرانی کرتی تھی۔ یہ ایک بالکل نئی صورت حال تھی جو انگریزوں کو پورے ہندوستان کے کسی اور صوبے میں پیش نہیں آئی۔ بہرطور 1857ء سے پہلے انگریز کے محکمہ مال، فوج وغیرہ کی افرادی قوت سے ہٹ کر پولیس کے شعبہ میں دیکھا جائے تو اکرام علی ملک کی مرتب کردہ کتاب (A Book of Reading on the History of Punjab 1794-1947) میں میونٹی رپورٹوں اور رابرٹ منٹگمری کے نام کمشنروں اور سپرنٹنڈنٹ کے خطوط کے حوالے سے بتایا گیا ہے کہ "حال ہی میں فتح کئے گئے پنجاب پر زیادہ تر ہندوستانی عساکر کے ذریعے تسلط قائم کیا گیا اور قانون کی عملداری اور مالیہ کی وصولی کا کام بھی زیادہ تر ہندوستانی حکام کی مدد سے کیا جاتا ہے۔"
صفحہ 203

لاہور ڈویژن میں	کل اسامیاں	ہندوستانی	پنجابی
ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر	6	5	1
تحصیلدار	38	19	19
کوتوال/تھانیدار	140	47	93
تھانہ محروں کا تناسب	3	1	2

جب کسی حکومت کو لوگ تسلیم کر لیتے ہیں تو پھر اس میں اپنا حصہ بھی دینا اور لینا چاہتے ہیں۔ فوج کے بعد سب سے اہم محکمہ پولیس کا ہوتا ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ قیام پاکستان سے پہلے بھی سبھی صوبوں میں یہ سوال کی جاتا تھا کہ کون کون سے محکمے میں کس کس مذہب اور کس کس علاقے حتیٰ کہ کس کس ذات کے کتنے افسر یا ماتحت ملازم ہیں اور آبادی کے اعتبار سے کیا ان کی نمائندگی صحیح ہے یا نہیں۔ چنانچہ (متزکرہ بالا کتاب صفحہ نمبر 355) کے مطابق ہندو مہاسبھا نے وائسرائے کو ایک یاد داشت

پیش کی جس میں شکوہ کیا گیا کہ پنجاب پولیس میں غیر مسلموں کو آبادی کے اعتبار سے کم نمائندگی دی گئی ہے جبکہ مسلمانوں کو زیادہ عہدے دیئے گئے ہیں۔ جو اعداد و شمار پیش کئے گئے وہ یوں ہیں مسلمانوں کی آبادی 56 غیر مسلموں کی 44 فی صد

عہدہ	مسلمان	غیر مسلم ''ہندو سکھ'
ڈی ایس پی	11	2
انسپکٹر	59	38
سب انسپکٹر	408	231 سکھ

مہاسبھانے یہ اعداد و شمار یک طرفہ طور پر مرتب کئے۔ جہاں ضروری سمجھا گیا وہاں سکھوں کو ڈال دیا گیا ہے اور جہاں غیر ضروری سمجھا وہاں ان کی تعداد نہیں بتائی۔ پیسہ اخبار 8 نومبر 1909ء میں اسی موضوع پر لکھا گیا۔ ''یکم جنوری 1909ء کو پنجاب پولیس میں 15529 کانسٹیبل تھے جن میں سے 65 فی صد مسلمان تھے۔ اٹھائیس فی صد ہندو اور سات فی صد سکھ۔ یہ تناسب ہیڈ کانسٹیبلوں' سب انسپکٹروں اور انسپکٹروں کے درجے کی آسامیوں کے معیار کے طور پر اختیار کیا جائے تو یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ مسلمان اپنے واجب حصے ہیڈ کانسٹیبلوں' سب انسپکٹروں اور انسپکٹروں میں بقدر ایک سو بانوے' نواسی اور پچپن کے کم ہیں اور اگر سب انسپکٹروں اور انسپکٹری کے درجوں میں ان اسامیوں کی تعداد کو دیکھا جائے جن کا تقرر پولیس کمیشن کی اصلاحوں سے متعلق پالیسی کے باعث کیا گیا ہے تو یہ معلوم ہو جائے گا کہ مسلمانوں کو اس سے کم اسامیاں دی گئی ہیں جتنی اسامیوں کے وہ اس صوبہ میں اپنی آبادی کے تناسب کے اعتبار سے حق دار ہونے چاہیئے تھے۔

1947ء میں پنجاب کے شعبہ سی آئی ڈی میں ملازمتوں کا مسلم اور غیر مسلم تناسب یہ تھا:

عہدہ	غیر مسلم	مسلم	مسلمانوں کا فی صد حصہ
ایس پی	7	1	13%
ڈی ایس پی	8	3	38%
انسپکٹر	13	7	35%

سب انسپکٹر	32	21	40%
اے ایس آئی	30	16	36%

(تحریک آزادی تے پاکستان---- پنجاب دا حصہ صفحہ 54۔53)

یہ معامہ تو خیر ہندو اور مسلم کے درمیان تھا۔ قیام پاکستان کے بعد پولیس کی اہمیت اور ملازمتوں کے لئے جائز سے زیادہ کی خواہشیں ہر علاقے اور ہر قومیت نے کیں اور اس ضمن میں بعض بنیادی اصولوں تک کو نظر انداز کر دیا گیا۔ 17 اپریل 1949ء کے نوائے وقت میں ایک خبر چھپی جس کی سرخی تھی ''کراچی کے محکمہ پولیس میں پنجابیوں کی حق تلفی'' کراچی کے محکمہ پولیس کے کچھ اعداد و شمار معلوم ہوئے جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کراچی پولیس میں پنجاب کو کس قدر افسوس ناک حد تک نمائندگی سے محروم رکھا گیا ہے۔ پنجابی پولیس افسر ہر لحاظ سے بہتر تسلیم کی جا چکا ہے مگر نہ معلوم کراچی کا محکمہ پولیس پنجابیوں کے لئے کیوں ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ موجودہ اعداد و شمار یہ ہیں :

عہدہ	کل تعداد	پنجابی	یوپی	دوسرے غیر پنجابی
آئی جی	1	x	1	x
ایس پی	3	x	x	3
ایس ڈی اوکرائمز	2	x	1	1
ڈی ایس پی ٹریفک	1	x	x	1
انسپکٹر	12	x	4	8
سب انسپکٹر	55	x	24	31
اسٹنٹ سب انسپکٹرز	37	x	22	15

سی۔ آئی۔ ڈی

سپرنٹنڈنٹ	1	x	1	x
ڈی ایس پی	2	x	x	x2
انسپکٹرز	11	x	2	x
سب انسپکٹرز	33	x	30	3

اے ایس آئی	21	x	21	x
ہیڈ کانسٹیبلز	112	x	98	14
کانسٹیبلز	155	x	140	15

معاملہ یہیں نہیں رکتا۔'' نوائے وقت'' نے یہ بھی لکھا کہ'' یوپی سے آمدہ پولیس افسروں سے ترجیحی سلوک کیا جاتا ہے چنانچہ حال ہی میں یوپی سے آنے والے کئی افسروں کو ترقی دی گئی ہے اور ملازمتوں پر مستقل کر دیا گیا ہے اس کے برعکس دوسرے سینئر افسروں کو قابل توجہ نہیں سمجھا گیا۔ یہ اطلاع موجب دلچسپی ہوگی کہ کراچی کے موجودہ ایڈمنسٹریٹر ہاشم رضا یوپی کے رہنے والے ہیں۔ ان کے حقیقی بھائی کاظم رضا آئی جی پولیس ہیں اور دوسرے بھائی آل رضا اسسٹنٹ پبلک پراسیکیوٹر ہیں۔ محکمہ پولیس کی نمائندگی نہ ہونے کی وجہ سے کراچی میں مقیم پنجابی عوام سے ذلت آمیز سلوک کیا جاتا ہے۔ چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ حال ہی میں 300 پنجابیوں کو بمبئی پولیس ایکٹ کے تحت غنڈے قرار دے کر کراچی سے باہر نکال دیا گیا ہے۔'' (پاکستان کی سیاسی تاریخ پنجابی مہاجر تضاد صفحہ 163۔161۔

انگریزوں کی آمد

پولیس کے شعبے کی اہمیت کل بھی ایک خاص نوعیت کی تھی اور آج بھی ہے۔
پنجاب کے برطانوی ہندوستان سے الحاق کے موقع پر پولیس کے ذمے یہ فرائض لگائے گئے۔ جرائم کی روک تھام اور سراغ رسانی سڑکوں' دریائی پلوں کی حفاظت نوٹسوں کی تعمیل' قیدیوں کی نگرانی فوج کے لئے ضروریات کی فراہمی اور مسافروں کے لئے کشتیوں کی فراہمی۔

الحاق کے بعد پنجاب کو انتظامی اعتبار سے پانچ ڈویژنوں اور سترہ اضلاع میں تقسیم کیا گیا۔ ڈویژنل ہیڈکوارٹر یہ تھے۔ انبالہ' جالندھر' لاہور' راولپنڈی اور ملتان۔

شہروں میں چوکیداری کے لئے مختلف یونٹ بنائے گئے اور ان کی تنخواہوں کے لئے چوکیدارہ ٹیکس لگایا گیا۔ یہ کام بلدیاتی اداروں کے ذریعے کی گیا-- اس طرح ایک قسم کی بلدیاتی پولیس پیدا ہوئی۔ شہروں کو چھوڑ کر دیہی علاقے کو 228 تھانوں میں تقسیم کی گیا۔ ہر تھانے میں ایک انچارج افسر اور اس کے دو معاون ہوتے جبکہ باقی تیس کانسٹیبل وغیرہ تعین کئے جاتے۔ پرانے اور نااہل پولیس والوں کو نکال کر دیہی چوکیداروں میں سے نئی بھرتی کی گئی انہیں ایک سی وردی پہنائی گی۔ اس کے علاوہ ان لوگوں کو بھی بھرتی کیا گیا جو انگریزوں سے پہلے کی افراتفری کے زمانے میں لوگوں کو چوروں' نقب لگانے والوں اور مویشی چوروں کا سراغ لگانے میں مدد دیا کرتے تھے۔ پنجاب میں چھپتر تحصیلیں بنائی گئیں اور تھانے بھی انہی کی حدود کے اندر بنائے گئے۔ تحصیلدار کو پولیس کے معاملات میں مداخلت کا اختیار نہیں دیا گیا مگر کچھ نگرانی اس کے سپرد کی گئی تاکہ تغافل شعار پولیس والوں کو تنبیہ کر سکے اور اگر رشوت خوری چل پڑی ہے تو اسے روکنے کے لئے کارروائی کر سکے۔
تھانوں کے علاوہ چوکیاں بھی قائم کی گئیں پوری پولیس کو ایک اہم فرض یہ دیا گیا کہ وہ سڑکوں اور گزرگاہوں کو محفوظ رکھیں تاکہ لوگ آسانی کے ساتھ اور چوراچکوں کے خوف کے بغیر ملک کے اندر سفر کر سکیں۔

پولیس کا ایک شعبہ ٹھگی کی وارداتیں روکنے کے لئے لدھیانہ میں قائم کیا گیا تھا۔ لیکن 1853ء میں اسے بند کر دیا گیا۔ ٹھگ دراصل اس زمانے میں پیدا ہوئے اور سامنے آئے اور بھیانک خونی وارداتوں کے مرتکب ہوئے جب ایک طرف مغل اور دوسری طرف سکھ حکومت کے زوال میں افراتفری مچ گئی۔ یہ فضا ٹھگوں' چوروں اور بٹ ماروں کے لئے بڑی زرخیز ثابت ہوئی اور پورے علاقے میں ٹھگوں کے گروپوں نے شاہراہوں پر گویا قبضہ کر لیا۔ یہ لوگ اکا دکا آدمی کو تو لوٹتے ہی تھے مقصود ان کا بڑی بڑی وارداتیں ہوتا۔ یہ مختلف نوع کے روپ بھرتے اور کسی قافلے میں شامل ہو جاتے۔ گفتگو اور طرز تپاک کے باعث قافلے والوں کے دل جیت لیتے پھر اندر کی خبر لگا لیتے کہ کیا مال ہے اور کہاں کہاں ہے۔ کئی دن ساتھ رہنے کے بعد جب واردات کے لئے راہ ہموار ہو جاتی تب یہ ٹھگ اپنے گروپ کے باقی لوگوں کو بھی اشارہ دیتا اور کسی منزل پر سارا قافلہ نہ صرف لٹ جاتا بلکہ ان ٹھگوں کے ہاتھوں زندگی کی بازی بھی ہار جاتا۔ ٹھگی روکنے کے لئے یہ شعبہ لاہور یا پنجاب کے الحاق سے پہلے میجر سلیمن کی سربراہی میں گورنر جنرل نے قائم کیا تھا۔ اس محکمہ نے چھ برس (37-1831) کی مدت میں کوئی تین ہزار ٹھگوں کا بندوبست کیا۔ کہا جاتا ہے کہ ٹھگوں کا روبار اتنا بار آور تھا کہ سرکاری دفتروں کے چپڑاسی اور معمولی ملازم بھی کئی کئی دن کی چھٹی لے جاتے اور بعد میں پتہ چلتا کہ وہ اس عرصہ میں ٹھگوں کے ساتھ مل کر مال بنا رہے تھے۔ ان کی شقاوت کا یہ عالم تھا کہ صرف ایک ٹھگ نے اقبال جرم کیا کہ وہ 719۔ افراد کے قتل میں شریک تھا۔ ہر چند ٹھگی کا اصل مرکز وسطی ہندوستان تھا مگر یہ وبا ستلج پار کے پنجاب میں بھی بڑی شدت کے ساتھ آ پہنچی تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جو ٹھگ ستلج پار سے لے کر وسطی ہندوستان تک پھیلے ہوئے تھے وہ واردات سے بچنے کے لئے ان علاقوں میں پناہ لیتے تھے جو اس وقت انگریز کے زیر اختیار نہ تھے۔ یہاں انگریز ان کا تعاقب نہ کر سکتا جبکہ ٹھگ بھی ان جائے پناہ قسم کے علاقوں میں ایسی کوئی کارروائی نہ کرتے جن سے مقامی لوگ ان کے خلاف ہو جاتے۔

اسی زمانے میں پنجاب کی حکومت کو مرکز کی طرف سے ہدائت موصول ہوئی کہ جس طرح دوسرے صوبوں میں پولیس کی کچھ ذمہ داریاں زمیندار پوری کرتے ہیں' پنجاب میں اسی طریق کار کے تحت لمبردار' ذیل دار' اور سفید پوش طبقہ پیدا کیا جائے جو آج تک

کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔

یہ تو نہیں کیا جاسکتا کہ جب انگریز دوسرے صوبوں میں آئے تھے تو وہاں کوئی زیادہ امن وامان کی کیفیت پائی جاتی تھی لیکن یہ ضرور ہے کہ ان علاقوں میں انگریز تاجروں کی صورت میں آئے حاکموں اور فاتحین کی شکل میں نہیں آئے۔ یہ عزاز انہیں سندھ پنجاب سرحد اور کشمیر میں حاصل ہوا جہاں ان کے آنے سے پہلے ایک عجیب افراتفری مچی ہوئی تھی خصوصاً 1839ء میں رنجیت سنگھ کے انتقال کے بعد سکھوں میں بے پناہ ابتری پھیل چکی تھی۔ پنجاب خود درجنوں ٹکڑوں میں تقسیم تھا اور بے شمار قبائل آزادانہ حیثیت سے ابھر رہے تھے۔ چوبیس کے قریب تو اس کی ریاستیں تھیں چنانچہ اس خوفناک فضا میں انگریز آیا جس سے باقی ہندوستان کو کم وبیش سوڈیڑھ سو سال سے واسطہ پڑا ہوا تھا۔ یہاں مقامی حالات کے پیش نظر مختلف وجوہ کی بنا پر انگریزوں کو بڑا تعاون حاصل ہوا۔ یہاں لڑائی تین مذہبی فریقوں میں تھی۔ جب انگریز آیا تو ہر فریق کے نزدیک وہ اس کا نجات دہندہ تھا۔ خصوصاً مسلمانوں کو سکھوں اور غیر مسلموں سے نجات کا احساس ہوا۔ خود سکھوں کو بھی خیال گزرا کہ ان کی حکومت تو اندرونی خلفشار کے باعث جارہی تھی ایسی صورت میں ممکن ہے ان کے زخم خوردہ لوگ انتقام لینے کے لئے اکھٹے ہوکر ان پر پل پڑیں۔ چنانچہ خود سکھ بھی انگریز کو خوش آمدید کہنے میں لگ گئے اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ ستلج پار کے سکھ راجوں مہاراجوں کی ہمدردیاں اور عملی مدد بھی انگریزوں کے ساتھ تھی یہ وجہ بھی سکھوں کو انگریزوں کے قریب لے آئی اور جب جی دار سکھ 1849ء میں اپنی آخری لڑائی ہار گئے تو پھر ان کے لئے انگریز سے تعاون کے سوا اور کوئی راستہ نہ تھا۔ تا آنکہ 1857ء میں پنجاب کی سکھ ریاستیں اور تقریباً ساری ہی سکھ قوم مسلمان مغلوں کے زوال اور آخری شکست میں اپنا کردار ادا کرنے کے لئے سر بسر تیار تھی۔ مغلوں کے خلاف کوئی بھی جنگ ان کی مقدس جنگ بن گئی کیونکہ ان کے گورو صاحبان کو زیادہ دکھ مغل بادشاہوں (جہانگیر سے لے کر شاہ عالم تک) سے ہی پہنچے تھے۔ دوسری طرف جن مسلمان قبائل کی سکھوں سے لڑائی تھی یا جو سکھوں کی ماتحتی میں آگئے تھے انہیں بھی انگریزوں کی آمد بھلی لگی۔ ہندو پیشے اور طرز حیات کے اعتبار سے انتہائی پر امن حالات چاہتا ہے جس میں پیسے کا کاروبار عام اور بالکل محفوظ ہو چنانچہ اسے بھی امن کو ضرورت بھی وہ بھی داروگیر زمانہ میں کاروبار کی بڑی مار کھا چکا تھا۔

اس لئے اس نے بھی انگریزوں کا ساتھ سینے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی۔ یوں نظم ونسق اور امن و امان تیزی سے بحال ہونے لگا۔

پنجاب میں پولیس کی ابتدائی فورس اگرچہ زیادہ منظّم یا تربیت یافتہ نہ تھی مگر انگریزوں کی نظر میں (رپورٹ 51۔1849) پولیس کی صرف چودہ ہزار نفری نے ہمالیہ سے لے کر سندھ کی سرحدوں تک بے مثال کارکردگی کا مظاہرہ کیا حالانکہ اس زمانے میں سکھ فوج کو توڑ دیا گیا تھا جس کے پچاس ہزار سپاہی اور افسر بے روزگار ہو کر اپنے علاقوں میں چلے گئے تھے۔ با اثر لوگوں میں پرانے اداروں کی جگہ نئے ادارے بنانا مستحسن نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ایک طبقے میں کامیاب حملہ آوروں سے ابھی انتقام لینے کا جذبہ سلگ رہا تھا۔ ڈاکوؤں، چوروں کے تمام گروہ بے اثر بنا دیئے گئے تھے۔ ان کے رنگ لیڈر قابو کر لئے گئے تھے۔ فوجداری جرائم میں غیر معمولی کمی آ گئی تھی۔ اس رپورٹ میں یہ دعوےٰ بھی کیا گیا کہ جس قدر بے مثال امن و امان حال ہی میں مغلوب کئے گئے علاقوں (پنجاب، سرحد) میں ہو گیا ہے اس کی مثال ہندوستان کا کوئی اور صوبہ نہیں دے سکتا اور دو سال بعد لارنس نے پنجاب ایڈمنسٹریشن رپورٹ میں کہا کہ ''پولیس کی اعلیٰ کارکردگی کے حوالے سے ہندوستان کا کوئی صوبہ پنجاب کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔''

یہ صورتِ حال تھی جب دوسرے صوبوں میں پولیس کی ناقص کارکردگی کے بارے میں حکمرانوں نے زیادہ توجہ دینی شروع کی۔ 1858ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو حکمرانی کے اختیار سے سبکدوش کر دیا گیا اور برطانوی حکومت نے براہِ راست برصغیر کی حکومت سنبھال لی۔ اس کے بعد کلکتہ اور مدراس کی پولیس کے بارے میں دو ایکٹ منظور کئے گئے جن کے بارے میں عام خیال تھا کہ مدراس والا ایکٹ مثالی ہے اور دوسرے صوبے بھی اسے اختیار کر لیں گے۔ اگست 1860ء میں ایک کمیشن بنایا گیا جس کا سربراہ بنگال سول سروس کے ایم ایچ کورٹ کو بنایا گیا۔ اور پنجاب کی طرف سے نمائندگی مدراس سول سروس کے ڈبلیو۔ رابنسن نے کی۔ کمیشن کی شرائط کار یہ تھیں:

1- معلوم کرے کہ کس طور فوج کو سول کاموں سے مکمل طور پر ہٹا لیا جائے۔

2- پولیس پر اٹھنے والے اخراجات کا جائزہ لے کہ کس طرح اخراجات کم کئے جا سکتے ہیں۔

3- پولیس کو فوجی طرز پر ہی تربیت دی جائے اور منظم کیا جائے مگر اسے کوئی فوجی کام نہ دیا جائے۔

4- اسے کسی قسم کے عدالتی اختیارات نہ دیئے جائیں خود اس پر انتظامیہ کا براہِ راست کنٹرول ہو۔

5- اس کی تنظیم وحدانی قسم کی ہو۔

اسی زمانے میں کمشنر رچرڈ ٹمپل نے پولیس کی کارکردگی بہتر بنانے' بہتر تنظیم اور اخراجات کم کرنے کے لئے ایک رپورٹ تیار کی۔ لاہور ڈویژن کے کمشنر نے جو سپرنٹنڈنٹ پولیس کی حیثیت بھی رکھتا تھا اسی تجویز پر مزید کام کیا اور 1860ء میں اپنی سفارشات' پنجاب میں پولیس کے انچارج جوڈیشن کمشنر کو بھیج دیں۔ ایک سفارش یہ تھی کہ ہر ضلع میں ایک لفٹین مقرر کیا جائے' نگرانی کے لئے ڈویژنل سطح پر انسپکٹر ہوں اور یہ سب یورپی ہوں۔ اس نے یہ بھی تجویز دی کہ شہروں میں بھی پولیس سپرنٹنڈنٹ اور ان کے ساتھ انسپکٹر مقرر کئے جائیں۔ اتفاق کی بات کہ اسی زمانے میں مرکزی حکومت نے کہا کہ ملٹری پولیس میں تخفیف کی جائے اور پنجاب میں اودھ کی طرز پر پولیس کی تنظیم نو کی جائے۔ اودھ پولیس کی تنظیم سر رابرٹ منٹگمری نے کی تھی اس لئے منٹگمری کی خدمات بھی پنجاب کو پیش کی گئیں۔ پنجاب کا لیفٹیننٹ گورنر تنظیم نو کے توحق میں تھا مگر اودھ کی طرز پر تنظیم سے ڈرتا تھا کیونکہ اس نے کئی افسروں سے اودھ پولیس کے نقائص کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ اتفاق کی بات کہ پنجاب اور اودھ والوں کے مجوزہ طریق کار کو ایک دوسرے میں مدغم کر دیا۔ یہ نئی تجاویز دو حصوں میں تھیں۔ پہلا دیہی علاقوں کے بارے میں اور دوسرا شہروں سے متعلق۔

دیہی علاقوں کے لئے تجویز یہ تھی کہ ہر ضلع میں ایک یورپی پولیس لفٹین مقرر کیا جائے جو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا اسسٹنٹ ہو اور اس کا مخصوص کام صرف یہ ہو کہ وہ پولیس کی تربیت' ڈسپلن اور عام کارگزاری کی نگرانی کرے۔ اس کے اوپر ڈویژن کی سطح پر ایک کپتان ہو جسے براہ راست کمشنر اور لیفٹیننٹ گورنر کے ملٹری سیکرٹری سے رابطے کا اختیار حاصل ہو۔ ملیشیا اور ملٹری پولیس کو بھی سول پولیس کا حصہ بنا لیا جائے۔

نظم وضبط کی خلاف ورزی کی سزائیں یہ تھیں۔ ایک ماہ کی تنخواہ کے برابر جرمانہ

کوارٹر یا پولیس لائن میں سات دن کی قید اور بیس دن ک زائد ڈرل یا پیریڈ۔ ان کے علاوہ نوکری سے برطرفی بھی ان سزاؤں میں شامل تھی۔ برطرفی کا اختیار حکومت کو تھا۔ منصوبہ یہ تھا کہ پولیس چوکیوں میں نفری کم کردی جائے' گھوڑ سوار بھی ہٹا دیے جائیں اور جاسوس اور کھوجی زیادہ تعداد میں پولیس میں شامل کئے جائیں۔ معروف اور معزز زمینداروں کو جرائم کے بارے میں رپوٹ کرنے کی ذمہ داری دی گئی۔ مجموعی طور پر یہ سکیم فوراً قبول کرلی گئی اور جون 1860ء میں لاہور میں اس پر عمل بھی شروع ہوگیا۔ ایک یورپی سپرنٹنڈنٹ بنایا گیا۔ اس کے نیچے اودھ پولیس کی طرز پر کوتوال تھانیدار محرر جمعدار' کانسٹیبل' کھوجی' اردلی اور چوکیدار رکھے گئے۔ شہر کو مختلف حلقوں' ذیلی حلقوں وغیرہ میں تقسیم کیا گیا۔ یورپی انسپکٹر کا دفتر انارکلی میں قائم ہوا اور علاقوں میں متعین کئے گئے سپاہیوں کے اخراجات میونسپل کمیٹی پر ڈال دیے گئے۔ سکیم کے نتائج اچھے نکلے چنانچہ اس کی توسیع امرتسر تک کر دی گئی۔ پنجاب کے الحاق کے بعد جب سے صوبائی سطح پر پولیس کا محکمہ قائم کیا گیا تھا تب سے پہلی بار یہ اصلاح کی گئی تھی۔

دریں اثنا کورٹ کمیشن نے اپنی کارروائی شروع کردی اور کورٹ کمیشن جس طور پولیس اصلاحات چاہتا تھا پنجاب والوں نے اس کو صدق دل سے قبول کیا اور جیسے جیسے نئے خیالات سامنے لائے جاتے پنجاب والے خوش دلی سے ان پر عمل کرنے کے لئے ہر وقت تیار ہوتے۔ ضلع لاہور' امرتسر اور ایک آدھ دسرے ضلع کی ملٹری پولیس کو کانسٹیبلری میں تبدیل کر دیا گیا۔ دوسرے کمشنروں سے بھی ایسا ہی کرنے کے لئے کہا گیا انہوں نے بھی تیزی کے ساتھ نئی تنظیم شروع کر دی۔ پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر نے ڈیرہ جات کے علاقوں کو چھوڑ کر باقی جگہوں پر تقرریاں بھی شروع کر دیں۔ فروری 1861ء میں جو تقرریاں کی گئیں وہ یہ تھیں ایک انسپکٹر جنرل' اس کے چار ڈپٹی' سترہ ایس پی اور گیارہ اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس۔

پنجاب پولیس کا پہلا انسپکٹر جنرل' گورنر کا ملٹری سیکرٹری جارج ہچنسن کو بنایا گیا۔ تاہم انگریز افسروں کو کہا گیا کہ وہ پولیس کی تنظیم نو میں جارج کا ہاتھ بٹائیں۔ ینگ ہسبینڈ کو جو پنجاب میں ایک پولیس بٹالین کا سربراہ رہ چکا تھا اور کچھ عرصہ بمبئی انفنٹری میں بھی رہا' انبالہ کا ڈپٹی انسپکٹر جنرل بنایا گیا اس کا ہیڈ کوارٹر کمشنر کے ساتھ کسولی میں تھا۔ اس کا

علاقہ مندرجہ ذیل اضلاع پر مشتمل تھا انبالہ' تھانیسر' لدھیانہ' شملہ' فیروز پور' دہلی' گوڑ گاؤں' حصار اور رہتک۔ لاہور کا انسپکٹر جنرل کیپٹن (بعد میں میجر جنرل بنا) جی۔ میک انڈریوز کو بنا گیا۔ علاقہ سرسہ۔ راولپنڈی میں کیپٹن این ایچ ملر کو ڈپٹی انسپکٹر جنرل بنایا گیا۔ اس کا علاقہ دو ڈویژنوں میں پنڈی اور پشاور کے علاقہ ضلع سیالکوٹ' گوجرانوالہ وغیرہ تک پھیلا ہوا تھا۔ ملتان ڈویژن میں کیپٹن آر۔ این۔ ٹی ٹرانسن کو لگایا گیا۔ علاقے میں ملتان' مظفر گڑھ جھنگ' گوگیرہ' (موجودہ ساہیوال اوکاڑہ کمالیہ اور پاک پتن) اور ڈیرہ جات کے کچھ حصے شامل تھے۔

جب پنجاب میں یہ انتظام ہو چکا تب 1861ء میں معروف ایکٹ منظور ہوا۔ حکومت پنجاب کو ایکٹ بھیجا گیا۔ پنجاب میں تقریباً پہلے ہی تنظیم ایسی تھی۔ تھوڑی سی تبدیلی کرنا پڑی' انسپکٹروں' ڈپٹی انسپکٹروں' سارجنٹوں اور کانسٹیبلوں کو نئے گریڈ دیئے گئے۔ شہر کے چوکیداروں کو بھی پولیس میں ضم کر لیا گیا۔ ہر شخص کے شعبے کی نشان ہی کر دی گئی اور تحصیلوں میں ڈپٹی انسپکٹر بھی مقرر کیے گئے۔ پولیس کے فرائض میں کچھ اضافہ بھی ہوا ان میں ایک یہ تھا کہ ان نوجوانوں کو جو لڑکیوں کو فریب دے کر قحبہ خانے میں لاتے ہیں' روکا جائے۔ قحبہ خانوں کے مکینوں کے نام پتے اور دوسری تفصیلات درج رجسٹر کی جائیں اور ان کا بار بار معائنہ کیا جائے اس کے علاوہ دوسرے محکموں کو عوضانے پر پولیس کی خدمات فراہم کی جائیں۔

نئے انتظامات کے تحت شروع میں بنائی گئیں پولیس بٹالینیں توڑ دی گئیں' کوئی آٹھ نو سو کے قریب نفری فالتو نکلی انہیں دو ماہ کی تنخواہ دے کر فارغ کر دیا گیا۔ ان کے اعلیٰ افسروں یعنی کمیدانوں میں سے کچھ کو اراضی دی گئی مثلاً دیوا سنگھ کو چوبیس مربعے' ایڈجوٹنٹ الارڈ کو آٹھ مربعے اور جمعدار شیر سنگھ کو سوا مربعہ دیا گیا۔ یہ زرعی رقبہ ضلع لاہور اور امرتسر میں دیا گیا۔ اس زمانے میں پولیس کا بجٹ نو لاکھ پندرہ ہزار تھا۔

پولیس کی تنظیم نو کے زمانے میں ٹھگی کی وارداتیں پھر بڑھنے لگیں تو پولیس نے 1852ء میں بند کیے جانے والے محکمے کو بحال کر دیا۔ اس کا مجموعی انچارج لاہور کا ڈپٹی انسپکٹر جنرل تھا جو اپنے ایک افسر کے ذریعے یہ شعبہ چلاتا تھا جس کے تحت ایک صنعتی سکول کھولا گیا جہاں سلطانی گواہ بننے والے ٹھگوں کو تربیت دی جاتی تھی' انہی سلطان گواہوں کی

مدد سے صوبے میں ٹھگوں کو پکڑا گیا اور پھر ایک سال کے اندر الگ برانچ کا خاتمہ کر کے یہ کام بھی ضلعی پولیس کے سپرد کر دیا گیا۔ صنعتی سکول جیل والوں کو دے دیا گیا۔

پنجاب کے الحاق کے بعد پشاور ڈویژن میں پولیس کے فرائض ڈیرہ جات ڈیرہ غازی خان، ڈیرہ اسمٰعیل خان، بنوں، کوہاٹ میں مقیم پولیس بٹالین کرتی تھیں۔ تنظیم نو پر یہاں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی کیونکہ حکام کی نظر میں یہاں کے قبائلی حالات کے پیش نظر پہلے والا طریق ہی موثر تھا۔ نئی اصلاحات قبائلی علاقوں کے قریب والی پولیس کے لئے مناسب تصور نہیں کی گئیں۔ یہاں کا محل وقوع، امین کی کیفیت مقامی قوانین اور رسوم، مقامی موروثی انتقامی قتل، مقامی قوانین، پھر آزاد قبائلی علاقہ اور اس کے بعد افغانستان، جس سے اکثر تعلقات کشیدہ رہا کرتے تھے اس کی بنا پر یہ تصور کیا گیا کہ اصلاح شدہ نئی سول پولیس اس علاقے کے لئے موزوں نہیں رہے گی چنانچہ پرانی پولیس بٹالین والی تنظیم ہی بحال رکھی گئی۔ سول انتظامیہ بھی قبائلی علاقہ میں مختلف تھی وہاں کمشنر یا ڈپٹی کمشنر نہیں ہوا کرتے تھے بلکہ پولیٹیکل ایجنٹ ہوتے تھے۔ (اب بھی ہیں) یہ ایجنسیاں مالاکنڈ، خیبر، کرم، مہمند اور شمالی اور جنوبی وزیرستان کہلاتی ہیں۔ یہاں سکاؤٹ اور ملیشیا کی تنظیمیں ہیں۔ جن کے سربراہ فوج کے تربیت یافتہ افسر ہوتے ہیں۔ یہ سکاؤٹ اور ملیشیا ہی پولیس والے فرائض انجام دیتا ہے۔ ان کے علاوہ فرنٹیئر کانسٹیبلری کے نام پر ایک تنظیم سرکاری علاقوں میں موجود ہے جو پولیس افسروں کے ماتحت ہوتی ہے اس کا حد اختیار وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں سکاؤٹوں اور ملیشیا کی حد ختم ہو جاتی ہے۔ فرنٹیئر کانسٹیبلری آزاد یا افغان علاقوں سے آنے والے جرائم پیشہ گروہوں کو پکڑتی ہے اور ادھر سے آزاد علاقے میں پناہ کے لئے جانے والے مجرموں پر بھی نظر رکھتی ہے انہیں روکنے اور گرفتار کرنے کی ذمہ داری کانسٹیبلری پر عائد ہے۔ یہاں ایک اور فورس بھی ہے اسے خاصہ دار کہتے ہیں۔ اس میں قبائلی سرداوں کی سفارش پر قبائلی ملازم رکھے جاتے ہیں۔ ان کا کام سول انتظامیہ (پولیٹیکل ایجنٹوں) کے احکامات پر عمل کرنا ہوتا ہے۔ آمدورفت اور پیغام رسانی کے ذریعوں کی حفاظت اور نگرانی بھی انہی خاصہ داروں کا کام ہے۔

بعد میں اس ڈویژن میں بھی نئی اصلاحات کے مطابق تھوڑی بہت تبدیلیاں کی گئیں۔ حکومت کی طرف سے کہا گیا کہ یا تو تنظیم پولیس والی کی جائے یا پھر یہ ایسی فوجی

فورس ہو جو فوج کے بریگیڈئر جنرل کے ماتحت ہو۔ حکومت نے اسے یوں تبدیل کیا کہ ملٹری فورس ختم کر دی گئی اس کی جگہ فرنٹیر ملیشیا نے لے لی ۔ قبائلی علاقے میں پولیس پر زیادہ اختیار ڈپٹی کمشنر کو حاصل ہوتا ہے اور ایس پی اس کے اسسٹنٹ کی حیثیت رکھتا ہے اس علاقے میں جرائم کی نوعیت' شدت اور زیادتی کے پیش نظر 1872ء میں فرنٹیر کرائم ریگولیشن نافذ کیا گیا جس کے تحت بعض جرائم کی صورت میں قبائلی ناکہ بند کئے جاسکتے ہیں۔ مجرموں کو پناہ دینے پر پورے گاؤں پر اجتماعی جرمانہ کیا جاسکتا ہے۔ جن خاندانوں میں نسل درنسل انتقامی قتل ہو رہے ہوں انہیں رہائش تبدیل کرنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔ زانیہ عورتوں کو قید کیا جاسکتا ہے اور پھر معصوم یا گناہ گار ملزم کو وقبائلی سرداروں کے حوالے کیا جاسکتا ہے کہ وہ ان کے بارے میں کارروائی کریں اور بریت یا تعزیر کا فیصلہ کریں۔ دروں کی نگرانی کا کام قبائل کے سپرد ہوا۔ شادی شدہ خاتون کا اغوا قابل دست اندازی جرم قرار پایا۔ قتل وغیرہ کے سلسلے میں جائداد کی ضبطی کا اختیار بھی حاصل کر لیا گیا۔ آرمز ایکٹ کی توسیع دنگا فساد والے دیہات تک کر دی گئی۔ 1902ء تک پشاور ڈویژن میں جو اصلاً راولپنڈی پولیس رینج میں شامل تھی' اسی طرح نظام چلتا رہا۔ 1902ء میں اسے الگ چیف کمشنر کا صوبہ بنادیا گیا ۔ شمال مغربی صوبہ سرحد کے غیر قبائلی علاقوں میں پولیس کا نظام اور ڈھانچہ وہی رہا جو پنجاب اور کسی حد تک سندھ میں تھا جبکہ قبائلی علاقوں میں ان حدود کا خیال رکھا جاتا جو بلوچ یا پختون قبائل سے مختص تھیں۔

1861ء کی اصلاحات کے مطابق سرحد سمیت تمام پنجاب میں فوجی افسروں کو ہی پولیس میں بھیجا جاتا تھا مگر اس کے بعد حالات بھی تبدیل ہوئے' فوج اور پولیس کے درمیان مکمل علیحدگی پر زیادہ زور دیا گیا اور اگلی نسل میں یوں ہوا کہ سول سروس کے امتحان میں کامیاب ہونے والے انگریزوں کو ہی پولیس میں افسرانہ ملازمتیں دی جانے لگیں۔ اس انگریز پولیس افسر سے یہ توقع کی جاتی کہ وہ بہترین ڈسپلن' اعلیٰ کارکردگی اور ملازمین سے مساوی سلوک کرے گا' باقی سارا کام مقامی ملازمین کریں گے۔

1895ء سے پہلے پولیس میں اوپر سے نیچے تک نامزدگی سے ملازمتیں ملتی تھیں۔ ایک معمولی سا امتحان (دکھاوے کا) بھی بعض اوقات لیا جاتا تھا۔ اس کے بعد ایسا مرحلہ آیا کہ فوج سے افسروں کی فراہمی بند ہوگئی۔ گورنر جنرل کرزن نے جو انتظامی اصلاحات

کیں ان کے سبب انگریزوں کی دلچسپی سول اور پولیس سروس میں کم ہوگئی وہ ہندوستان آنے کی بجائے برطانیہ کی دوسری نو آبادیوں (افریقہ مشرق وسطی اور مشرق بعید وغیرہ) میں جانے کو ترجیح دیتے تھے۔

پنجاب (مع سرحد) کی پولیس نظم و ضبط اور انفرادی کارکردگی کی بنا پر پورے ہندستان میں بڑی پسندیدہ قرار پائی تھی۔ ان کی ایک صفت پر بڑا زور دیا جاتا کہ وہ مشکل سے مشکل حالات میں بھی کام کرنے سے نہیں تھکتے۔ کوئی موسم ہو کیسے ہی جغرافیائی اور سیاسی حالات ہوں ان کو جو فرائض سپرد کئے جاتے ہیں وہ اسے پوری جانفشانی سے ادا کرتے ہیں۔ چنانچہ انگریزوں کی جن دوسری نو آبادیوں میں افسر لوگ مقامی پولیس کی کار کردگی سے مطمئن نہ ہوتے وہ پولیس کے آدمی ہندستان خصوصاً پنجاب سے منگواتے۔

آفتاب نبی (مضمون مطبوعہ ڈان 22مارچ 1996) نے اس ضمن میں کچھ تفصیلات فراہم کی ہیں' انگریزوں نے جب ہانگ کانگ پر قبضہ کیا تو مقامی حالت کے پیش نظر پولیس بنائی جس میں اوپر کے چند چوٹی کے عہدہ دار انگلستان سے منگوائے کچھ یورپین فوجی ڈالے۔ نیچے چینی سپاہی بھرتی کئے مگر معاملات بگڑتے چلے گئے۔ چینی بہت ہی بدعنوان رشوت خور اور نا اہل قرار پائے۔ ایک مسئلہ زبان کا بھی پیدا ہو' برطانوی فوج کے ریٹائرڈ یورپی اور ہندوستانی اہل کار مقامی زبان ہی نہیں سمجھتے تھے نہ ان کی زبان اچھی طرح سمجھی جاتی تھی اس لئے چینی باشندوں کو بھرتی کیا گیا تھا۔ یہ سلسلہ زیادہ دیر نہیں چل سکا۔ 1845ء میں لندن سے پولیس کا ایک سپرنٹنڈنٹ چارلس مے منگوایا گیا جس نے لندن پولیس اور آئرش کانسٹیبلری کی تنظیم کو ملحوظ رکھ کر مقامی پولیس کھڑی کی۔ مگر جرائم بے انتہا تھے مجرموں کو سر عام کوڑے مارنے کی سزا بھی جرائم کی روک تھام میں مددگار ثابت نہ ہوئی۔ شام کے بعد نہ صرف گلیوں بازاروں میں انسان غیر محفوظ تھا بلکہ گھر میں بھی اس وقت تک حفاظت نہیں سمجھی جاتی تھی جب تک اس کو ہر طرح سے مقفل یا بند نہیں کر لیا جاتا تھا۔ یورپی افسروں کا حال یہ تھا کہ دن رات ڈیوٹی کے وقت یا بغیر ڈیوٹی نشے میں ڈوبے رہتے' مقامی آب ہوا کی وجہ سے بیمار ہوجاتے یا قحبہ خانوں سے بیماریاں خرید لاتے۔ یہ قحبہ خانے بھی در پردہ پولیس کی مدد سے ہی کھلے ہوئے تھے۔ اور تو اور فضا ایسی ہوگئی کہ خود چارلس مے پر بھی الزام لگا کہ اس نے قحبہ خانہ کھول رکھا ہے۔ اس پر انکوائری ہوئی جس

میں الزام ثابت نہ ہوا۔ بہر طور کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہانگ کانگ کا کوئی آدمی یہ یقین کرنے کے لئے تیار نہ تھا کہ کوئی پولیس والا ایسا بھی ہوسکتا ہے جو قحبہ خانہ نہ چلاتا ہو۔ ان کے لئے پولیس (یورپی یا مقامی اور قحبہ خانہ لازم وملزم تھے۔

چارلس مے کی جگہ کیپٹن ویلیئم کوئن آیا جو بمبئ پولیس میں بھی رہ چکا تھا۔ اس نے صورت حال کی صلاح کے لئے بمبئ سے پولیس والے منگوائے۔ ڈیڑھ سو کے قریب نئے بھرتی کئے اور باقی بمبئ کی نیٹو انفنٹری کے ریٹائر لوگ لئے گئے۔ مگر ہانگ کانگ میں ان کی کارکردگی اور بھی تباہ کن ثابت ہوئی۔ یہ بھی دوسرے یورپی اور چینی افسروں اور اہل کاروں کی طرح رشوت اور بدعنوانی کی دلدل میں دھنس گئے ۔ وہی شراب و شباب کا کاروبار، وہی نا اہلی، وہی معاشرتی تباہیاں، سزائیں بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھیں کیونکہ سارے عیب خود یورپی پولیس والوں میں تھے ۔ ظاہر ہے ان کے ماتحت ان سے بھی چار ہاتھ آگے ہی ہونے چاہیں۔

اب ایک اور تجربہ کیا گیا۔ بمبئ والوں کی جگہ 1865ء پنجاب سے پولیس والے بھرتی کئے گئے ان میں پہلی کھیپ پچاس کی تھی جن میں سکھ اور مسلمان شامل تھے ۔ یہ پنجابی بمبئ اور مدراس کی پولیس کے مقابلے میں بالکل ہی مختلف قسم کے لوگ تھے اور انہوں نے ثابت بھی کیا، کیونکہ ان کے جانے کے بعد ہانگ کانگ میں جرائم کی رفتار میں خاصی کمی آئی۔ بمبئ والا کیپٹن کوئن ناکام ہوا مگر جب وہ ہانگ کانگ سے واپس چلا گیا تب گورنر نے مزید پنجابی پولیس والے منگوائے۔ پنجاب میں ہی فرائض انجام دینے والے آئرش پولیس افسر گائلز کریغ (Giles Creagh) ہانگ کانگ میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس بنادیا گیا۔ گورنر نے مقامی پولیس کی خاصی بڑی تعداد کو ہٹا دیا اور پنجاب سے بھرتی کئے گئے 147 افراد کو پولیس میں کھپالیا۔ یہ تجربہ بھی بڑا کامیاب ہوا اور ایک سال بعد سو پنجابی سکھ مزید بھری کئے گئے اور نہیں ہانگ کانگ لے جایا گیا۔ 1868 میں کریغ پھر پنجابی بھرتی کرنے آیا۔ یہ لوگ امرتسر اور اس کے نواح سے بھرتی کئے گئے۔ 922ء تک ہانگ کانگ پولیس میں پنجابیوں کی تعداد 435 تھی جو کل نفری کا 36 فی صد تھے۔ ہانگ کانگ میں انگریز حاکموں کا ہمیشہ یہی خیال رہا کہ پنجابی محنتی ہیں دلجمعی سے اپنے فرائض انجام دیتے ہیں، قباحتوں کا کم شکار ہوتے ہیں نسبتاً دیانتدار ہیں، سخت سے سخت حالات میں بھی فرائض

سرانجام دینے کو اولین اہمیت دیتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ یورپی پولیس والوں کے مقابلے میں کم خرچ پڑتے ہیں ۔صورت جو بھی تھی حقیقت یہ ہے کہ پنجاب میں جس طور پر پولیس کی تربیت اور تنظیم ہوئی جس طور ان سے محنت کروائی گئی اور جس انداز میں انہوں نے اپنے آپ کو ڈھالا اس کی بنا پر انہی ملک کے اندر اور ملک کے باہر کامیابی حاصل ہوئی۔ جبکہ مدراس، بمبئی، بنگال، یوپی وغیرہ میں مقامی طور پر پولیس ایسی مستعد نہ تھی جیسی پنجاب میں۔ دوسرے بہر طور یہ مشکل علاقوں کے رہنے والے اور شدید موسموں کی سختیاں سہنے والے دوسرے تن آسان ہندوستانی پولیس والوں کے مقابلے میں زیادہ اچھے کار کن تھے۔

انگریز افسروں کی ہندوستان سے زیادہ دوسرے نو آبادتی علاقوں میں دلچسپی کا یہ زور ختم ہوا۔ بیسویں صدی کے شروع میں زیادہ تعلیم یافتہ لوگوں نے اعلیٰ پولیس سروس میں دلچسپی لینا شروع کی۔ پولیس سروس میں شامل ہونے یا فوج میں کنگ کمیشن لینے کے لئے تقریباً ایک سا امتحان پاس کرنا پڑتا تھا فرق صرف اتنا تھا کہ سینڈھرسٹ کے مقابلے میں پولیس کے امتحان کے لئے عمر کی حد زائد رکھی گئی تھی۔ یہ سلسلہ پہلی جنگ عظیم تک جاری رہا۔ اس عرصہ میں ان امتحانوں میں شریک ہونے والوں کا ذہنی اور تعلیمی معیار خاصا بلند تھا اور یہ افسر دوسری اعلیٰ سروسوں والوں کی ٹکر کے تھے۔

پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو بھرتی روک دی گئی۔ جنگ کے ختم ہونے پر پولیس کے افسروں کی کم پوری کرنے کے لئے فوج سے یورپی اور ہندوستانی کمشنڈ افسروں کی نامزدگیاں کی گئیں۔ اس مرحلے کے بعد پھر مقابلے کے امتحان شروع کئے گئے۔ اب تک مقابلے کے سبھی امتحانات صرف انگلستان میں ہوا کرتے تھے اور ہندوستانیوں کو بھی امتحان میں شریک ہونے کے لئے انگلستان جانا پڑتا تھا مگر سیاسی منظر تبدیل ہونے لگا۔ 1919ء کا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ منظور ہوا تو پھر مقابلے کے امتحانات (جن میں پولیس سروس کے لئے بھی امتحان شامل تھا) بیک وقت انگلستان اور ہندوستان میں ہونے لگے۔ اس طرح یہ بھی ہوا کہ جو انگریز امیدوار انڈین پولیس کے لئے منتخب ہوگیا اسے انگلستان میں تربیت نہیں دی جاتی تھی بلکہ ہندستان میں لاکر دوسرے منتخب ہونے والوں کے ساتھ تربیت حاصل کرنا پڑتی تھی۔

انڈین پبلک سروس کمیشن کی 1912ء کی ایک رپوٹ کے مطابق اعلیٰ پولیس سروس کا حقدا ہندوستانیوں اور اینگلو انڈین لوگوں کو بھی قرار دیا گیا تھا۔ کوئی بارہ برس (جیسے کہتے ہیں بارہ برس کے بعد روڑی کی بھی سنی جاتی ہے) لی کمیشن نے یہ شرط بھی عائد کردی کہ 1939ء تک اعلےٰ پولیس سروس میں مقامی لوگوں کو پچاس فی صد تک نمائندگی لازماً دے دی جائے ۔ بنگال میں تو خیر یہ عنایت کر دی گئی مگر پنجاب سرحد سندھ وغیرہ میں انگریزوں نے بڑی خست سے کام لیا۔

1861ء کے بعد 63۔ 1862ء اور 1869ء میں پولیس کی نفری میں اضافہ کیا گیا۔ ان دنوں ایک ماتحت پولیس اہل کار کا ایک ضلع سے دوسرے ضلع میں تبادلہ صرف ڈپٹی انسپکٹر جنرل کی منظوری سے ہوسکتا تھا۔ ورنہ تبادلوں پر مکمل طور پر پابندی تھی۔ 1867ء میں ریلوے پولیس یا پولیس کا ریلوے کا شعبہ کھولنے پر غور کیا جانے لگا۔ انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں (1861ء کے بعد) پنجاب سے بعض خاص فرائض کے لیے پولیس سرحد کے پہاڑی علاقوں ضلع ہزارہ اور درہ بولان میں بھیجی گئی۔ سبھی جگہ آمدورفت اور مواصلات کے ذرائع کی حفاظت کرنا مقصود تھا۔ ریاست سیکست میں بغاوت ہوئی تو اسے کچلنے کے لئے کانگڑہ سے پولیس بھیجی گئی۔ دہلی میں جب وائسرائے کے دربار ہوتے تو پولیس کو خاصے کٹھن حالات میں فرائض ادا کرنے پڑتے۔ شہزادے ڈیوک آف یارک اور پرنس آف ویلز آئے تو پولیس کو خاصا تردد کرنا پڑا اور زیادہ تر قرعہ فال پنجاب پولیس کے نام پڑا۔ قحط سیلاب' آتش زدگی وغیرہ متعدد آفات اور مصائب کی صورت میں بھی پولیس کو معمول سے بڑھ کر کام کرنا پڑتا۔

پچھلی صدی کی دو دہائیوں میں متعدد نئے فرائض بھی پولیس کے ذمے لگے۔ کچھ قاعدے تبدیل ہوئے کیسوں کی ڈائریوں کا سلسلہ شروع ہوا' محرر کو مقدمہ سے متعلق کاغذات و مال کی حفاظت کا ذمہ دار قرار دیا گیا۔ پولیس چالانوں کی مکمل چھان بین کے ساتھ ساتھ جیلوں میں شناخت پیریڈ کا سلسلہ متعارف کرریا گیا۔ ملزم سے پوچھ گچھ کے متعلق پولیس کے اختیارات کم کئے گئے اور ہتھکڑی کے استعمال کو بھی محدود کیا گیا اور اسی طرح پولیس کی مستقل تربیت کے لئے ادارے یا اداروں کے قیام کا سوال بھی پیدا ہوا۔

ایک وقت ایسا بھی آیا جب پولیس میں بھرتی کے لئے آدمی نہیں ملتے تھے کیونکہ

ایک عام غیر تربیت یافتہ مزدور کی اجرت بھی پولیس والے کی اجرت سے بڑھ گئی تھی' مہنگائی ہوئی۔ جبکہ پولیس کی تنخواہیں وہیں کی وہیں رہ گئیں۔ لازمی نتیجہ یہی نکلنا تھا کہ رہتک حصار سے لے کر ہزارہ پشاور کوہاٹ تک پولیس کے محکمہ میں بے شمار اسامیاں خالی ہوگئیں۔ جو پولیس میں رہ گئے تھے وہ مجبوری کے باعث تھے جو افراد ہوسکتے تھے وہ چھوڑ گئے معاملہ نازک ہوگیا۔ پہلی کوشش پہلے قدم کے طور پر ہر سپاہی کی تنخواہ میں ایک روپیہ ماہانہ بطور قحط الاؤنس بڑھا دیا گیا۔ لیکن اس کے باوجود اسامیاں خالی پڑی رہیں۔ انسپکٹر جنرل کو تشویش ہوئی۔ اس نے ایک دوسری صورت نکالی کہ بھرتی کے لئے قد کی شرط گھٹا کر پانچ فٹ چھ انچ کر دی' بھرتی کے تین مہینے کے بعد وردی کی کٹوتی ختم کر دی اور یہ پیش کش بھی کی کہ جو پولیس والا اپنے علاقے سے رنگروٹ لے کر آئے گا اسے فی نفر دو روپے انعام دیا جائے گا اور یہ ہدایت بھی دی گئی کہ تیس سال تک کی عمر کے سابق فوجی بھی پولیس میں بھرتی کئے جائیں۔ یہ صورت حال پچھلی صدی کی آٹھویں دہائی میں پیش آئی۔

پولیس کے مالی معاملات اور عام کارکردگی کے سلسلے میں پنجاب میں بھی کچھ خراب اثرات نظر آنے لگے تھے' گورنر جنرل لارڈ کرزن کو اس کی بہت فکر تھی اس نے بارہا پولیس کی کارکردگی' صوبوں کی پولیس کی تنظیم میں کارکردگی اور ہم آہنگی اور مالی امور کے بارے میں اظہار خیال کیا' اس کی نظر میں پولیس بعض اوقات حکومت کی بدنامی کا باعث بن جاتی ہے اور بعض اوقات اپنی حدود تک کی خلاف ورزی کرتی ہے چنانچہ 03-1902ء میں ایک پولیس کمیشن بنایا گیا جس کے ارکان میں ایک جسٹس کینڈی کے ساتھ چار یورپین رکن تھے جبکہ دو ہندوستانی مہاراجہ دربھنگہ اور دیوان بہادر سری نواس رگھو یہ یا ناگر بھی تھے۔ اس کمیشن نے جن امور پر غور کرنا تھا ان کی تفصیل بعد میں۔ فی الحال اس کی طرف سے سفارش کی گئی تنخواہوں کی تفصیل: کمیشن نے کہا کہ اجرت اتنی ہونی چاہیے کہ آدمی معاشرے کے جس گروپ سے تعلق رکھتا ہے اس کے معیار کے مطابق آسودگی سے بسر اوقات کر سکے۔ کم از کم تنخواہ آٹھ روپے ماہانہ۔ ایک روپیہ ترقی مگر تین سال کے بعد پھر پانچ سال بعد ایک روپیہ کا اضافہ اور پھر سات سال بعد ایک روپے کا اضافہ گویا 1902ء میں جس سپاہی کو آٹھ روپے پر بھرتی کیا گیا اسے 1905ء میں نو روپے تنخواہ اور پانچ سال بعد 1910ء میں دس روپے اور 1917ء میں گیارہ روپے ماہانہ تنخواہ تجویز کی گئی۔ اعلیٰ

کارکردگی کی بنا پر نقد انعام یا کارکادگی کے ریکارڈ میں بہتر کلمات یا فیتوں کی تعداد میں اضافہ: یہ معاملہ تو کانسٹیبل کا تھا:

ہیڈ کانسٹیبل کے لئے تین گریڈ	15'20 اور 25 روپے تجویز کئے گئے
سب انسپکٹر کے لئے چار گریڈ	50-60 -70-80
انسپکٹر کے لئے بھی چار	150-175-200-250
ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ	250-300-400-500

صوبائی سروس کے سپرنٹنڈنٹوں کے لیے 6000 اور 900 کے درمیان

یورپین افسروں (ایس پی) کے لئے پانچ گریڈ 700 سے 1200 روپے تک

ڈپٹی انسپکٹر جنرلوں کے لئے تین گریڈ	1500-1750-2000
اور انسپکٹر جنرل کے لئے	2500=100 روپے سالانہ ترقی' 3000 تک

صوبہ سرحد کے انسپکٹر جنرل کی تنخواہ ڈپٹی انسپکٹر جنرل کی آخری تنخواہ کے برابر۔ یعنی دوہزار سے شروع۔ کانسٹیبلوں' ہیڈ کانسٹیبلوں کو چھوڑ کر باقی سب کے لئے بلا کرایہ مکانوں کی سفارش کی گئی۔ کمیشن کی اکثر سفارشات متفقہ تھیں صرف مہاراجہ دربھنگہ نے یورپی اور ہندوستانی کے درمیان امتیاز پر اعتراض کیا تھا اور یہ اصرار بھی تھا کہ عدلیہ کو انتظامیہ سے مکمل طور پر الگ کر دیا جائے۔

کمیشن کی شرائط کار اور تحقیق طلب معاملات یہ تھے۔

1 کمیشن یہ دیکھے کہ ملک میں امان و امان اور نفاذ قانون کے لئے پولیس کی نفری کافی ہے۔

2 تنظیم ٹھیک ہے؟

3 تربیت کا انتظام مناسب ہے؟

4 جرائم کی اطلاع کے بارے میں موجودہ نظام درست ہے؟

5 کیا دیہی ملازمین اور دیہی پولیس جرائم سے نمٹنے کے لئے پوری طرح مددگار ہیں؟

6 تفتیش کا طریق کار درست ہے؟

7 کیا اعداد و شمار کے بارے میں جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے تسلی بخش ہے؟

8 ماتحت پولیس افسروں کو اپنی حدود سے آگے بڑھنے سے روکنے کے لئے مجسٹریٹوں

کی طرف سے نگرانی کا طریق کار کیا ہے؟

9 ریلوے پولیس کی سکیم اور کارکردگی تسلی بخش ہے؟

10 کیا جرائم کی تفتیش کے لئے الگ شعبے کی ضرورت ہے؟

کمیشن نے بڑی محنت سے تمام امور پر غور کیا۔ شوہد اکٹھے کئے اور تقریباً ہر بات پر اپنا موقف واضع کیا اور سفارشات پیش کیں۔ کہتے ہیں کہ پولیس کے بارے میں یہ پہلی بے مثال سرکاری رپورٹ تھی۔ مہاراجہ دربھنگہ نے کمیشن کی اس سفارش پر اعتراض کیا کہ یورپ میں ہندوستانی پولیس کے لئے افسر اٹھارہ سے بیس سال کی عمر میں مقابلہ کے امتحان کے ذریعے بھرتی کئے جائیں جو یورپین سروس میں شمار ہوں' ہندوستان میں صرف انسپکٹر' سب انسپکٹر اور ہیڈ کانسٹیبل کی اسامی کے لئے بھرتی کی جائے اسے صوبائی سروس کہا جائے۔ بڑے صوبوں کو رینجوں میں تقسیم کیا جائے۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کا نیا عہدہ وضع کیا جائے۔ ضلع کو پانچ سے لے کر آٹھ تھانوں تک سرکل بنایا جائے اور انسپکٹر کو انچارج بنایا جائے۔ تھانے کا علاقہ ڈیڑھ سو مربع میل کے برابر ہو اور تھانے کا انچارج سب انسپکٹر ہو۔ ایک ایڈیشنل افسر ہو۔ ایک ہیڈکانسٹیبل بطور محرر دوسرا جنرل ڈیوٹی کے لئے ۔ ایک یورپی انسپکٹر کی نگرانی میں ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر میں ریزور فورس رکھی جائے جسے ہنگامی حالت میں استعمال کیا جا سکے۔ بنگال میں ملٹری پولیس ختم کر دی جائے۔ گھوڑ سوار پولیس مہنگی پڑتی ہے اس لئے اس کی تعداد کم کی جائے۔ یورپی سارجنٹ رکھے جائیں جو اپنے ہم وطنوں سے بوقت ضرورت نمٹ سکیں۔ ریلوے پولیس کے بارے میں کہا گیا اس کو واچ اینڈ وارڈ کی ڈیوٹی نہ دی جائے۔ ماتحت اہل کار ہر مسافر ریل گاری کے ساتھ سفر کریں۔ یہ تجویز بھی کی گئی کہ پولیس کا ایک دریائی شعبہ بھی قائم کیا جائے۔ یہ تجویز بھی دی گئی کہ میونسپل کمیٹیوں اور کنٹونمنٹ بورڈوں کے لئے الگ پولیس ختم کردی جائے بجز بڑے شہروں کے جہاں حکومتی ہیڈ کوارٹر ہوں۔

تربیت کے سلسلے میں کمیشن نے سفارش کی کہ جن کو یورپی گریڈ کی سروس کے لئے انگلستان میں امتحان کے بعد منتخب کیا جائے انہیں ولائت کی ہی کسی رہائشی یونیورسٹی میں دوسالہ کورس کرایا جائے۔ جو ہندوستان کی تاریخ ' جغرافیہ' فوجداری قانون اور اس کی پرکٹس' عدالتی کام اور گھوڑ سواری کی تربیت پر مشتمل ہو۔ کمیشن نے یہ سفارش بھی کی کہ

ہندوستان کے بڑے صوبوں میں تربیتی ادارے قائم کئے جائیں جن کا پرنسپل سپرنٹنڈنٹ کے عہدے کا ہو' یورپی افسروں کو لندن کی یونیورسٹی کے بعد ہندوستان کے ان صوبائی تربیتی اداروں میں تربیت دی جائے۔

کمیشن نے یہ بھی کہا کہ پولیس کی صوبائی سروس میں آدھے انسپکٹر براہ راست مقرر کئے جائیں باقی آدھی آسامیاں براہ راست بھرتی سے پر کی جائیں۔ ہیڈ کانسٹیبلوں کی ترقی کے ذریعے صرف پندرہ فی صد آسامیوں پر لیا جائے۔ اس بات پر بھی زور دیا گیا کہ براہ راست بھرتی کئے جانے والوں کی عمر اکیس اور پچیس سال کے درمیان ہونی چاہئے امیدوار اچھے کردار کے ہوں' اچھے خاندانوں سے متعلق ہوں اور ضروری تعلیمی اہلیت رکھتے ہوں۔

پولیس کے تربیتی اداروں میں کورس کے سلسلے میں یہ سفارش کی گئی کہ اس میں قانون فوجداری' قانون شہادت' پولیس کا طریق کار اور اس پر عمل' جرائم پیشہ طبقوں کی عادات اور رسم ورواج اور تھانوں میں کس طور معاملات کو چلایا جائے خصوصاً اپنے ہم پیشہ پولیس والوں سے کس طور سلوک کیا جائے۔ یہ باتیں کورس میں شامل کی جائیں۔ ہیڈ کانسٹیبل براہ راست مقرر نہ کئے جائیں' کانسٹیبلوں کو ہیڈ کانسٹیبل کے عہدے پر ترقی دے جائے۔ کانسٹیبل کو چھ ماہ کے تربیتی کورس میں ڈرل' ڈسپلن' بنیادی قانون' پولیس کے طریق کار عوام سے رویہ کی تربیت دی جائے۔

کمیشن نے دیہی علاقوں میں چھوٹے موٹے جرائم اور خلاف ورزیوں کے سلسلے میں گاؤں کے سرپنچوں اور پنچائیت پر زیادہ ذمہ داری ڈالی۔ جرائم پیشہ لوگوں کے (بستہ) ریکارڈ رکھنے' ان کے روزانہ تھانے میں حاضر ہونے' ہسٹری شیٹوں کا ہمہ گیر اور یکساں طریقہ مصروف جرائم پیشہ قبیلوں پر نظر رکھنے کا کام بھی بہتر طریق سے کیا جائے۔ یہ بھی کہا گیا کہ پولیس میں لکھت پڑھت اور اعدادوشماری کا کام کم کیا جائے اور توجہ اصل کام پر دی جائے۔ ان کی کارکردگی کا جائزہ اعدادوشمار سے سے نہیں کارگزاری سے کیا جائے۔ کمیشن نے یہ بھی کہا کہ پولیس میں بہت سی خرابیاں ہیں۔ اس نے سفارش کی کہ تفتیش کا الگ شعبہ قائم کیا جائے جو ڈپٹی انسپکٹر جنرل کے ماتحت ہو۔ یہ محکمہ مخصوص فوجداری مقدموں کی انکوائری میں مدد دے۔ ضروری ریکارڈ رکھے جرائم کے بارے میں اطلاعات وغیرہ فراہم

کرے ۔یہی محکمہ فنگر پرنٹ بیورو بھی چلائے اور انتظامی قسم کی خط و کتابت اور دوسرے امور بھی اسی محکمہ کے پاس ہوں۔

ان سفارشات کے بعد پولیس کی تاریخ میں اہم واقعات یہی رہے کہ کچھ اور شاخیں اور شعبے کھل گئے' کہیں کہیں معمول انتظامی تبدیلیاں کی گئیں ۔ وردی اور تنخواہوں میں وقتاً فوقتاً نظر ثانی یا تبدیلی کی گئی۔

دہلی میں شاہی دربار 1911ء میں منعقد ہوا جس کے بعد اسے (دہلی کو) پنجاب سے علیحدہ کر دیا گیا۔ 1919ء میں پنجاب میں اونٹ سوار اردلیوں کی جگہ سائیکل سوار آ گئے۔ 1925ء میں سکھوں کی تحریک چلی گوردواروں کے سلسلے میں۔ ایک بہت بڑا بینک فراڈ ہوا' اور مزدوروں کی چند ہڑتالیں ہوئیں۔ اس سال یہ فیصلہ ہوا کہ سب انسپکٹر کو کسی ایک جگہ تین سال سے زائد مدت کے لئے نہیں رکھا جائے گا۔ کورٹ انسپکٹر کو پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کہا جانے لگا۔ 1927ء میں کانسٹیبل سے تلوار لے لی گئی اور اسے لاٹھی دے دی گئی۔

پنجاب میں پولیس کی کارکردگی' نفری اور دوسرے امور کا جائزہ لینے کے لئے 1923 میں لمسڈن کے نام سے ایک کمیٹی بنی جس میں لمسڈن کے علاوہ سردار سکندر حیات' کوکس اور گور دیال ممبر تھے جس نے سفارش کی کہ ڈیڑھ سو مربع میل کے دیہی رقبے میں ایک تھانے کے اندر جس میں ماہانہ کم از کم پچھتّر مقدمات درج ہوتے ہوں وہاں عملہ بڑھایا جائے۔ اس وقت تک ایسے تھانے کی نفری ایک سب انسپکٹر' دو ہیڈ کانسٹیبلوں اور دس کانسٹیبلوں پر مشتمل تھی۔ سفارش کی گئی کہ یہاں مزید دو تفتیشی افسر' ایک محرر ہیڈ کانسٹیبل اور بارہ کانسٹیبل دیئے جائیں' اسی طرح کی کچھ اور انتظامی سفارشات کی گئیں اور یہ بھی بتایا گیا کہ پنجاب میں پولیس پر خرچ بجٹ کا صرف 10.67 فی صد ہے جبکہ بنگال میں اس مد پر بجٹ کا 17.47 فی صد مختص ہوتا ہے۔

دریائی پولیس: دریاؤں کے گھاٹوں اور پتنوں پر زمانہ قدیم سے پولیس اور ٹیکس وصول کرنے والے موجودہ ہوتے ہیں۔ 1857ء کی جنگ آزادی میں جب دریائی گھاٹ کثرت سے استعمال ہونے لگے تو اس شعبہ کو بھی اہمیت مل گئی۔ چنانچہ ضلع گوگیرہ (ساہیوال' اوکاڑہ) میں احمد خان کھرل کی جنگ کے دوران راوی اور ستلج دونوں دریاؤں

نے گوریلا جنگ بازوں کو خاصی مدد دی' ایک اسسٹنٹ کمشنر برکلے ایک بار راوی کو عبور کر کے احمد خان کھرل کے گاؤں جھامرہ کے قریب پہنچا تھا اور اس نے متعدد دیہات کو آگ بھی لگائی تھی مگر بعد میں اسی دریا کے آس پاس وہ مراد فتیانہ کے ہاتھوں مارا گیا' اسی طرح ایک اور لفٹین عارف والہ۔سلیمانکی کے قریب ان علاقوں میں مارا گیا جو ریاست بہاول پور سے ملتے ہیں یہاں باغی وٹوؤں نے کشتیوں پر قبضہ کر لیا تھا' یہیں سے وٹو بوقت ضرورت بہاول پور کی سرحد میں داخل ہوجاتے تاہم انہیں نواب بہاول پور سے کوئی مدد نہیں ملی بلکہ بعد میں خود ریاست کی انتظامیہ نے اس دریائی سرحد کو آزادی پسندوں سے صاف کرنے میں انگریز کی مدد کی۔ اسسٹنٹ کمشنر برکلے کے دریائے راوی کے کنارے پہنچنے کی صورت ایک عوامی شاعر نے یوں بیان کی ہے:

آمدن سن برکلی دی' نیلی آلے وٹو' ڈوگر وی چپاں گئے وٹ سارے
پھیرا راوی دے اتے چا کیتا جھتے رہندے نی راٹھ کرارے
اگے وی نال حکومت دے تلن' وٹے راٹھاں دے رہندے ہین بھارے
کدھی دریا دی دے اتے' انگریز جھگے چپیاں دے پھوک مواتے ہین بالے

''گوگیرہ کا اسسٹنٹ کمشنر برکلے' احمد خان کی تلاش میں دریائے راوی پر پہنچا جس کی دوسری طرف احمد خان کا گاؤں جھامرہ تھا' اس کی آمد پر ادھر کے وٹو اور ڈوگر بھی خاموش ہوگئے' برکلے دریا کے اس کنارے پر آیا جہاں بڑے بہادر سردار رہتے ہیں' جنہوں نے کئی بار حکومت کا مقابلہ کیا ہے اور ہر بار ان کا پلہ بھاری رہا ہے۔' وہاں برکلے نے غصے میں دریا کے کنارے غریب لوگوں کی جھگیوں کو آگ لگا دی کیونکہ انہوں نے اسے احمد خان کھرل کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں دی تھی''

حکم ہوا کہ گھاٹ والی کشتیاں' شورش پسندوں کے ہاتھ نہ لگیں' بہت سی کشتیاں اس خیال سے ڈبو دی گئی کہ وہ باغیوں کے ہاتھ نہ لگیں۔بعض کو قابل استعمال بنادیا گیا۔ کناروں سے دور کھڑا کیا گیا جبکہ دریا کو آسانی سے عبور کرسکنے والے راستوں پر پولیس گشت کرتی رہی' 1880ء تک دریائی پولیس کے اخراجات دریا پر وصول ہونے والے ٹیکس سے پورے کئے جاتے مگر بعد میں یہ اخراجات پولیس کے بجٹ سے پورے کئے جانے لگے۔

1865ء میں مویشی چوری کی روک تھام کے لئے مظفر گڑھ میں (دریائے چناب اور سندھ) بھی دریائی پولیس متعین کی گئی۔ اس کے بعد ڈیرہ غازی خان میں' 1870ء میں ضلع جھنگ میں بھی ایس پی نے جہلم اور چناب کے کناروں پر مچان بنائے اور جانوروں کی کھالوں سے مشکیں بھی بنائیں تاکہ مچان سے مشاہدہ کیا جاسکے اور اگر چوروں کو دریا میں دیکھ لیا جائے تو پھر تیر کر انہیں پکڑا جائے یہ طریقہ بڑا کامیاب رہا اور دہلی' رہتک' اور حصار میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا گیا۔ ضلع منٹگمری (ساہیوال) میں دریائی علاقوں میں سرگروہی کا طریقہ آزمایا گیا۔ بہت سے دیہات باہمی رضامندی سے سرگروہوں کا انتخاب کرتے اور پھر یہ مویشیوں کا کھرا ڈھونڈتے دریا کے کنارے تک پہنچتے۔ کھوجی بھی ان کی مدد کرتے۔ یہ سرگروہی طریقہ دراصل دریائی پولیس کا ہی متبادل تھا۔

بہر طور دریائی پولیس کا زیادہ کام بنگال میں تھا جبکہ قیام پاکستان سے سقوط ڈھاکہ تک مشرقی بنگال کی دریائی پولیس پاکستان پولیس کا ہی ایک حصہ رہی۔ پاکستان میں سندھ اور سرحد میں بھی بعض دریائی مقامات پر اسی قسم کی پولیس سے کام لیا گیا۔ بعد میں یہ شعبہ ختم کر دیا گیا۔

صوبہ پنجاب کے بعض علاقے بالکل قبائلی نوعیّتوں کے تھے وہاں عام پولیس بھی تھی مگر ان سے ہٹ کر پولیس کا ایک دوسرا شعبہ بھی تھا۔ ایسے شعبے بلوچستان میں عام تھے۔ اسے 1901ء میں ڈیرہ غازی خان بارڈر ملٹری پولیس کا نام دیا گیا۔ 1905ء میں ایک حصہ کو بلوچ لیوی اور دوسرے سوار حصے کا پرانا نام ہی رہنے دیا گیا۔ 1914ء میں لیوی کو ختم کر دیا گیا۔ لیوی دراصل قبائلی بنیادوں پر قائم کی گئی تھی اس میں پچاس فی صد بزدار بلوچ تھے۔ پچیس فی صد قیصرانی اور کھیتران جبکہ بیس فی صد غیر قبائلی پنجابی تھے۔

ریلوے پولیس:

ریلوے پولیس شروع میں بنگال میں ایسٹ انڈین ریلوے کے لئے قائم کی گئی۔ اس سے پہلے ریلوے والوں نے حفاظت اور امن وامان کے لئے چوکیدار وغیرہ بھرتی کر رکھے تھے مگر وہ سب بے اختیار اور بے ہتھیار تھے۔ وہ پولیس کی حیثیت سے مجرموں اور ملزموں کو پکڑ نہیں سکتے تھے۔ البتہ انہوں نے خود بدعنوانی اور زیادتی بارہا کی۔ علاج اس

کا یہ سوچا گیا کہ ریلوے بورڈ نے پولیس سے کہا کہ وہ اپنے آدمی دے جس کے لئے خرچہ ریلوے ادا کرے گا۔ پولیس نے آدمی دے دیئے۔

پنجاب میں اس کی ضرورت 1868 میں پڑی' ریلوے سٹیشنوں پر ریلوے کا سامان بھی تھا اور تاجروں وغیرہ کا بھی کبھی چوری کر لیا جاتا کبھی کوئی اٹھا کے لے جاتا۔ اس کے علاوہ خود ریلوے کے لئے ایک حفاظتی نظام درکار تھا۔ 1868ء میں ریلوے پولیس کا شعبہ قائم کیا گیا یہ بھی ریلوے والوں کی درخواست پر ہوا۔ سول پولیس نے تمام اضلاع سے 204 کی تربیت یافتہ نفری (افسر اور ماتحت) ریلوے کو فراہم کر دیئے ان کی جگہ پولیس نے نئی بھرتی کر لی۔ یہ ریلوے پولیس لاہور اور دہلی کے درمیان تعینات کی گئی۔

دہلی اور لاہور کے درمیان 234 افراد کی تعیناتی ہوئی۔ ان کے افسر ایک اسسٹنٹ انسپکٹر جنرل پولیس مقرر ہوئے جن پر لاہور کے ڈپٹی اسپکٹر جنرل کی نگرانی تھی۔ پہلے سال ہی اس کی کارکردگی بڑی اچھی رہی۔ ریلوے کی سال بھر کی چوری گھٹ کر صرف چار سو روپے تک رہ گئی۔ ریلوے پولیس نے ریلوے کے (35) پینتیس بدعنوان ملازم پکڑے اور انہیں سزا دلوائی۔ یہ ملازم کمپنی کا مال چوری کیا کرتے تھے۔ ریلوے والوں کے پاس ان پولیس ملازمین کے لیے شکائیت کوئی نہیں تھی' پہلے سال وہ کیمپوں اور عارضی ڈھاروں میں رہتے رہے مگر یہ کیمپ وغیرہ بھی ریلوے والوں نے واپس لے لئے نتیجہ یہ کہ پولیس والے بیزار ہوگئے تا ہم بعد میں انسپکٹر جنرل نے یہی رہائش گاہیں ان کے لئے حاصل کر لیں۔

1870ء میں دریائے بیاس پر پل ٹوٹ گیا۔ ٹریفک خراب ہوئی مگر پولیس والوں نے اعلیٰ کارکردگی دکھائی' کوئی چوری چکاری یا اس قسم کی واردات نہیں ہوئی۔ 1875ء تک ریلوے کی چوری میں پچاس فی صد تک کمی ہوگئی تھی۔ 1877ء کے قحط میں شیر شاہ ریلوے سٹیشن بند کر دیا گیا تھا اور آخری سٹیشن ریاست بہاول پور میں اچ کو بنا لیا گیا تھا جہاں پولیس نے اچھی کارگزاری کا مظاہرہ کیا۔ 1879ء میں ریلوے لائن لاہور سے جہلم تک کھول دی گئی اسی سال مزید پندرہ میل کی پٹڑی رتیال تک کھولی گئی' اب اس لائن پر بھی ریلوے پولیس کی ضرورت تھی۔ چنانچہ کام بڑھ گیا۔ 1880ء میں ریلوے میں ایک اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ مقرر کیا گیا۔ اگلے چار سالوں میں ریلوے پٹڑی کی لمبائی ڈیڑھ ہزار

میل تک بڑھ گئی، تین اور اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ رکھے گئے۔

ریلوے پولیس کا کام بڑھ گیا اس لئے ریلوے پولیس کے اسسٹنٹ انسپکٹر جنرل کرسٹی نے واچ اینڈ وارڈ کو جرائم کی تفتیش سے متعلق پولیس سے علیحدہ کر دیا۔ مسافر گاڑیوں کے ساتھ حفاظتی پولیس کے دستے چلائے جاتے۔ سندھ ساگر سیکشن (سرگودھا، جہلم، بنوں، ڈیرہ اسماعیل خان، مظفر گڑھ وغیرہ) بھی ڈسٹرکٹ پولیس کی بجائے ریلوے پولیس کو مل گیا۔ سندھ ریلوے پولیس کا کنٹرول بھی پنجاب ریلوے پولیس کو دے دیا گیا جو بعد میں سندھ صوبہ کو واپس کر دیا گیا کیونکہ اس کے بارے میں 1895 میں ایک اسسٹنٹ انسپکٹر جنرل پولیس واربرٹن (اس کا تفصیلی ذکر کسی دوسرے باب میں ملاحظہ فرمائیں) نے اعتراض کیا تھا۔ بہاول پور کے حصے کی نگرانی بھی ریاست کو دے دی گئی۔ ون یونٹ بننے اور اس کے بعد سے ریلوے پولیس دو ڈویژن میں تقسیم ہے ایک لاہور ڈویژن اور دوسری کراچی ڈویژن۔

ریلوے والوں کے ہاں چوری کی عجیب وغریب وارداتیں ہوتیں جن میں خود ریلوے والے بھی ملوث ہوتے چنانچہ سندھ میں 1919ء میں پولیس کو چوروں پر کئی بار گولی چلانی پڑی۔ اکثر واردات یوں ہوتی تھی کہ سامان والی ایک ویگن کو کسی ریلوے سٹیشن پر چلنے کے ناقابل قرار دے دیا جاتا۔ اسے گاڑی سے الگ کر لیا جاتا اور کسی بہانے سائیڈ لائن پر لگا دیا جاتا پھر اس میں سے سامان نکال لیا جاتا۔ ایسی کئی ویگنیں لاپتہ بھی ہوگئیں جو بعد میں ویران کونوں میں پٹڑی پر کھڑی مل گئیں۔ 1920ء میں پہلی جنگ عظیم کے بعد ضروری اشیاء بہت مہنگی ہوگئیں تو لوٹنے والے بڑے دلیر ہوگئے۔ لاہور چھاؤنی کے ریلوے سٹیشن پر لوٹنے والوں اور پولیس کے درمیان بڑا زبردست مقابلہ بھی ہوا تھا۔

کریمنل انوسٹی گیشن ڈیپارٹمنٹ:

جسے عرف عام میں سی آئی ڈی بھی کہتے ہیں پاکستان کے علاقے میں ایک طویل عرصہ تک قائم نہیں ہوا۔ ہوتا یہ تھا کہ عام سراغ رساں، کھوجی اور کچھ پچھلی اطلاعات اور تجربے کی بنا پر عام پولیس والے بھی یہ کام کیا کرتے تھے مگر یہ تفتیش کسی قاعدے قرینے کے مطابق کم ہی ہوتی تھی، لندن میں 1878ء تک ایسا کوئی شعبہ یا محکمہ نہیں بنایا گیا تھا۔

حالات وہاں بھی زیادہ مختلف نہیں تھے۔ یہ شعبہ کھولنے کی سفارش بھی 1902ء والے پولیس کمیشن نے کی۔ کمیشن نے کہا کہ اس قسم کا شعبہ نہ ہونے کے باعث ایک ضلعے کا ایس پی دوسرے ضلعوں کے جرائم اور تفتیش سے بے خبر ہوتا ہے ویسے بھی ان ضلعی افسروں میں قریبی رابطہ اور تعاون ضروری ہے نئے محکمہ کے لئے تجویز یہ کیا گیا کہ یہ صرف خاص قسم کے جرائم کے بارے میں کام کرے گا اور جو جرائم بڑے قاعدے قرینے اور اجتماعی طور پر ہوتے ہیں ان کے بارے میں اطلاعات اکٹھی کرے گا اور باقی ضلعوں کو بھی فراہم کرے گا۔ کمیشن نے یہ سفارش کی تھی کہ اس محکمہ کا سربراہ ڈپٹی انسپکٹر جنرل ہونا چاہئے جس کے پاس ریلوے پولیس کا شعبہ بھی ہو۔

پنجاب میں یہ محکمہ ایڈورڈلی فرنچ (Edward Lee French) کی سر براہی میں 1905ء میں قائم ہوا۔ اسی میں سیکرٹریٹ کی پریس برانچ اور سپیشل برانچ بھی مدغم کی گئی اور پولیس کے تربیتی سکول کا انتظام بھی اس شعبے کو دیا گیا۔ انہی دنوں پنجاب میں سیاسی حالات کچھ دگرگوں ہونے لگے تو سپیشل برانچ میں توسیع ہونے لگی اور ریلوے پولیس کو اس شعبہ سے الگ کر دیا گیا۔ انہی دنوں سکھ مصلحین کے وسیع پیمانے پر قتل (گوردوارہ کیس) کی انکوائری کے لئے شاہی قلعہ میں ایک عدالتی کمرہ اور اس کے ساتھ چھوٹا سا جیل خانہ (ایک کمرے کا) بنایا گیا جو بعد میں شاہی قلعہ میں پوچھ گچھ کا بد ترین مرکز بنا۔ اسے 1989ء میں نواز شریف نے پنجاب کے وزیر اعلیٰ کے طور پر ختم کیا۔

یہاں سب سے مشکل نوعیت کا پہلا کیس جو سی آئی ڈی کے پاس لایا گیا وہ ایک یورپی لڑکی کا تھا جسے ایک اینگلو انڈین شولڈم نے قتل کر دیا تھا۔ اس کے بعد یہاں سے بے شمار اہم اور بڑے بڑے واقعات کی تفتیش اور پوچھ گچھ ہوئی ان میں فرقہ ورانہ فسادات' بم چلانے کی وارداتیں' جعلی کرنسی بنانے کے کیس اور سازشیں شامل تھی۔ اسی جگہ پر معروف سیاسی کارکن ناصر پولیس کے تشدد سے جان بحق ہوا۔

اسی شعبے کے لئے ایک مددگار شعبہ فنگر پرنٹ بیورو کی شکل میں سامنے آیا۔ کچھ پولیس والوں اور کچھ دوسرے عالموں کا خیال تھا کہ ہر شخص کی انگلیوں کے نشان دوسروں سے مختلف ہوتے ہیں اسی لئے جرائم کی تفتیش میں یہ نشان بہت مفید ثابت ہوسکتے ہیں۔ انگریز پولیس نے شروع میں نہ تو لندن میں کان دھرا اور نہ ہی ہندوستان میں۔ البتہ چین

والے اس فن کے سینکڑوں سالوں سے شنا سا تھے اور غالباً استعمال میں بھی لاتے تھے۔ انگلستان میں یہ کوشش دیر سے ہو رہی تھی۔ مگر حکومت نے 1900 میں جا کر توجہ دی جب اس مقصد کے لئے پارلیمان کی طرف سے ایک کمیٹی بنائی گئی۔ فنگر پرنٹس کے ماہر کو لندن پولیس میں بطور کمشنر بھرتی کر لیا گیا۔ اور 1901ء سے سکاٹ لینڈ یارڈ میں فنگر پرنٹ بیورو کھول دیا گیا۔ انگلیوں (کی پوروں) کے نشان حاصل کرنے کے طریقے سے پہلے مجرموں کے جسم کے مختلف حصوں کی لمبائی چوڑائی کی تفصیل ریکارڈ کی جاتی تھی۔ اس طرح مجرم کی تلاش میں اس ریکارڈ سے مدد لی جاتی یہ بھی ایک طرح سے ایک شعبہ ہی تھا جو پنجاب میں معروف مرکز پھلور (ضلع جالندھر) ٹریننگ سکول میں کھولا گیا تھا وہیں پر ہی فنگر پرنٹ بیورو کھولا گیا۔ دو تین سال دونوں طریقے ساتھ ساتھ آزمائے گئے مگر واضح ہوا کہ انگلیوں کے نشانات کا طریقہ بہت موثر ہے اور اس کی موجودگی میں جسم کی پیمائش والے ریکارڈ کی کوئی ضرورت نہیں رہی اس طرح جسم کی پیمائش والا شعبہ ختم ہو گیا۔

صوبہ سندھ میں بھی' جو ان دنوں صوبہ بمبئی کا حصہ تھا یہ بیورو 1902ء میں قائم کر دیا گیا تھا۔ دو تین سال کے اندر پورے ہندوستان میں بہت سے ایسے بیورو بنا لئے گئے مگر پھلور کا بیورو بہت مشہور ہوا اور یہاں بڑی بڑی نو آبادیات کے دور دراز علاقوں سے پولیس والے تربیت لینے آتے تھے۔ پنجاب میں ایک اور کام بھی کیا گیا کہ سزا یافتگان یا ملزموں کے صرف انگوٹھوں اور انگلیوں کے نشانات ہی نہیں لئے جاتے جیل والوں سے قیدی کے بارے میں ایک کارڈ بھی پر کروایا جاتا تھا اس میں ملزم یا مجرم کے جیل میں آنے' اس کے قیام یا تبادلے اور رہائی تک کی سب تفصیل درج ہوتی تھی' جہاں جہاں سزایافتہ قیدی جاتا تھا (مثلاً دوسرے جیل خانے میں) یہ کارڈ اس کے ساتھ ساتھ وہاں جاتا تھا اور جب وہ رہا ہو جاتا تو یہ کارڈ فنگر پرنٹ بیورو کے پاس واپس آ جاتا اس کی اطلاع مجرم کے علاقے کے تھانے میں بھیج دی جاتی جو وہاں کی پولیس کے لئے بڑی مددگار ثابت ہوتی۔ پولیس کو فنگر پرنٹ نئے کیسوں میں بھی مدد دیتے تھے۔ مثلاً ایک شخص نے کوئی چوری کی ہے اور اس کے ہاتھوں کے نشانات وہاں پر رہ گئے ہیں' یہ نشانات خاص طریقے سے کاغذ پر اٹھا لئے جاتے اور پھر پھلور کے فنگر پرنٹ بیورو کو بھیجے جاتے کہ کیا یہ نشان سزایافتہ مجرم کی انگلیوں کے نشانات تو نہیں۔ اس طرح کئی مجرموں کا سراغ لگ جاتا مزید تفصیل اس کے

بارے میں تیار کئے گئے ریکارڈ سے حاصل ہو جاتی۔

این۔ اے۔ رضوی نے اپنی کتاب میں فنگر پرنٹس کے بارے میں بعض دلچسپ واقعات نقل کئے ہیں' 1914ء میں پھلور کے تربیتی سکول سے چاندی کا ایک سپورٹس کپ غائب ہو گیا۔ ملزم نے کپ لینے کے لئے شیشے کو توڑا تھا چنانچہ انکشاف ہونے پر بیورو نے شیشے کے سارے ٹکڑے جوڑے تو ملزم کے انگلیوں کے نشان اس پر رہ گئے تھے ۔ بیورو نے دیکھا کہ یہ نشانات پھلور میں ہی پولیس بینڈ کا بگل بجانے والے زیر تربیت نوجوان کی انگلیوں کے نشانات سے ملتے ہیں۔ اس سے اگلے سال سیل بند انشورڈ رجسٹرڈ لفافے میں سے ایک سو روپے کا کرنسی نوٹ غائب ہو گیا تھا۔ اس پر سیل بظاہر ٹھیک لگتی تھی مگر جب ماہرین نے دیکھا تو انہیں شبہ ہوا کہ سیل سے کوئی کارروائی کی گئی ہے اور اس پر کچھ نشانات بھی ہیں ۔ یہ نشانات خانپور کے پوسٹ ماسٹر کے انگلیوں کے نشانات سے ملتے تھے اور پوسٹ ماسٹر نے تسلیم کیا کہ اس نے سیل ہٹا کر اندر سے پیسے نکال لئے تھے اور پھر سیل کو گرم کر کے وہیں چپکا دیا تھا۔

1947ء میں سیالکوٹ چھاؤنی کے فوجی سنٹر میں ایک شخص قتل ہو گیا۔ معائنہ کرنے پر ایک خون آلود چاقو برآمد ہوا۔ جس پر جمے خون کے اوپر کچھ ہاتھوں کے نشانات بھی تھے ۔ ان کا معائنہ کیا گیا' سنٹر کے باقی لوگوں کی انگلیوں کے نشانات لئے گئے تو اصل ملزم بلکہ مجرم محمد حسین پکڑا گیا۔ کیونکہ اس کے انگلیوں کے نشانات ہی اس چاقو پر جمے خون پر موجود تھے۔ لاہور شہر میں ایک سرکاری افسر کے گھر میں چوری ہوئی۔ چوروں نے اس وقت گھر میں موجود واحد خاتون کو باندھ دیا تھا اور اس کے بعد وہ ضروری سامان لے کر چلتے بنے۔ ہوا یہ کہ ایک الارم پیس پر انگلیوں کے نشانات لگ گئے ان نشانات سے مجرموں کا پتہ چلایا گیا ۔ ہزارہ میں ایک شخص کی لاش پائی گئی۔ سر نہیں تھا ایک ہاتھ کٹا ہوا تھا اور دوسرا سلامت تھا' اس کی انگلیوں کے نشانات لے لئے گئے اور فنگر پرنٹ بیورو سے پتہ چلایا کہ یہ لاش ایک سابق سزایافتہ مجرم کی تھی۔

ایک مرتبہ لاہور میں نقب زنی اور چوری کی بہت وارداتیں ہوئیں' مجرموں کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔ دباؤ میں آ کر پولیس نے کوئی ڈیڑھ دو سو کے قریب مشتبہ افراد کو گرفتار کر لیا۔ جہاں جہاں وارداتیں ہوئیں وہاں وہاں سے انگلیوں کے نشانات اکٹھے کئے

گئے تو پتہ چلا کہ تمام وارداتیں فرد واحد نے کی ہیں اور جن لوگوں کو پکڑا گیا ہے ان کا ان وارداتوں سے کوئی تعلق نہیں ۔ اس ریکارڈ کو دیکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ شخص دہلی کا رہنے والا تھا وہاں سے کراچی آ کر آباد ہوا اور وہیں پر اسے گرفتار کیا گیا۔

پھلور کا فنگر پرنٹ بیورو بہت بڑا ادارہ تھا۔ اسے چار آدمیوں نے شروع کیا۔ اکتیس برس بعد اس میں پینتیس افسر اور اہل کار تھا جن کا سربراہ ایک ڈی ایس پی تھا' یہ بیورو پنجاب' پنجاب کی ریاستوں' دہلی' صوبہ سرحد اور بلوچستان کی ضرورتیں پوری کرتا تھا۔ تھوڑی سی نگرانی پولیس ٹریننگ سکول کا پرنسپل کرتا مگر یہ انوسٹی گیشن کے ڈپٹی انسپکٹر جنرل کے ماتحت تھا۔ آزادی سے قبل پھلور کا بیورو ہر سال کوئی تیس ہزار افراد کے فنگر پرنٹ جمع کرتا اور باہر سے آنے والے فنگر پرنٹس کے بارے میں اپنی تحقیقات سے باخبر کرتا۔ ایک وقت تھا کہ یہ بیورو دیوانی یا فوجداری مقدمات میں انگوٹھوں کے نشانات کے بارے میں فیس کی مد میں چالیس ہزار روپیہ کمایا کرتا تھا۔

آزادی کے بعد نذیر احمد رضوی نے جو سی آئی ڈی میں سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے اسی بیورو کا لاہور میں از سر نو قائم کرنے کا فیصلہ کیا کیونکہ پھلور تو مشرقی پنجاب میں رہ گیا البتہ وہاں کے فنگر پرنٹ بیورو کے مسلمان ماہرین کو ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ مہر چند سیٹھی نے کمال حکمت سے بچالیا اور بخیروخوبی پاکستان بھیج دیا۔ یہ لوگ ستمبر 1947ء میں لاہور پہنچے مگر نہ یہاں ان کا فنگر پرنٹ بیورو تھا' نہ کوئی دفتر' نہ رہنے کے لئے مکان اور نہ کوئی ڈیوٹی۔ نذیر احمد رضوی نے ہی نیا بیورو قائم کرنے کی کوشش شروع کر دی اور پھلور سے آئے انسپکٹر خوشی محمد خان کی تجویز پر ڈسٹرکٹ (مغربی پنجاب) ہیڈ کوارٹروں سے مجرموں کے انگلیوں کے نشانات کی نقلیں منگوائی گئیں' خوشی محمد نے جب کام شروع کیا تو اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا یعنی نہ کرسی' نہ میز' نہ قلم' دوات مگر اس نے اور اس کے ساتھیوں نے ایسے جوش اور جذبے کا مظاہرہ کیا کہ آٹھ ماہ کے اندر اندر مغربی پنجاب کے اضلاع کے سزا یافتگان کے نشانات اکٹھے ہو گئے مگر مشرقی پنجاب اور دوسرے علاقوں سے جو سزا یافتہ مجرم آئے تھے اور جو مختلف علاقوں میں چلے گئے تھے ان کی انگلیوں کے نشانات اکٹھے نہ ہو سکے۔ پھلور والوں کے لئے فنگر پرنٹس فراہم کرنا مشکل تھا تاہم انہوں نے یہ مہربانی کی کہ وہاں کے جیل خانوں سے مجرموں کے بارے میں جو ریکارڈ موجود تھا وہ لاہور میں فنگر پرنٹ بیورو کو بھیج

دیا اور یہ کام تھا۔ یہ جیل سلپیں اکتالیس ہزار تھیں۔

فنگر پرنٹ والوں کو ایک اور مشکل کام درپیش تھا کہ 1949ء میں ہندوستان نے ان انیس ہزار مجرموں کی ہسٹری شیٹیں اور ذاتی فائلیں بھیج دیں جو نقل مکانی کر کے پاکستان چلے آئے تھے ۔ چونکہ نہیں معلوم تھا کہ یہ لوگ کہاں آباد ہوئے اس لئے ان میں صرف چوبیس سو شیٹیں ان متعلقہ پولیس سٹیشنوں کو بھیج دی گئیں جن کا ان مجرموں سے کسی نہ کسی صورت واسطہ پڑا تھا۔ باقی کی سلپیں بیورو کے پاس پڑی ہیں۔

ون یونٹ بننے کے بعد کراچی میں کام کرنے والا سندھ فنگر پرنٹ بیورو لاہور کے بیورو میں مدغم کر دیا گیا۔ وہاں سے پچھتّر ہزار پرنٹ ملے جبکہ پنجاب کے بیورو نے تیس لاکھ پرنٹ تیار کر لئے تھے۔ ون یونٹ کے خاتمے کے بعد یہ فنگر پرنٹ بیورو پھر تقسیم ہو گئے بہرطور یہ قیمتی سرمایہ پنجاب پولیس کے پاس جمع ہوتا چلا جا رہا ہے۔

فورینسک سائنس لیبارٹری:

کبھی اس کا نام فوٹو گرافک لائبریری ہوا کرتا تھا اور یہ کریمنل اور انوسٹی گیشن ڈیپارٹمنٹ کے ایک ضمنی شعبے کی حیثیت سے 1930ء میں وجود میں آیا تھا۔ مقصود یہ تھا کہ فوری طور پر جن دستاویزات کی نقول (عکس) کی ضرورت پڑے وہ اس لائبریری یا لیبارٹری میں تیار کر لی جائیں۔ این۔ اے۔ رضوی کے کہنے کے مطابق ایک کیمرہ مین محمد خورشید احسن نے یہ شعبہ ایک معمولی سے کیمرے اور متعلقہ اشیا کے ساتھ شروع کیا۔ اس سے پہلے ہوا یہ تھا کہ جب شہید بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں نے ایس پی سکاٹ کے دھوکے میں انگریز اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس سائنڈرس (موجودہ ایس ایس پی کے دفتر کے سامنے) کو گولی ماردی تو یہ معلوم کرنے کے لئے پنجاب پولیس کے پاس کوئی سامان نہیں تھا کہ واردات میں کون سا اسلحہ اور گولی وغیرہ استعمال ہوئی ہے ؟ غالباً پورے ہندوستان میں نہ کوئی لیبارٹری تھی نہ ماہرین تھے چنانچہ لندن سے ماہر بلوایا گیا جو مائیکرو سکوپ بھی ساتھ لایا یہ مائیکروسکوپ یہیں چھوڑ گیا اور اس مائیکروسکوپ نے ہی دراصل یہ شعبہ کھلوایا جس کا پہلا ساز و سامان یہی مائیکروسکوپ تھی۔

1935ء میں فوٹوگرافی کی لائبریری یا لیبارٹری کا انچارج ایک سائنسدان ڈی۔

این۔ گوائل کو بنادیا گیا جو گولہ بارود وغیرہ کا ماہر تھا۔ گوئل نے فوٹو گرافی کے شعبے کو ایسی لیبارٹری میں تبدیل کر دیا جو جرائم کا سراغ لگانے اور تفتیش میں بڑی مدد دیتی تھی۔ پہلے سال اس نے کیمرہ اور فوٹو مائیکروسکوپ کی مدد سے تقریباً سو کیسوں کے بارے میں تفتیشی کام کیا۔ 1937ء اور 1940ء کے درمیان ڈی آئی جی (کرائمنر) سرجان بینٹ نے اس نئے کام میں بڑی دلچسپی لی اور لیبارٹری کو الٹرا وائلٹ اور انفرا ریڈریز' ایک اور مائیکرو سکوپ اور کچھ اور سامان لے کر دیا۔ جگہ بھی اور دی گئی۔ اس میں ایک کیمیکل سیکشن کا اضافہ کیا۔ اس طرح شبے والے سازو سامان کا معائنہ کیا جاتا۔ ان پر لگے نشانات سے ملزموں تک پہنچنے کی کوشش کی جاتی۔ فوٹو گرافک سیکشن ضلع امرتسر اور شملہ میں بھی اس میں دلچسپی پیدا کی جائے۔ عدلیہ اور شعبہ طب کے افسروں کو خاص طور پر لیبارٹریز میں بلا کر دکھایا جاتا کہ یہاں کس طور کام ہوتا ہے اور کس طور معاملات کا سراغ لگایا جاتا ہے۔ اور ایک مرتبہ یہ کارگزاری ہائی کورٹ کے ججوں کو بھی دکھائی گئی۔ گوئل نے ایک مرتبہ امرتسر میں ایک سیاسی مظاہرے کی فلم بھی بنائی جو حکومت کے لئے خاصی مددگار ثابت ہوئی۔ لیبارٹری میں اسلحہ' کپڑوں' سکول' جعلی کرنسی' مختلف قسم کی سیاہیوں' ہاتھ سے یا ٹائپ میں لکھی تحریر وغیرہ کا تجزیہ کیا جاتا اور ساتھ ساتھ لیبارٹری نے تربیت دینے کا کام بھی سنبھال لیا۔ 1947ء کے آس پاس اس لیبارٹری کو سالانہ پانچ ہزار استفسارات آنے شروع ہوگئے یعنی کام بہت بڑھ گیا مگر ہوا یہ کہ آزادی کے بعد گوئل بھارت چلا گیا۔ اور اس لیبارٹری سے خاصا عرصہ کوئی کام نہ لیا جاسکا۔ 1948ء کے آخر میں ایک ماہر عبدالمجید قریشی نے کام سنبھال لیا۔ اب غالباً باقی سبھی صوبوں میں بھی اس قسم کی لیبارٹریاں بن چکی ہیں اور ان کے سربراہوں کے عہدے بھی بڑھادئے گئے ہیں۔

فرنٹیئر کانسٹیبلری:

فرنٹیئر اپریل 1913ء میں قائم کی گئی جو دراصل بارڈر ملٹری پولیس ختم کر کے قائم کی گئی تھی۔ ملٹری پولیس 1879ء میں قائم کی گئی تھی۔ اسی طرح 1917ء میں شبقدر کا مہمند ملیشیا بھی اس میں مدغم کر دیا گیا۔ ایک مرحلے پر اس میں کچھ تخفیف کی گئی مگر پھر اس میں ہمیشہ توسیع ہی ہوتی رہی۔ اگر چہ فرنٹیئر کانسٹیبلری چلاتے پولیس افسر ہی ہیں مگر اس کا پولیس

سے تعلق کوئی نہیں ۔ اس کی کارکردگی اور فرائض ملیشیا سے ملتے جلتے ہیں۔ اس میں انفنٹری زیادہ ہوتی ہے کچھ سوار بھی ہوتے ہیں ۔ چند قبائل کو چھوڑ کر باقی سارے پٹھان قبیلے اس فورس میں بھرتی ہیں۔ کام یہ ہوتا ہے کہ اس نے علاقوں میں ایسی جگہوں پر پوسٹیں قائم کی گئی ہوتیں ہیں۔ جو ایک دوسرے کے رابطے میں ہوتی ہیں اور یہ جرائم پیشہ افراد یا حملہ آور گروہوں کو تاڑتے' انہیں روکتے اور پکڑتے ہیں۔

پولیس والے کام بالکل نہیں کرتے تاہم اگر پولیس کو اس کی ضرورت ہوتی ہے تو اس کی مدد کو بھیج دی جاتی ہے۔ مثلاً کسی بستی میں کچھ اشتہاری یا مفرور سر ملزم چھپ گئے ہیں انہیں پکڑنے کے لئے آبادی کے گھیراؤ میں سے مدد لی جاتی ہے۔ 1942ء میں کنسٹیبلری کا کچھ حصے صوبہ بہار میں فرقہ وارانہ فسادات پر کنٹرول کرنے کے لئے اور بعض حصے سندھ میں مرحوم پیر پگاڑا کے پیرو کاروں سے نمٹنے کے لئے بھیجے گئے۔ 1947ء سے 1951ء تک بعض پلاٹونوں نے سیالکوٹ بارڈر پر ڈیوٹی دی 1948ء میں اس کی دس پلاٹونوں نے وادی گلگت میں فرائض سر انجام دیئے ۔ 1951ء میں کی کچھ پلوٹونوں کو کراچی کی آب وہوا میں فرائض کی ادائیگی کے لئے اس نیت سے بھیجا گیا کہ یہ مقامی پولیس کے لئے ایک مثال بن جائیں گی اور مقامی پولیس کا ڈہلی وغیرہ چھوڑ دے گی۔ ایک زمانے میں سردیوں میں افغانستان کی طرف سے آنے والے ہزاروں پاوندوں کی نگرانی کانسٹیبلری ہی کرتی تھی تاہم اب عرصہ دراز سے افغان بارڈر پر معاملات کی صورت بدل گئی ہے۔

کنسٹیبلری اپنے قیام سے لے کر اب تک خاصی مستعدی سے اپنے فرائض انجام دیتی رہی ہے اور پولیس والوں کے بقول اس نے خاصا نام کمایا ہے۔ کانسٹیبلری کی بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ ہر وقت کارروائی کے لئے تیار رہتی ہے' جوانوں نے متوقع ہنگامی حالت کے پیش نظر اپنی خوراک ہر دم اپنے پاس رکھی ہوتی ہے۔ یہ لوگ ضرورت پڑے تو خود ہی سڑکیں بنا لیتے ہیں اور جہاں ان کا تبادلہ کیا جائے وہاں اپنے جھونپڑے بھی خود ہی بنا لیتے ہیں کانسٹیبلری کے جوان ہمیشہ خطرے کی زد پر رہتے ہیں مگر روائتی پٹھانوں کی طرح گوریلا طریق جانتے ہیں اس لئے ہر مشکل وقت میں کارنامے دکھا جاتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ جہاں کہیں رہیں مقامی لوگوں سے بڑے اہتمام سے دوستانہ تعلقات بنا لیتے ہیں یوں ان کو مقامی آبادی کی طرف سے بھی فرائض انجام دینے ہیں بری مدد مل جاتی ہے۔

صوبائی مسلح ریزرو:

1928ء میں یہ محکمہ کھولا گیا' اسے ایڈیشنل پولیس کا نام دیا گیا۔ مراد یہ تھی کہ کسی ضلع میں ہنگامی صورت میں یہ نفری بھیجی جا سکے۔ اس کے قیام سے پہلے فرقہ وارانہ فسادات بھی ہونے لگے تھے' مختلف فرقوں میں کشیدگی بھی رہتی سیاسی سرگرمیاں بھی بڑھ گئی تھیں اور ان کاموں میں دہشت گردی بھی عام تھی (یہ ان دنوں کی بات ہے جب بھگت سنگھ گروپ بہت سرگرم تھا) چنانچہ یہ نفری بنائی گئی۔ شروع میں اس کا سربراہ اے ایس پی ہوتا تھا مگر 1948ء میں ایک سپرنٹنڈنٹ اس کا سربراہ بنایا گیا۔ اسی زمانے میں پنجاب میں فرنٹیئر کنسٹیبلری کی اعلیٰ کارکردگی بنا پر اس کا نام بھی ویسٹ پنجاب رکھ دیا گیا۔ ون یونٹ بنائے جانے کے بعد اس میں صوبہ سرحد کی ایڈیشنل پولیس ریاست بہاول پور اور ریاست خیر پور کی پولیس اور سندھ کی ریزرو ایڈیشنل پولیس مدغم کر دی گئی اور اس کا نام پرونشل آرمڈ ریزرو رکھ دیا گیا۔ یہ خاصی بڑی فورس تھی اور اس کی تربیت اور کارکردگی کو اس اعتبار سے تیار کیا گیا تھا کہ اسے انتہائی غیر معمولی حالات میں ایک دم آپریشن کرنا ہے اور معاملات کو معمول پر لانا ہے۔ ایک زمانے میں اس فورس میں آٹھ گزٹیڈ افسر (آج کے گریڈ سترہ اور اس سے اوپر کے گریڈ کے) اور کوئی سات ہزار کے قریب باقی عہدیدار اور اہل کار تھے۔ انتظامی طور پر اسے تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا' جو مختلف جگہوں پر متعین کئے جاتے تھے۔ انسپکٹر جنرل کا دستہ بہر طور لاہور میں رکھا جاتا تھا۔

اس فورس میں ریٹائرڈ فوجی سپاہی بھرتی کئے جاتے جو پہلے ہی منظم اور ڈسپلن سے باخبر ہوتے مگر دوسری جنگ عظیم کے درمیان افرادی قوت کا یہ وسیلہ بند ہوگیا۔ اس لئے نوجوانوں کو اس میں شامل کر کے انہیں خود کار ہتھیاروں کا استعمال سکھایا جاتا۔ پیریڈ وغیرہ ہوتی آگ بجھانے اور سول ڈیفنس کی تربیت دی جاتی۔ اس فورس کا ایک بڑا حصہ 1960ء میں تخفیف کی زد میں آ گیا لیکن اضلاع میں عام پولیس کی نفری میں اضافے کی تجویز کے بعد ان لوگوں کو وہاں کھپایا گیا اور انہیں نئے سرے سے تربیت دی گئی تا کہ یہ عام پولیس ہی کی طرح اپنا رویہ وضع کر سکیں۔

سندھ میں پرونشل آرمڈ ریزرو کی ابتدائی صورت: وہ معمولی سی فورس تھی جو سکھر

میں 1939 ء میں منزل گاہ کے فرقہ وارانہ جھگڑے کے باعث کھڑی کی گئی تھی ۔ پھر اسے سندھ پولیس رائفلز بنایا گیا جس کا بعد میں رینجرز نام رکھا گیا۔ اس فورس کے ذریعے دراصل فوج کو سندھ سے واپس ملانا تھا جسے 1941ء میں پیر پگاڑہ کے حروں کو دبانے کے لئے متعین کیا گیا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد ان رینجرز کو سرحدوں پر بھیج دیا گیا اور ان کی جگہ ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کے لئے سپیشل سندھ بنائی گئی بعد میں اسی کام پر نیشنل آرمڈ ریزرو رکھا گیا۔

سپیشل پولیس اسٹیبلشمنٹ:

دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو محکمہ دفاع کو بے شمار اشیا کی ضرورت پڑی ۔ ان کی سپلائی ٹھیکیداروں اور تاجروں کے ذریعے ہوتی' اس سپلائی کے کام میں پریشان کن حد تک بدعنوانیاں شروع ہوگئیں۔ کئی فراڈ ہوئے۔ انہیں روکنے کے لئے 1941ء میں یہ فورس بنائی گئی جس کا سربراہ ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس تھا۔ یہ فورس صرف مرکزی حکومت کو جوابدہ تھی' ڈپٹی انسپکٹر جنرل سے کہا گیا کہ وہ ان ساری خرابیوں کی وجہ دریافت کریں اور وسیع پیمانے پر تفتیش کر کے حالات کو بہتر بنائیں۔

جب پولیس کے خصوصاً تفتیش کے کچھ فرائض اس پولیس کے ذریعے مرکزی حکومت نے خود لے لئے تو اس پر اعتراضات بھی ہوئے۔ مقدمہ بازی ہوئی مگر مرکزی حکومت نے پہلے آرڈی نینس اور پھر قانون (دہلی سپیشل پولیس ایکٹ 1946ء) کے ذریعے جواز مہیا کر دیا۔ پھر اس پولیس کی شاخیں صوبوں میں بھی کھولی گئیں اور اس کے اختیار کی توسیع ریاستی حدود میں ریلوے لائنوں اور مرکز کے زیر اختیار دوسرے علاقوں تک کر دی گئی۔

قیام پاکستان کے بعد 1948ء میں قانون کے ذریعے یہ پولیس دوبارہ کھڑی کی گئی۔ اس کا سربراہ انسپکٹر جنرل پولیس تھا جبکہ اس کے سب انسپکٹر کو تھانیدار (ایس ایچ او) کے برابر اختیار دیئے گئے ۔ اس فورس کو اختیار دیا گیا کہ وہ بدعنوانی اور رشوت کی روک تھام کرے۔ جن سرکاری ملازموں نے ناجائز طریقے سے جائیدادیں بنائی ہیں انہیں ضبط کرے' رشوت کے سلسلے میں نیا قانون بنا کر انہیں اور اختیار دیئے گئے اور پھر ایسے

مقدمات کے جلد فیصلے کے لئے سپیڈی ٹرائل کورٹس بنائی گئی۔

پاکستان میں اس فورس کا پہلا سربراہ خان قربان علی خان کو بنایا گیا۔ ان کے انسپکٹر جنرل پنجاب بن جانے پر دوسرے نمبر پر اعتزاز الدین انسپکٹر جنرل بنے جو ایک ہوائی حادثہ میں مارے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ ان دنوں وہ لیاقت علی خان کے قتل کیس کی تفتیش کر رہے تھے۔ اعتزازالدین احمد کے بارے میں پاکستان کے ایک سابق آڈیٹر جنرل مشتاق احمد کی کتاب ''ہنگاموں میں زندگی'' میں سے مندرجہ ذیل اقتباس پاکستان کی سیاسی تاریخ۔ جلد چہارم زاہد چودھری صفحہ نمبر 333 سے پیش کیا جاتا ہے۔

''پنجاب کے انسپکٹر جنرل پولیس (خان قربان علی خان) وزیراعظم کی حفاظت کے ذمہ دار تھے۔ انہوں نے جس طرح اپنے فرض کو انجام دیا اس کے عوض میں وہ ترقی کر کے بلوچستان میں گورنر جنرل کے ایجنٹ بنا دیئے گئے۔ جس افسر نے قاتل کو گولی مار کر موقعہ پر ہی ہلاک کر دیا تھا اور اس طرح تحقیقات ناممکن بنادی تھی اس کو ترقی پر ترقی ملتی رہی۔ اعتزاز الدین صاحب مرحوم انسپکٹر جنرل پولیس تھے۔ ان کے سپرد اس معاملے کی تحقیق ہوئی ان سے پوچھا تو کچھ نہیں بتایا صرف اتنا کہ میاں موت سر پر کھیل رہی ہے۔ آخر دوران سفر ہوائی جہاز کے حادثے کا شکار ہوئے۔ ان کے ساتھ کاغذات بھی تباہ ہوئے جو اس مسئلہ پر روشنی ڈال سکتے تھے۔ اعتزاز الدین احمد کے علاوہ معروف پولیس افسر میاں انور علی، این عالم اور اے بی اعوان بھی اس کے سربراہ رہے۔

محکمہ انسداد رشوت ستانی:

یہ محکمہ شروع (1948ء) میں سندھ میں قائم کیا گیا مدعا یہ تھا کہ سرکاری ملازموں میں سے رشوت کی لعنت ختم کی جائے۔ اسی سال پنجاب میں بنا ' ٹوٹا' پھر 1949ء میں بنا' بہاول پور میں 1949ء میں بنا۔ اس کے بعد صوبہ سرحد میں بھی وجود میں آ گیا۔ محکمہ کا سربراہ سپرنٹنڈنٹ کو بنایا گیا۔ اسے ڈائریکٹر کا نام دیا گیا جو حکومت کے سامنے جوابدہ تھا یعنی پولیس کے ماتحت نہیں تھا۔ 1958ء میں اس محکمہ کے لئے ڈائریکٹر جنرل کی اسامی نکالی گئی اور سی ایس پی افسر کو سربراہ بنادیا گیا مگر 1960ء میں یہ عہدہ ختم کر دیا گیا۔

قومی رضا کار:

1948ء میں آزادی کے بعد کی دہشت و بربریت اور لاقانونیت کے پیش نظر قومی رضا کاروں کی تنظیم بنائی گئی۔ انہیں تھوڑی سی تربیت ہوائی حملہ سے بچاؤ کی دی جاتی ہے ڈرل بھی کرائی جاتی ہے اور ان کا کام پولیس کی مدد کرنا ہوتا۔ بعض قومی تقریبات پر بھی ان سے کام لیا جاتا ہے اور شہری دفاع والے بھی ان کے نام سے مدد لیتے ہیں، اسی طرح 1947ء میں سرحدی حالات کی خرابی کے باعث ہوم گارڈز کے نام سے تنظیم بنائی گئی تھی جو بعد میں بارڈر پولیس کے نام سے موسوم ہوئی۔ ان کا کام سرحدوں پر لاقانونیت اور مشتبہ آمدورفت کو روکنا تھا' اس میں پولیس افسر بھی رکھے گئے مگر 1958ء میں پولیس افسر واپس بلائے گئے اور اس فورس نے آزادانہ طور پر کام شروع کر دیا۔ ان کا نام ستلج رینجرز رکھا گیا اسی قسم کے حالات میں بہاول پور میں ڈیزرٹ رینجرز اور سندھ میں انڈس رینجرز نے جنم لیا۔ ون یونٹ بننے پر اس کا نام ویسٹ پاکستان رینجرز رکھا گیا۔ سربراہ عام طور پر برسرکار بریگیڈیئر یا میجر جنرل ہوتا ہے۔ ون یونٹ ٹوٹنے کے بعد رینجرز کی پہلے والی تنظیمی صورت ہوگئی۔

کتا برانچ:

ڈی آئی جی اظہر حسن ندیم اپنی کتاب "The Punjab Police in a comparative Perspective p 41" میں لکھتے ہیں۔ انگلستان میں تمام پولیس فورسز کے پاس ڈاگ سکواڈ ہیں۔ ان کتوں کو جو مخصوص نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں خاص طور پر تربیت دی جاتی۔ تربیت دینے والے پولیس افسر ہوتے ہیں ۔ یہ کتے گمشدہ ڈاکوؤں' مجرموں کو ڈھونڈ نکالنے اور واردات میں استعمال کی گئی اشیا برآمد یا بازیافت کرنے میں بڑے مددگار ثابت ہوتے ہیں ۔ زیادہ تر کتے لوگ بطور عطیہ پولیس کو دیتے ہیں۔ جرمن شیفرڈ السیشین اس ضمن میں بہترین مانے جاتے ہیں جبکہ لبریڈور میں سونگھنے کی صلاحیت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ انہیں اکثر منشیات کی برآمدگی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ بم اور دوسرا دھماکہ خیز مواد برآمد کرانے میں سپرنگر سپینیلز اچھلتے رہتے ہیں ۔ یہ کتے انچارجوں کے پاس ہی رکھے جاتے ہیں اور عموماً آٹھ سال تک کارآمد ہوتے ہیں۔ اس کے بعد انہیں ان کے مالک یعنی

ان کی سکھلائی کرنے والوں کے سپرد کردیا جاتا ہے۔ ان کے لئے لندن میں ڈاگ ٹریننگ سکول بھی ہیں جہاں عموماً تین ماہ میں ان کی تربیت مکمل ہو جاتی ہے۔

برصغیر میں کتوں سے یہی کام لینے کی کوشش انگریز کے عہد میں کی گئی کہ کتوں کے ذریعے مجرموں کا پتہ چلایا جائے۔ 1940ء سے پہلے پنجاب' سرحد' بمبئی کے انسپکٹر جنرلوں نے یہ تجویز پیش کی ۔ سرحد کے دو افسروں کو تربیت کے لئے جنوبی افریقہ بھیجا گیا۔ ان کی واپسی پر کتے باہر سے درآمد کئے گئے۔ انہیں تربیت دی گئی پشاور میں وہ مفید ثابت ہوئے مگر آب وہوا برداشت نہ کر سکے اور آخر کار اس کی شدت کے باعث یکے بعد دیگرے مرتے چلے گئے۔ اب دونسلوں کو ملا دیا گیا تاکہ دوغلی نسل کا کتا آب وہوا برداشت کر سکے' تجربہ کامیاب رہا۔ پھر کتوں کے یونٹ پنجاب اور سندھ میں بھی قائم کر دئے گئے۔ پشاور میں کتوں کی کارکردگی کی بنا پر چوری اور نقب زنی کی وارداتوں میں نمایاں کمی آگئی مگر اس کام میں مشکلات بہت تھیں۔ سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ مسلمان کتے کو نجس سمجھتے تھے جبکہ ہندوؤں کا مسئلہ یہ تھا کہ چونکہ کتے گوشت کھاتے ہیں اس لئے وہ ان کو چھو بھی نہیں سکتے۔ دوسرے لفظوں میں کتا یونٹ کے لئے افرادی قوت کا مسئلہ پیچیدہ بن گیا۔ کچھ یہ مسئلہ بھی پیدا ہوا کہ کتوں کے انچارجوں نے کہا کہ پولیس والے ہی کتے کو صحیح صحیح معلومات نہیں دیتے اس لئے بعض اوقات کتے جرم کا پتہ چلانے میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ صوبہ سرحد میں 1947ء کے شروع میں ڈاکٹر خان صاحب کی کانگریسی وزارت نے کتا یونٹ ایک قسم کی عیاشی سمجھتے ہوئے بند کردیا' یہاں کے کتے اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ انچارج سانڈرس کے ساتھ سندھ کو دے دیئے گئے لیکن 1951ء میں اخراجات میں بچت کے نام پر یہ یونٹ بند کر دیا گیا۔

پنجاب میں 1945ء کے آخر میں یہ برانچ کھولی گئی' کچھ کامیابیاں بھی حاصل کیں۔ تاہم یہ کتے پشاور میں ہی تربیت پاتے تھے' وہ مرکز ختم ہوگیا۔ دوسرے آزادی سے پہلے اس برانچ کے جو کتے امرتسر اور شملہ بھیجے گئے وہ فسادات کی وجہ سے واپس لاہور نہ لائے جاسکے یوں پنجاب میں بھی یہ شعبہ ختم ہوگیا۔ اب کہیں کہیں فوج کے پاس ایسے کتے ہیں جو وہ اپنے مقصد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

بیورو آتشیں اسلحہ:

پھلور سکول کے ایک پرنسپل نے 1945ء میں اس کی بنیاد رکھی تھی جو ناجائز یا برآمد شدہ اسلحہ اکٹھا کرتا اور پھر انہیں تباہ کر دیا جاتا یا نیلام ۔ یہ شعبہ سی آئی ڈی کا ہی ایک حصہ تھا۔ اب بھی یہ اسی کا حصہ ہے۔ سرحد میں یہ کام ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی نگرانی میں ہے۔ سندھ میں 1958ء سے پہلے ایسے ضبط شدہ اسلحہ کی نیلامی یا فرخت کی اجازت نہیں تھی۔ 1958ء کے بعد اجازت دے دی گئی مگر ضلعی سطح پر جبکہ کوئٹہ میں چھوٹا سا بیورو موجود ہے۔

خواتین پولیس :

این۔ اے۔ رضوی کے کہنے کے مطابق پنجاب میں کسان تحریک کے دوران کسان عورتیں بھی احتجاجی جلسوں جلوسوں میں شریک ہوتیں' انہیں کنٹرول میں رکھنے کے لئے اب مرد پولیس والے کارآمد نہیں رہے تھے کیونکہ کسان تحریک اور سیاسی تحریکوں نے لوگوں میں شعور پیدا کر دیا تھا۔ چنانچہ یکم مئی 1939ء کو لاہور میں سات خواتین کانسٹیبل اور ایک ہیڈ کانسٹیبل بھرتی کی گئی ان کو اسی سال اگست تک ملازم رکھا گیا مگر 1942ء میں سول نافرمانی کی تحریک شروع ہوئی تو خواتین پولیس کھڑی کرنے کی ضرورت بڑھ گئی۔ ہوا یوں کہ دہلی میں کچھ طالبات گرفتار کر کے بذریعہ ریل لاہور بھیجی گئیں۔ انہوں نے لاہور پہنچ کر ٹرین سے اترنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ مرد پولیس کے ساتھ کہیں نہیں جائیں گی چنانچہ فوری طور پر آٹھ کی تعداد میں زنانہ پولیس والیاں بھرتی کی گئیں۔ 1952ء تک پولیس والیوں کی تعداد یہی رہی۔ 1952ء میں ان کی تعداد بڑھا دی گئی۔ سربراہ اسسٹنٹ سب انسپکٹر' دو ہیڈ کانسٹیبل اور پچیس کانسٹیبل 1957ء میں ان کے سربراہ کے طور پر سب انسپکٹر کا اضافہ کی گیا۔

فیصل آباد میں شہری آبادی بڑھنے اور دوسرے عوامل کی بنا پر 1954ء میں گیارہ عورتیں بھرتی گئیں' ایک سال پہلے پشاور میں مستقل طور پر پانچ عورتیں بھرتی کی گئیں۔ گیارہ عورتوں کی بھرتی کی اجازت ساہیوال اور ملتان میں دی گئی۔ اسی سال واہ چھاؤنی میں بھی ایک ہیڈ کانسٹیبل اور دو کانسٹیبلوں کی بھرتی کی اجازت ہوئی۔ان کے علاوہ مرکز میں

ایک خاتون بطور سب انسپکٹر وائرلیس بھی ملازم رہی۔

کسان تحریک سے بیشتر 1920ء میں لاہور میں ریلوے پولیس میں لیڈی انسپکٹر کی عارضی اسامی نکالی گئی جو 1938ء میں پکی کی گئی مگر 1957ء میں ختم کر دی گئی۔ اس عورت کا کام تھا مشتبہ خواتین کی تلاشی' گمشدہ خواتین کی بازیابی اور دیکھ بھال اور حادثوں میں زخمی ہونے والی خواتین کی امداد۔ ان خواتین کی تربیت کے لئے کوئی اہتمام نہیں کیا گیا پہلی بار 1953ء میں ان کی تربیت کا اہتمام سرگودھا ٹریننگ سکول میں کیا گیا۔ اس کے علاوہ ڈسٹرکٹ پولیس لوئنوں میں بھی گنجائش نکالی گئی۔ ان کی وردی حالات کار کے مطابق بدلتی رہی' پہلے بیری کیپس دی گئیں مگر وہ نہ چلیں تو پھر دوپٹے کی اجازت دے دی گئی۔

اب صورت اور بھی آگے نکل گئی ہے' 1994ء کے شروع میں پاکستان میں خواتین کے لئے پہلا تھانہ راولپنڈی میں کھولا گیا۔ اس کا افتتاح بےنظیر بھٹو (سابق وزیراعظم) نے کیا تھا۔ ڈی آئی جی راولپنڈی ڈاکٹر شعیب سڈل نے لکھا ''خواتین سے متعلقہ ہوں' وہ زنانہ پولیس ہی طے کرے' عوام میں یہ شکائت عام تھی کہ تھانوں میں خواتین کے ساتھ نارواسلوک کیا جاتا ہے اس کے علاوہ حوالات میں بند خواتین کے ساتھ زیادتی کی جاتی ہے۔ چنانچہ حقوق نسواں کی تنظیموں کی تجاویز کی روشنی میں خواتین کے لئے علیحدہ تھانوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یہ تھانہ راولپنڈی میں ائرپورٹ روڈ پر بنایا گیا۔ تھانے کی افرادی قوت یہ تھی:

انسپکٹر	1
سب انسپکٹر	2
اے ایس آئی	1
ہیڈ کانسٹیبل	2
کانسٹیبل	13

تھانے سے متعلق ایک ایک چوکی سیٹلائٹ ٹاؤن' دوسری راولپنڈی شہر اور تیسری چھاؤنی کے علاقے میں کھولی گئی ہے۔ (ماہانہ محافظ جنوری فروری 1994 صفحہ 105)

زنانہ پولیس سے ہٹ کر پولیس سروس میں پاکستان میں پہلی اے ایس پی خاتون حلینہ رضوان نے اپنی تربیت مئی 1997ء میں مکمل کی اور یوں وہ پاکستان کی پولیس

میں پہلی براہ راست مقابلہ کے امتحان کے ذریعے اعلیٰ عہدہ حاصل کرنے والی شمار ہوں گی' ان کا شوہر کیپٹن رضوان بھی پولیس میں تھا اور 1994ء میں ہری پور (ہزارہ) میں ایک پولیس مقابلہ میں شہید ہوگیا تھا۔

پولیس بینڈز:

پولیس بینڈ چونکہ سویلین لوگوں کی شادی پر عموماً دیکھا جاتا ہے اس لئے یہاں اس کا ذکر بے جانہ ہوگا۔ (سرحد) میں پہلا پولیس بینڈ 1861ء میں بنایا گیا اس میں مدراس کے ریٹائرڈ فوجی بھرتی کئے گئے کیونکہ ان دنوں پٹھان اور پنجابی ایسے گانے بنانے کے کام میں شرکت کو بے عزتی گردانتے تھے۔ اس بینڈ کا افسر بھی انگریز تھا اس کے بعد بھی پھر دو انگریز باری باری اس کے سر براہ بن کر آئے۔ 1894ء میں مسٹر ریان نے مقامی افراد کی بھی بھرتی شروع کی اور 1904ء میں سولہ کے قریب مقامی جوان بھرتی کئے اور انہیں تربیت دی۔ اس وقت تک شیرانوالہ کے اندرون سجان خان لائنز تھی اور بینڈ یہی یہاں تھا۔ اگلے سال اسے ڈسٹرکٹ پولیس لائنز (ایمپریس روڈ) منتقل کر دیا گیا۔ اب اس بینڈ نے معاوضہ لے کر سول اور نجی تقریبات میں بھی اپنے جن کا م مظاہرہ شروع کر دیا۔ ایک اور کپتان پولیس جوان نے اپنی جیب سے اس بینڈ کے آنے جانے کے لئے بگھی خرید کر دی ۔ آزادی کے وقت بھی اس بینڈ کا سربراہ انگریز تھا جس نے اس کی تعداد 45 پیس تک بڑھا دی اور بینڈ کے لئے جو فنڈ بنایا گیا تھا اس میں 25 ہزار تک جمع کر لئے۔ انگریز چمپئن کو وہ خلا پر کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی جو آزادی کے بعد ہندو سکھوں کے جانے پر بینڈ یونٹ میں پیدا ہوگیا تھا۔

لاہور کے بینڈ کے علاوہ کراچی بہاول پور اور سہالہ میں بھی پولیس بینڈ ہیں۔ صوبہ سندھ کے اضلاع میں چھوٹے چھوٹے بینڈ رکھے گئے ہیں۔

تاریخ مخزن پنجاب میں' جو انیسویں صدی میں اس وقت چھپی جب صوبہ سرحد بھی پنجاب کا حصہ تھا اور دہلی بھی پنجاب کے سنٹرل پولیس آفس کے بارے میں تفصیل لکھی گئی ہے وہ بحوالہ پولیس گزٹ لاہور جنوری 1996 صفحہ نمبر 48 سے درج کی جارہی ہے۔ مرتب مرزا محسن رضا۔

محکمہ پنجاب پولیس ہی پنجاب میں ایک بڑا محکمہ ہے جس کا کام ہر خاص وعام کو انصاف وتحفظ فراہم کرنا ہے۔ضلعوں کی تقسیم کچھ اس طرح ہے۔

''پنجاب کے چار حلقے ہیں۔ ایک ایک حلقے میں ایک ایک انگریز ولائتی بعہدہ ڈپٹی انسپکٹر جنرل اور اس کے ماتحت ایک ایک ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ مامور ہے اور افسر اعلیٰ ان حلقوں کا ایک انسپکٹر جنرل آف پنجاب پولیس مقرر ہے جو بلا کسی اور آفیسر کے براہ راست گورنمنٹ کی خدمت میں جس کار کے واسطے چاہے تحریر کر سکتا ہے۔

انبالہ ۔ اس حلقہ میں انبالہ' لدھیانہ' شملہ' کرنال' دہلی' گوڑ گاؤں' خصار' سرسہ' رہتک 9 اضلاع شامل ہیں۔

لاہور ۔اس میں لاہور' گوجرانوالہ' فیروز پور' امرتسر' گورداسپور' سیالکوٹ' جالندھر' ہوشیار پور' کانگڑہ کل نو اضلاع شامل ہیں۔

روالپنڈی۔ اس میں راولپنڈی' جہلم' شاہ پور' گجرات چار اضلاع شامل ہیں (اٹک؟)

ملتان' اس میں ملتان' جھنگ' منٹگمری (ساہیوال) مظفرگڑھ چار اضلاع شامل ہیں (فیصل آباد وغیرہ آباد نہیں ہوئے تھے اور دوسرے اضلاع کا حصہ تھے)

ضلع پشاور' کوہاٹ' ہزارہ' بنوں' ڈیرہ اسماعیل خان' ڈیرہ غازی خان دریائے سندھ کے پار (ہزارہ دریا کے پار نہیں ہے) وہ ان درج شدہ چار حلقوں سے پار ہیں۔ وہاں کے اہل پولیس صاحبان اضلاع کے ماتحت کام کرتے ہیں۔کوئی علیحدہ ڈپٹی انسپکٹر جنرل آف پولیس ان پر مقرر نہیں ۔

عملہ پولیس کا سالانہ خرچ ایک لاکھ روپے ہے۔ جس میں سے انسپکٹر جنرل' ایک ڈپٹی انسپکٹر جنرل' چار پرنسپل اسسٹنٹ انسپکٹر جنرل' ایک ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ' پچیس اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ' انیس انسپکٹر سنتالیس ڈپٹی انسپکٹر' چار سو ستر سارجن (سارجنٹ)' سوا دو سو پیادہ' ایک ہزار نو سو چھتیس کانسٹیبل سوار' ایک ہزار چار سو ساٹھ کانسٹیبل پیادہ' گیارہ ہزار پانچ سو اٹھانویں کل نفری۔ پندرہ ہزار پانچ سو اڑسٹھ تنخواہ پاتے ہیں اور پولیس شہری کا خرچ جن کو تنخواہ میونسپل کمیٹی یعنی آمدنی چوکیدار چونگی وغیرہ سے ملتی ہے تین لاکھ پینسٹھ ہزار اور پانچ سو چھاسٹھ روپے میں۔ اس میں انسپکٹر' ڈپٹی انسپکٹر چھتیس

سارجن' (سارجنٹ) تین سوتینتیس سوار' تین دو کانسٹیبل پیادہ' چار ہزار چار سو سنتالیس تنخواہ پاتے ہیں اور اس تعداد میں اکثر اوقات بصورت ضرورت کمی بیشی ہوتی ہے۔

'' جیل خانہ جات (یعنی مجس ؟) پہلے پنجاب میں کل چھتیس تھے اب سینتیس ہوگئے ہیں۔ ان میں سے ایک جیل خانہ قیدیاں اہل فرنگ جالندھری میں بنایا گیا ہے۔ بڑا جیل خانہ لاہور میں سنٹرل جیل ہے۔ جیل خانہ میں قیدی بامشقت ہر ایک طرح کا کام کرتے ہیں ۔کوئی ایسا کارخانہ یا پیشہ نہیں ہے جو جیل خانہ میں نہیں ہوتا۔ بڑی بڑی اعلیٰ قسم کی شالیں' کپڑا' دریاں' کھیس بنائے جاتے ہیں ۔ دیسی کاغذ کثرت سے بنتا ہے۔''

پولیس ایکٹ 1861ء

وہ قوانین جن کے تحت برصغیر کے مختلف علاقوں میں ہندو، مسلم اور سکھ ادوار میں پولیس تشکیل دی گئی اب ان کا متن نہیں ملتا اور نہیں کہا جاسکتا کہ یہ متن تھا بھی کہ نہیں بہرطور ایک طریقہ ضرور موجود ہوگا اور سروس رولز بھی ضرور ہوں گے۔ انگریزوں نے پولیس کے بارے میں جو آخری قانون بنایا اسے پولیس ایکٹ 1861ء کہتے ہیں اس قانون کے ذریعے ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد کے بنائے گئے تمام پولیس ضابطے اور قانون ختم کر دئے گئے اور یہ ایکٹ تین شہروں بمبئی، مدراس اور کلکتہ کو چھوڑ کر پورے برصغیر پر لاگو کر دیا گیا۔ ان دنوں دہلی بھی پنجاب کا حصہ تھا اور صوبہ سرحد بھی صوبہ پنجاب میں ہی شامل تھا۔ سرحدی علاقے کے لئے ایک پولیس کمشنر مقرر کیا گیا۔ پولیس ایکٹ نمبر 15 .1861ء سبھی صوبوں کو اختیار کرنے کا حکم دیا گیا۔ دیکھا جائے تو آج دنیا بھر کی پولیس کا وجود کچھ اسی قسم کے قوانین کے باعث قائم ہے۔

قیام پاکستان کے بعد بھی کسی حکومت کو کسی عہد میں اس قانون میں تبدیلی کی ضرورت پیش نہیں آئی بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ انہوں نے نہ صرف پولیس کی بلکہ ساری کی ساری سرکاری مشینری کو جو نوآباتی مفادات کے تحت قائم کی گئی تھی تقریباً اسی صورت میں بحال رکھا۔ بعض اوقات انہی میں مزید قانونی خرابیاں بھی ایزاد کر دی گئیں۔ اس کے علاوہ نہ صرف ضابطوں میں مجرمانہ ڈھیل دی گئی افرادی قوت کی مستعدی دیانتداری اور پیشہ سے نیک نیت وابستگی کے حوالے سے معیار کم سے کم کر دیا گیا۔

بہرطور پاکستان، بھارت، برما، سنگا پور، سرکاری لنکا اور دوسرے برطانوی نو آبادیاتی ممالک میں اسی نوعیت کے پولیس کے قانون تھے اس لئے انگریز عہدے سے قائم پولیس کی تاریخ میں پولیس ایکٹ 1861ء کا متن بغیر کسی وضاحت کے شامل کیا جانا لازم ہے تاکہ اس کی روشنی میں مختلف ادوار میں پولیس کی تنظیم اور کارکردگی کا جائزہ لینے میں بھی

آسانی رہے اور یہ بھی دیکھا جاسکے کہ کیا مہذب سوسائٹی کے ادارے کا خمیر ایسے قانون سے اٹھ سکتا ہے''

''ایکٹ کی وضاحت یہ ہے''

دفعہ 1: اس ایکٹ میں مندرجہ ذیل الفاظ اور اصطلاحات کے وہی معنی ہوں گے جو ان کے لئے مقرر کر دئے گئے ہیں بشرطیکہ مضمون یا قرینہ عبارت میں کوئی شے ایسی نہ ہو جو اس معنی کے خلاف ہو یعنی :

لفظ۔ مجسٹریٹ ضلع۔ سے وہ اعلیٰ عہدہ دار مراد ہے جو کسی ضلع کے عملی انتظام کا ذمہ دار ہو اور مجسٹریٹ کے اختیارات عمل میں لاتا ہو خواہ اس عملی انتظام کے ذمہ دار اعلیٰ عہدہ دار کے عہدہ کا نام کچھ بھی کیوں نہ ہو۔

لفظ۔ مجسٹریٹ۔ ایسے تمام اشخاص ہوں گے جو عام پولیس ڈسٹرکٹ کے اندر کسی مجسٹریٹ کے تمام یا بعض اختیارات عمل میں لاتے ہوں۔

لفظ۔ پولیس۔ میں ایسے تمام اشخاص شامل ہیں جو اس ایکٹ کی رو سے بھرتی کیئے جائیں۔

لفظ۔ عام ڈسٹرکٹ پولیس۔ میں ہر ایسا صوبہ یا مقام یا ہر ایسے صوبے یا مقام کا کوئی حصہ داخل ہے جہاں یہ ایکٹ نافذ کرنے کا حکم دیا گیا ہو۔

الفاظ۔ ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ اور ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس۔ میں ہر اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ سپرنٹڈنٹ یا وہ شخص شامل ہو گا جو صوبائی حکومت کے عام یا خاص حکم کے ذریعے کسی ضلع کے اندر کسی ڈسٹرکٹ سپرنٹڈنٹ پولیس کے تحت ایکٹ ہذا کی تمام یا بعض خدمات کے انجام دینے کے لئے مقرر ہوا ہو۔

لفظ۔ مال۔ میں ہر مال منقولہ یا روپیہ یا کفالتہ المال شامل ہے۔

لفظ۔شخص۔ میں کمپنی یا کارپوریشن (جماعت سند یافتہ) شامل ہے۔

لفظ۔ مہینہ۔ سے کیلنڈر کا مہینہ مراد ہے۔

لفظ۔ مویشی۔ میں سینگ والے چار پاؤں کے علاوہ ہاتھی' اونٹ' گھوڑے' گدھے' خچر' بھیڑیں' بکریاں اور سور شامل ہیں۔

جو حوالہ جات ایک جماعت پولیس کے ماتحت درجوں کی طرف ہیں ان سے یہ سمجھا جائے گا کہ وہ حوالہ جات اس جماعت کے ان ممبران کی طرف ہیں جن کا درجہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس سے کم ہو۔

دفعہ 2: اس ایکٹ کی اغراض کے لئے سررشتہ پولیس جماعت واحد کی حیثیت سے صوبائی حکومت کے ماتحت ہوگا۔ صوبائی حکومت وقتا فوقتا اس کے عہدہ داروں اور سپاہیوں کی تعداد متعین کرے گی اور ان کی ترتیب اور فرائض متعین کرتی رہے گی ماتحت مالز میں پولیس کی تنخواہ ہیں مقرر کرے گی۔

دفعہ 3: عام ڈسٹرکٹ پولیس کی نگرانی کا حق صوبائی حکومت کو حاصل ہوگا اور سوائے اس کے جس کی اجازت ایکٹ ہذا کے احکام کی رو سے دی گئی ہے کسی شخص یا عہدہ دار یا عدالت کو صوبائی حکومت کی طرف سے اختیار نہیں ملے گا کہ کسی عہدہ دار پولیس کو بر طرف کرے یا اس پر حکومت کرے۔

دفعہ 4: عام پولیس' ڈسٹرکٹ بھر کی پولیس کے انتظام کا حق ایسے عہدہ دار کو حاصل ہوگا جو انسپکٹر جنرل پولیس کہلائے گا نیز ایسے ایڈیشنل انسپکٹر جنرل' ڈپٹی انسپکٹر جنرل اور اسسٹنٹ انسپکٹر جنرل جنہیں صوبائی حکومت اس کا اہل سمجھے۔

دفعہ 5: عام ڈسٹرکٹ پولیس کے سلسلے میں انسپکٹر جنرل کو مجسٹریٹ کے تمام اختیارات حاصل ہوں گے مگر وہ ان اخیارات کو صوبائی حکومت کی طرف سے وقتاً فوقتاً متعین کی گئی حدود کے اندر استعمال کرے گا۔

دفعہ 6: 1882ء میں منسوخ ہوگئی۔

دفعہ 7: سوائے ان کے جن کا اس ایکٹ کی دفعہ 4 میں ذکر ہے پولیس کے تمام عہدہ دار صوبائی حکومت کی منظور کردہ پالیسی اور معیار کے مطابق دفعہ 4 میں شامل عہدہ دار انسپکٹر جنرل ایڈیشنل انسپکٹر جنرل' ڈپٹی انسپکٹر جنرل' اسسٹنٹ انسپکٹر جنرل اور ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ بھرتی کریں گے اور انہی افسروں کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ حکومت کے وقتاً فوقتاً بنائے گئے قوانین کے تحت یا ملازمین کو نااہلی' سستی' فرائض سے غفلت برتنے پر عہدہ میں تنزلی' معطل یا جبری ریٹائر کرسکتے ہیں یا کسی ایسے ماتحت درجہ کے عہدہ دار پولیس کے لئے جو اپنے فرض منصبی کو یا غفلت کے ساتھ بجالائے یا جو اپنے آپ کو اپنے کسی فعل سے کسی

ایسے ماتحت درجہ کے عہدہ دار پولیس کے لئے جو اپنے فرض منصبی کو یا غفلت کے ساتھ بجالائے یا جو اپنے آپ کو اپنے کسی فعل سے کسی ایسے فرض کے بجالانے کے ناقابل بنائے نیچے لکھی ہوئی سزاؤں میں سے ایک یا زیادہ کا حکم کریں یعنی:

الف: جرمانہ ایک ماہ کی تنخواہ سے زیادہ نہیں۔

ب: ان کے کوارٹروں میں بند کر دینا مگر پندرہ دن سے زائد نہیں اس کے ساتھ ڈرل وغیرہ بھی ہوسکتی ہے۔

ج: نیک چلنی کی تنخواہ (ضمانت) کی ضبطی۔

د: کسی عہدہ سے برطرفی یا بہتر پوسٹنگ سے کم تر پوسٹنگ

دفعہ 8: ہر عہدہ دار پولیس یا ملازم پولیس کو انسپکٹر جنرل کی طرف سے تقرری کا سرٹیفکیٹ ملے گا جس پر انسپکٹر جنرل کی مہر بھی ہوگی اور اسی سرٹیفکیٹ یا تقرر نامہ کے تحت مقررہ ملازم اپنے اختیارات فرائض اور حقوق حاصل کرنے کا مجاز ہوگا۔ معطّلی کے دوران اس کے تمام حقوق و اختیارات معطل رہیں گے مگر وہ ان تمام ضابطوں وغیرہ کا پابند ہوگا جن کا معطّلی سے پہلے پابند تھا۔

دفعہ 9: جب تک ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ یا کوئی اور با اختیار عہدہ دار کسی ملازم کو اپنے عہدہ سے دستبر دار ہونے کا حکم نہ دے وہ اپنے طور پر اپنے فرائض سے دستبردار ہونے کا مجاز نہیں۔ ایس پی کی منظوری کے بغیر مستعفی بھی نہیں ہوسکے گا اس کی اطلاع اسے کم از کم دو ماہ پہلے مجاز افسر کو دینا ہوگی۔

دفعہ 10: کوئی عہدہ دار پولیس سوائے اپنے ان فرائض کے جو اس ایکٹ کی رو سے مقرر ہیں کسی اور کام یا عہدہ سے خواہ وہ کچھ کیوں ہی نہ تعلق نہ رکھے گا' تا آنکہ انسپکٹر جنرل اس کی تحریری اجازت نہ دے۔

دفعہ 11: منسوخ ہوئی۔

دفعہ 12: انسپکٹر جنرل کو صوبائی حکومت کی منظوری تحت اختیار ہوگا کہ وقتاً فوقتاً وہ جاعت پولیس کی تنظیم اور جماعت مذکورہ کے لوگ رہیں گے اور ان خاص خدمات کے متعلق جو انہیں انجام دینا پڑیں گی اور ان کے معائنہ اور ہتھیاروں کی قسم اور ساز و سامان اور

دوسری ضروری چیزوں کے متعلق جونہیں مہیا کی جائیں گی۔ نیزان خبروں و اطلاعات کے جمع کرنے اور پہنچانے کے متعلق جو وہ مناسب سمجھیں اور جماعت پولیس کے متعلق خاتمہ اور جماعت کو اپنے فرائض بجالانے کے قابل بنانے کے لئے بھی قوانین وضع کریں۔

دفعہ 12 (الف) : صوبائی حکومت کے احکامات کے تابع انسپکٹر جنرل کو اختیار ہوگا کہ وہ ایسے تمام امور حسابات جن کا تعلق اس جماعت پولیس سے ہوا اور جو اس کے اختیار کے تابع ہو، تفتیش کرے اور ان کو منضبط کرے اور تمام افراد پر لازم ہوگا کہ وہ ایسی تفتیش کی انجام دہی میں اس کو معقول مدد اور سہولت بہم پہنچائیں اور اس بارے میں اس کے جائز احکام کی تعمیل کریں۔

دفعہ 13: انسپکٹر جنرل، ایڈیشنل انسپکٹر جنرل، ڈپٹی انسپکٹر جنرل یا ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ کو مجسٹریٹ ضلع کی عام ہدایت کے تابع جائز ہوگا کہ کسی شخص کی درخواست پر عام پولیس ڈسٹرکٹ کے اندر کسی مقام میں امن قائم رکھنے کی غرض سے کسی زائد تعداد کے عہدا داران، پولیس اتنی مدت کے لئے مقرر کرے جو مناسب معلوم ہو۔ بشرطیکہ درخواست مذکور میں اس کی ضرورت دکھائی جائے۔ جماعت مذکور خاص ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ کے احکام کے تحت ہوگی اور درخواست کرنے والے اسے اس کا خرچہ لیا جائے گا۔

ایک شرط یہ ہے کہ جس شخص کی درخواست پر ایسی تقرری کی جائے گی اس کو جائز ہوگا کہ وہ انسپکٹر جنرل، ڈپٹی انسپکٹر جنرل یا اسسٹنٹ انسپکٹر جنرل یا ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ کو ایک مہینے پیشگی اطلاع دے کہ فلاں تاریخ سے مقرر کئے گئے عہدیداران بلائے جائیں۔ اس معیاد کے گزر جانے کے بعد شخص مذکور اس زائد جماعت کے خرچہ کا ذمہ دار نہ ہوگا۔

اس وقت یہ معاوضہ طے کیا گیا تھا چار یا پانچ گھنٹے کی ڈیوٹی کے لئے :

یورپی انسپکٹر	8 روپے
یورپی سارجنٹ	6 روپے
سب انسپکٹر	4 روپے
اسسٹنٹ سب انسپکٹر	2 روپے
ہیڈ کانسٹیبل	1 روپیہ

اور پیادہ یا کانسٹیبل 12 آنے

دفعہ 14: جب ملک کے کسی حصے میں ریلوے یا نہر کا کام یا کوئی کارخانہ یا تجارتی کاروبار چل رہا ہو یا جاری ہو اورانسپکٹر جنرل کو اس کام کارخانہ یا کاروبار میں لگے ہوئے لوگوں کے چال چلن سے جو معقول تو تشویش پیدا ہو اس سے معلوم ہو کہ پولیس کی ایک زائد جماعت کا اس مقام پر لگانا ضروری ہے تو انسپکٹر جنرل صوبائی حکومت کی منظوری سے زائد جماعت اس مقام پر متعین کرنے کا مجاز ہوگا۔ اس کو اس وقت تک رکھا جائے جب تک وہ ضرورت باقی ہو اور یہ بھی جائز ہوگا کہ اس زائد جماعت کا خرچہ جس کی حسب حال ضرورت پڑے اس شخص کو ادا کرنے کا وقتاً فوقتاً حکم دیں جس کے اختیار یا حفاظت میں وہ سرمایہ ہو جو اس کام یا کاروبار چلانے میں استعمال کیا جاتا ہو اور اس شخص پر لازم ہوگا کہ حکم مذکور کے بموجب خرچہ دلوائے۔

دفعہ 15۔(1): صوبائی حکومت مجاز ہوگی کہ بذریعہ اشتہار' مشتہرہ سرکاری گزٹ یا کسی دوسرے طریق سے یہ اعلان کرے کہ حکومت کی حدود میں فلاں علاقہ میں فساد یا خطرے کی صورت حال پائی گئی یا اس علاقہ کے باشندوں یا ان کی کسی جماعت یا فرقہ کے چلن سے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پولیس کی تعداد بڑھائی جائے۔

(2): تب انسپکٹر جنرل یا صوبائی حکومت جسے بھی اختیار دے حکومت کی منظوری سے علاوہ مقررہ تعداد پولیس کے اشتہار میں نامزد علاقہ میں تعیناتی کے لیے پولیس بھرتی کرے۔

(3): اس دفعہ کی ذیلی دفعہ 2 کے تحت پولیس کی اس زائد جماعت کا خرچہ اس علاقے کے باشندوں کو دینا پڑے گا جس کا ذکر اشتہار میں موجود ہے۔

(4): مجسٹریٹ ضلع کو لازم ہوگا کہ وہ مناسب تحقیقات کے بعد اس خرچے کو ذمہ دار باشندوں پر تقسیم کردے جو بعد کی ذیلی دفعہ 5 کے تحت بری نہ کئے گئے ہوں۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ان باشندوں کی استطاعت کے مطابق یہ رقم ان کے لیے تجویز کرے گا۔

(5): صوبائی حکومت مجاز ہوگی کہ کچھ اشخاص کو یا لوگوں کی جماعت یا فرقہ کو اس خرچہ یا حصہ دار کرنے کی ذمہ داری سے بری کردے۔

(6): ہر اشتہار جو ذیلی دفعہ(1) کے تحت جاری کیا جائے گا اس میں معیاد ضرور

دی گئی ہوگی مگر اس اشتہار کو کسی وقت بھی مسترد کیا جا سکتا ہے یا وقتاً فوقتاً جیسے صوبائی حکومت مناسب سمجھے معیاد اضافہ یا اضافے بھی ہو سکتے ہیں۔

(15)الف(1): اگر کسی ایسے علاقے میں جس کی نسبت اوپر کی آخری دفعہ کی رو سے مشتہر کیا ہوا کوئی اشتہار نافذ ہو اس علاقہ کے باشندوں یا ان کی کسی جماعت یا فرقہ کا تشدد ہلاکت یا ضرر شدید یا مال کا تلف ہونا یا نقصان واقع ہو تو ہر ایسے شخص کو جو اس علاقہ کا باشندہ ہو اور دعویٰ دار ہو کہ اسے شدید نقصان پہنچا ہے وہ اس نقصان کی واردات سے ایک ماہ کے اندر اندر یا جو معیاد مقرر کی جائے گی اس کے اندر اس ضلع یا سب ڈویژن کے مجسٹریٹ کے پاس معاوضے کے لئے درخواست دے گا۔

(2): صوبائی حکومت کی منظوری سے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مناسب تحقیقات کروائے گا اس تحقیقات کے نتیجے میں یا مذکورہ بالا آخری دفعہ کی رو سے نامزد علاقہ میں زائد پولیس متعین کی گئی یا یہ طے کیا جائے۔

(الف): کس کس شخص کی وجہ سے وہ نقصان ہوا اور کن کن اشخاص کا نقصان ہوا۔

(ب): اس معاوضہ کی حد کا تعین کردے جو ان افراد کو دیا جائے او روہ طریقہ متعین کرے جس کے تحت یہ معاوضہ تقسیم کیا جائے گا۔

(ج): یہ بھی متعین کر دیا جائے کہ کن کن افراد کا جنہیں بری نہیں کیا گیا، کیا حصہ رسدی ہوگا جو درخواست کنندگان میں متذکرہ بالا ذیلی دفعہ کے مطابق تقسیم کیا جائے گا۔

(د): مجسٹریٹ پہلے یہ طے کرے گا کہ نقصان اس علاقے میں بلوہ یا خلاف قانون مجمع کے باعث ہوا تھا اور جس شخص کا نقصان ہوا تھا وہ بے قصور تھا۔

(3): صوبائی حکومت اشخاص یا ان کی کسی جماعت یا فرقہ کو معاوضہ کے کسی حصہ کے ادا کرنے کی ذمہ داری سے بری کرنے کی مجاز ہوگی۔

(4): ذیلی دفعہ 2 کی رو سے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ جو فیصلہ دے یا تشخیص کرے وہ کمشنر صوبائی حکومت کی نظر ثانی کے تابع ہوگا تاہم جس کا ذکر اوپر ہوا وہ قطعی ہوگا۔

(5): اس دفعہ کی رو سے جس نقصان کا معاوضہ دلایا جائے گا اس کے بارے میں کوئی دیوانی نالش قابل سماعت نہیں ہوگی۔

دفعہ16(1): عام رقم جو دفعات 15,15,14,13الف کی رو سے واجب الادا

ہوگی بذریعہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ وصول ہو سکے گی۔

(2): تمام روپے جو دفعہ 15الف کی رو سے ادا ہوں یا وصول کئے جائیں، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے ذریعہ ان لوگوں کو حصہ رسدی کے بموجب دیئے جائیں گے جن کو حصہ رسدی کے بموجب دفعہ مذکورہ کی رو سے وہ دیئے جانے چاہئیں۔

دفعہ17: جب یہ معلوم ہو کہ کوئی مجمع خلاف قانون ہوا یا بلوہ ہوا یا امن میں خلل آیا یا معقول طور پر اس کا اندیشہ ہے اور یہ کہ جماعت پولیس جو امن قائم رکھنے کے لیے معمولاً لگائی گئی ہے وہ امن قائم رکھنے کے لیے اور اس مقام کے باشندوں کی حفاظت اور مال کے بچاؤ کے واسطے کافی نہیں ہے جہاں ہو مجمع خلاف قانون یا بلوہ ہوا یا امن میں خلل آیا ہے یا اس کے واقعہ ہونے کا اندیشہ ہے تو ہر عہدہ دار پولیس جو انسپکٹر کے درجہ سے کم نہ ہوگا، مجاز ہوگا کہ قریبی مجسٹریٹ کے پاس درخواست دے کہ اس مقام کے قریب وجوار کے رہنے والے لوگوں میں سے اتنے لوگ جتنے کہ اس کی ضرورت ہو اتنی مدت تک اور ان حدود کے اندر جو مناسب سمجھے عہدہ دار ان پولیس کے طور پر کام کرنے کے لئے مقرر کر لئے جائیں اور مجسٹریٹ کو جس کے روبرو ایسی درخواست گزارے لازم ہوگا کہ اس کو منظور کرے بشرطیکہ قانون کے خلاف کوئی بات نہ ہو۔

دفعہ 18: ہر خاص عہدہ دار پولیس کو جو اس طرح پر مقرر ہو وہی اختیارات اور حقوق او رحق حفاظت حاصل ہوں گے جو عام عہدیدار پولیس کو حاصل ہیں اور وہی فرائض انجام دینے ہوں گے جو عام عہدیداران پولیس کو انجام دینے پڑتے ہیں اور وہ انہیں سزاؤں کا ذمہ دار اور انہی حاکموں کے تابع ہوگا جن کے عام عہدیداران پولیس والے ذمہ دار تابع ہوں گے۔

دفعہ19: اگر کوئی شخص جیسا کہ اوپر ذکر ہوا خاص عہدہ دار پولیس مقرر ہو کر بغیر کسی کافی وجہ کے خاص عہدہ دار پولیس کی حیثیت سے خدمت کرنے میں غفلت کرے یا اس سے انکار کرے یا اس جائز حکم یا ہدایت کی نافرمانی کرے جو اس کو اس کے فرض منصبی کے بجا لانے کے لئے دی گئی ہو تو مجسٹریٹ کے روبرو مجرم ثابت ہونے پر ایسی غفلت یا انکار یا نافرمانی کے بدلے اس پر اس قدر جرمانہ ہوگا جو پچاس روپے سے زیادہ نہ ہو۔

دفعہ20: عہدہ داران پولیس جو اس ایکٹ کی رو سے بھرتی کئے جائیں کوئی

اختیار عمل میں نہیں لائیں گے سوائے اس اختیار کے جو ایکٹ ہذا اور کسی دوسرے ایکٹ کی رو سے جو ضابطہ فوجداری کے انتظام کے لئے اس کے بعد جاری ہو، عہدہ دار پولیس کو دیا جائے۔

(1901ء میں شمالی مغربی صوبہ سرحد میں ہر ایک عہدہ دار پولیس ان تمام اختیارات کو عمل میں لا سکتا ہے جو عہدہ دار ایس ایچ او کو بروئے دفعہ 55 ضابطہ فوجداری دیئے گئے ہیں)

دفعہ 21: ایکٹ ہذا کا کوئی مضمون کسی موروثی یا گاؤں کے دوسرے عہدہ دار پولیس سے متعلق نہ ہوگا جب تک کہ عہدہ دار مذکور اس کو ایکٹ کی رو سے عہدہ دار پولیس کے طور پر بھرتی نہ کیا جائے اور جب عہدہ دار مذکورہ اس طرح بھرتی ہو جائے تو وہ اوپر کی آخری دفعہ کے احکام کا پابند ہوگا اور کوئی موروثی یا گاؤں کا دوسرا عہدہ دار پولیس، اپنی اور ان لوگوں کی مرضی کے بغیر جو اسکے نامزد کرنے کا حق رکھتے ہوں، بھرتی نہیں کیا جائے گا۔

دفعہ 22: ان اغراض کے لئے جو اس ایکٹ میں درج کی گئی ہیں، پولیس کا ہر عہدہ دار اپنے کام پر موجود سمجھا جائے گا اور اس سے بحیثیت عہدہ دار پولیس، عام ڈسٹرکٹ پولیس کے ہر حصہ میں ہر وقت کام لیا جا سکتا ہے۔

دفعہ 23: ہر عہدہ دار پولیس پر واجب ہوگا کہ ایسے تمام احکامات اور وارنٹوں کی فوراً فرمانبرداری اور تعمیل کرے جو اس کے نام حکم مجاز نے جائز طور پر جاری کئے ہوں اور امن عامہ کے بارے میں خبریں دریافت کر کے بھجوائے اور جرائم کا اور عام لوگوں کو تکلیف پہنچانے والے امور کا سد باب کرے اور مجرم کا سراغ لگا کر اس کو سزا دلائے اور ایسے تمام لوگوں کو گرفتار کرے جن کو گرفتار کرنے کی قانوناً اس کو اجازت ہو اور جن کی گرفتاری کی خاص وجوہات موجود ہوں اور ان اغراض میں سے جو اس دفعہ میں درج کی گئی ہیں کسی غرض کے لئے ہر عہدہ دار پولیس کو جائز ہوگا کہ بغیر وارنٹ کے کسی شراب خانے یا جوا خانے یا کسی اور مقام میں جہاں آوارہ اور شور شر کرنے والے لوگ آتے جاتے ہوں، داخل ہو کر اس کا معائنہ کرے۔

دفعہ 24: ہر عہدہ دار پولیس مجاز ہو گا یہ مجسٹریٹ کے روبرو کوئی اطلاع پیش کرے اور سمن یا وارنٹ تلاشی یا کسی اور قانونی حکمنامہ کے لئے درخواست کرے جو قانوناً

کسی جرم کرنے والے کے خلاف جاری ہوسکتا ہے۔

دفعہ 25: ہر عہدہ دار پولیس کا فرض ہوگا کہ تمام لا دعویٰ (لاوارث) مال اپنے اہتمام میں رکھے اور مجسٹریٹ ضلع کے پاس اس کی فہرست پیش کرے۔

(1): ایسے مال کو الگ کرنے کے بارے میں عہدہ داران پولیس ان احکامات کی پیروی کریں گے جو مجسٹریٹ ضلع کی طرف سے ان کو ملیں۔

دفعہ 26: ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو اختیار حاصل ہے کہ مال مذکورہ کو روک رکھے اور ایک اشتہار جاری کرے جس میں مال کی تفصیل درج ہو، اشتہار کے ذریعے جو کوئی بھی وارث یا دعویدار ہو وہ چھ ماہ کے اندر اندر حاضر ہو کر مال مذکور کی نسبت اپنا حق ثابت کرے۔

دفعہ 27: (1) اگر کوئی شخص اس معیاد کے اندر جو دی جائے اس مال پر یا اگر وہ مال فروخت ہو جائے تو اس کے روپے پر دعویٰ نہ کرے تو وہ اگر مذکورہ بالا آخری دفعہ کی ذیلی (2) کے بموجب فروخت نہ ہوا ہو تو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے حکم سے فروخت ہوسکتا ہے۔

(2): اس مال کے نیلام کا روپیہ جو ضمنی مذکور کے بموجب فروخت ہو اور اس مال کا روپیہ جو دفعہ 26 کی رو سے فروخت کیا گیا ہو اور جس کی نسبت کوئی دعویٰ ثابت نہ ہوا ہو، صوبے کی حکومت کے زیر تصرف ہوگا۔

دفعہ 28: جو شخص اس ایکٹ کی رو سے بھرتی کیا ہوا عہدہ دار پولیس قائم نہ رہے اور وہ فوراً اپنا سرٹیفکیٹ اور وردی اور ساز و سامان او رتقرریاں اور دوسری ضروری چیزیں جو اس کے فرائض منصبی کی تعمیل کے لئے اس کو دی گئی ہوں، حوالے نہ کرے تو اس کو مجسٹریٹ کے روبرو مجرم ثابت ہونے پر اس قدر جرمانہ ہوگا جو دوسو روپے سے زیادہ ہو یا ایسی قید بے مشقت یا با مشقت ہوگی جس کی معیاد چھ مہینے سے زیادہ نہ ہو یا دونوں سزائیں ہوں گی۔

دفعہ 29: ہر عہدہ دار پولیس جو فرض منصبی کے خلاف کرنے کا یا کسی قاعدہ قانون یا حکم جائز کی خلاف ورزی کا یا اس میں غفلت کرنے کا مجرم ہو یا جو اپنے عہدے کے کام سے بلا اجازت (یا دو مہینے پیشتر اطلاع دیئے بغیر) کنارہ کش ہو جائے یا رخصت

پر غیر حاضر رہ کر رخصت ختم ہو جانے کے بعد بغیر معقول وجہ کے اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہونے کی رپورٹ کرنے میں قصور کرے یا جو بلا اجازت اپنے فرائض منصبی کے علاوہ کسی اور کام میں مشغول ہو یا جو بزدلی کا مجرم ہو یا جو کسی ایسے شخص کو جو اس کی حراست میں ہو ناجائز جسمانی تکلیف دے۔ اس کو مجسٹریٹ کے روبرو مجرم ثابت ہونے پر اس قدر جرمانہ ہوگا جو تین مہینے کی تنخواہ سے زیادہ نہ ہو۔ یا ایسی قید بے مشقت یا با مشقت ہوگی جس کی معیاد تین مہینے سے زیادہ نہ ہو یا دونوں سزائیں ہوں گی۔

دفعہ31(1): ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ یا اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ کو اختیار ہے کہ جب ضرورت ہو ان تمام مجمعوں اور جلوسوں کو شارع عام یا عام سڑک یا راستوں پر سے گزرنے کا انتظام کرے اور وہ راستے اور وہ اوقات مقرر کر دے کہ جن راستوں پر سے اور جن اوقات میں وہ جلوس گزریں۔

(2): متعلقہ افسر کو اس بات کا یقین ہونے پر کہ فلاں شخص کی جماعت کا ارادہ ہے کہ وہ کسی ایسے شارع عام یا سڑک یا راستہ پر لوگ بلائے یا جمع کرے یا ایسا جلوس تیار کرے جس سے مجسٹریٹ سب دویژن کی رائے میں اگر قابو نہ رکھا جائے، امن ٹوٹنے کا احتمال ہو تو یہ بھی اختیار ہے کہ عام یا خاص نوٹس کے ذریعہ سے ان اشخاص کو جنہوں نے لوگوں کو بلایا یا جمع کیا ہو یا اس جلوس کے منظم یا حامی ہوں حکم دے کہ وہ اجازت نامہ کے لئے درخواست دیں۔

(3): جب ایسی درخواست آئے تو متعلقہ افسر کو اختیار ہوگا کہ ایک اجازت نامہ جاری کرے جس میں افراد کے نام درج ہوں جن کو اجازت ملے اور وہ شرطیں مقرر کی گئی ہوں جن پر لوگوں کو جمع ہونے یا جلوس نکالنے کی اجازت ملے اور جو اور طرح پر اس دفعہ کے مضمون موثر کرے مگر شرط یہ ہے کہ ایسے اجازت نامے کی درخواست کے لئے یا اس کے مرحمت ہونے کی بابت کوئی فیس نہیں لی جائے گی۔

(4): افسر مذکور کو یہ اختیار بھی ہے کہ اس بات کا انتظام کرے کہ تہواروں اور رسموں کی تقریبات میں سڑکوں (سر عام) پر کس حد تک باجا بجایا جا سکے گا۔

دفعہ30الف(1): ایسی صورت میں کہ آخری دفعہ کے تحت درخواست دے اور لائسنس حاصل کئے بغیر اگر کوئی اجتماع طلب کرایا جائے یا کوئی جلوس تیار کیا جائے یا

متذکرہ دفعہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مجمع یا جلوس نکالا جائے تو کوئی مجسٹریٹ یا ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس یا اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس یا انسپکٹر پولیس یا کسی پولیس سٹیشن کا مہتم انچارج مجاز ہوگا کہ وہ ایسے جلوس کو روک دے اور ایسے مجمع یا جلوس (جیسی بھی صورت ہو) کو منتشر ہونے کا حکم دے۔

(2): ہر جلوس یا اجتماع جو کسی ایسے حکم کی تعمیل میں غفلت یا انکار کردے جو مذکورہ بالا ضمنی دفعہ کی رو سے دیا جائے تو وہ خلاف قانون جلوس یا مجمع سمجھا جائے گا۔

دفعہ 31: پولیس کو واجب ہو گا کہ شارع عام اور سرکاری سڑکوں اور راستوں اور گھاٹوں او رکشتی سے اترنے کی جگہوں پر اور ایسے تمام مقامات پر جہاں عام لوگوں کی آمدورفت رہتی ہے حکم قائم رکھے اور مجمعوں اور جلوسوں کا وقت شارع عام اور سرکاری سڑکوں سے یا عام لوگوں کی عبادت کے وقت عبادت گاہوں کے آس پاس سے اور ہر ایسی صورت میں کہ جب کسی شارع یا سڑک یا راستہ یا گھاٹ سے اترنے کی جگہ پر بھیڑ ہو یا اس کے بند ہو جانے کا احتمال ہو، رکاوٹ وغیرہ دور کرے۔

دفعہ 32: ہر ایسا شخص جو اوپر کی وضاحت کے تحت جاری کئے گئے احکامات کی مزاحمت یا نافرمانی کرے یا ایسے اجازت نامے کی شرائط کے خلاف کرے جو باجا بجانے کے لیے ہیں یا اجتماعات اور جلوسوں کے انتظامات کے لئے ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ یا اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس کی طرف سے دیا گیا ہو، اس کو مجسٹریٹ کے روبرو ثابت ہونے پر اس قدر جرمانہ ہوگا جو دوسو روپے سے زیادہ نہ ہو۔

دفعہ 33الف: کسی ایسے قصبے یا دوسرے مقام میں جہاں اس کو مناسب معلوم ہو ڈسٹرکٹ مجاز ہوگا کہ وقتاً فوقتاً اور ان احکام کے تابع جو کسی میونسپل یا دیگر حاکم مجاز کی طرف سے صادر ہوئے ہوں قواعد مرتب کرے اور احکام صادر کرے جن کی رو سے۔

الف: بعض سڑکوں یا مقامات کو ایسی مستثنیات کے ساتھ جو مناسب معلوم ہوں بوسیدہ عمارتوں یا کسی اور وجہ سے خطرے کی صورت میں بند کر دیا جائے گا۔

ب: عمارتوں، پلیٹ فارموں اور دیگر عمارات کی تعمیر، مرمت یا مسماری کے باعث لوگوں اور جائداد کو ایسے نقصان سے محفوظ رکھا جائے گا جس سے راہ گیروں، کسانوں یا عام لوگوں کو خطرہ ہوسکتا ہے۔

ج: کسی ہاتھی یا جنگلی یا خطرناک جانور کو کسی سڑک میں سے یا اس کے اندر لے جانے، ہانک کر لے جانے یا گزارنے کو باضابطہ بنایا جائے گا۔

د: کسی سڑک یا اس کے کسی حصہ میں کوئی رسی یا ڈنڈا لٹکانے یا رکھنے یا کوئی نوکیلا کونہ یا کوئی ایسی اور چیز بنانے کی ممانعت کی جائے گی جس سے آمدورفت روشنی یا ہوا کے آزادانہ طور پر آنے جانے میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہو۔

ہ: دن کے بعض ایسے اوقات مقرر کئے جائیں گے جن کے دوران کوئی بدبودار اور گندہ مادہ اور اشیا بعض سڑکوں میں واقع مکانات یا عمارتوں میں سے باہر یا ان کے اندر لے جانے کی ممانعت ہوگی نیز ان اوقات کے دوران مویشی سڑکوں پر بعض مصروف سڑکوں پر سے ہانک کر نہیں لے جائے جائیں گے ان ضوابط کے تابع جو وہ اس بارے میں مقرر کرے۔

و: گھاس پھونس یا کسی دوسرے مادہ کو جلانے یا اسے آگ لگانے یا کسی تقریب پر کوئی آگ وغیرہ جلانے یا لاپرواہی سے کوئی بارود والا ہتھیار یا ہوائی بندوق یا آتش بازی کی کوئی چیز چھوڑنے یا پھینکنے یا کوئی آگ والا غبارہ کسی سڑک، عمارت کے اندر یا اس کے اوپر یا اس سے پچاس فٹ کا اندر چھوڑنے یا سڑک کی کسی طرف یا اس کے بیچوں بیچ لیمپ یا روشنی کے کسی اور آلہ کو لٹکانے کے لئے کوئی ڈنڈا یا کوئی چیز رکھنے کی ممانعت کی جائے گی ان مناسب ضوابط کے تابع جو وہ اس بارے میں مقرر کر دے۔

ز: سوائے بعض ایسے ضوابط کے تابع جو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ عائد کرے کسی سڑک میں کوئی کھدائی یا عمارتی سامان یا دوسری اشیا رکھنے یا سڑک میں کسی گھوڑے یا دیگر جانوروں کو باندھنے یا ٹھہرانے کی ممانعت کی جائے گی۔

ح: ماسوائے ان ضوابط کے تابع جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے کسی ایسے شخص یا اشخاص یا مویشیوں کے برسرعام آنے، چلنے پھرنے کی ممانعت کی جائے گی جو کسی چھوت والی یا متعدی بیماری میں مبتلا ہوں اور نیز جانوروں کے مردہ جسم یا ان کے کسی حصہ اور متوفی اشخاص کی نعشوں کی نمائش یا نقل وحمل کی ممانعت کی جائے گی۔

ط: مویشی ذبح کرنے ان کے پنجروں یا چمڑے صاف کرنے یا بدبودار یا فاسد مادے کو دبانے یا رفع حاجت کے لئے مقامات مخصوص کئے جائیں گے۔

ی: انسانوں یا حیوانوں کی موجودہ یا ایسی متعدی امراض کی صورت میں جن کے پھوٹ پڑنے کا احتمال ہو اور عمارتوں کے ان قابضوں اور مکینوں کی طرف سے صفائی اور بدبو دور کرنے اور بیمار یا بیماری سے متاثرہ اشخاص یا جانوروں کی علیحدگی کا انتظام کیا جائے گا جس کے بارے میں وبائی روک تھام یا اس کے پھیلاؤ کو روکنے کی غرض سے صوبائی حکومت نے ہدایات یا منظوری دی ہو۔

ک: پانی کے کسی چشمہ وغیرہ یا حوض کو کلیتہ یا بعض اغراض کے لئے بند کرنے یا اس کا استعمال نہ کرنے یا اس کے استعمال کو چند اغراض کے لئے محدود کرنے کی ہدایت کی جائے گی اور چشمہ وغیرہ مذکورہ یا اس کے اندر موجود پانی کی ناپاکی روکنے کا انتظام کیا جائے گا۔

ل: ان اوقات کا تعین اور وہ طریق تجویز کیا جائے گا جس کے مطابق مردوں کا دفعیہ کیا جائے گا یا کوئی دھرم سالہ یا چوپال یا دیگر مقام یا پبلک آرام گاہ استعمال کی جائے گی تاکہ اس کو استعمال کرنے والے لوگوں کو مناسب اور مساویانہ مواقع اور گنجائش حاصل ہو اور ان کا آپس میں میل جول پر امن رہے۔

م: اشخاص، مویشی اور سواری کی گاڑیوں کی نقل و حرکت کی ایسے اوقات اور ایسے مقامات پر نگرانی کی جائے گی جن پر عوام کے تحفظ اور سہولت کے پیش نظر مجسٹریٹ مذکور کی رائے میں خاص ضوابط کی ضرورت ہو۔

ن: ان سڑکوں پر سواری کی گاڑیوں پر استعمال ہونے والے لیمپوں کی تعداد اور مقام اور وہ اوقات کا رمقرر کئے جائیں جن کے دوران میں وہ استعمال کئے جائیں گے۔

(2): دوسری ذیلی شق (ل) کے مردوں کے دفعیہ کے لئے استعمال ہونے والے کسی مقام کے بارے میں مرتب کردہ ہر ضابطہ ان عام اور مسلمہ رواجوں اور بعض صورتوں میں مردوں کے فوری دفعیہ کی ضروریات کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے وضع کیا جائے گا اور مجسٹریٹ ضلع کی طرف سے ضمنی شق ج،د،و،ز،ح،ط، یا ان کی اشاعت ضلع میں مروجہ زبان میں ایک نقل اس قصبہ یا مقام کی کسی سرکاری عمارت پر چسپاں کر کے کی جائے گی جس میں ضوابط مذکورہ نافذالعمل ہوتے ہیں اور ذیلی شق الف، ب، ی، ک، یا ل، کے تابع صادر

کردہ ہر قاعدہ یا حکم کی ایک نقل ضلع کی زبان میں اس عمارت، تعمیر، کارخانہ یا مقام کے نزدیک کسی پر چسپاں رکھی جائے گی جس سے وہ خاص طور پر تعلق رکھتا ہو۔

(3): دفعہ ہذا کی ذیلی دفعہ (1) کی ضمنی (ی) کے تحت جاری کردہ ہر قاعدہ کی اطلاع کمشنر کو فی الفور بھیجی جائے گی اور پندرہ دن سے زیادہ عرصہ کے لئے نافذ العمل نہیں رہے گی سوائے اس صورت کے کہ کمشنر نے اس بارے میں اس سے طویل تر عرصہ کے لئے توسیع کر دی ہو۔ ایسی صورت میں وہ قاعدہ اتنی مدت کے لئے نافذ رہے گا جس کی کمشنر ہدایت کرے۔

(4): جملہ متعلقہ اشخاص کا یہ فرض ہوگا کہ وہ مذکور الصدر طریق میں حسب ضابطہ صادر شدہ حکم کی اتنے عرصہ تک تعمیل کرتے رہیں جس کے لئے وہ نافذ العمل رہے۔

دفعہ 34: جو شخص کسی شاہراہ یا کسی کھلے مقام یا سڑک یا راستہ پر کسی ایسے شہر کی حدود کے اندر جہاں یہ دفعہ صوبائی حکومت نے خاص طور پر نافذ کر رکھی ہو، نیچے لکھے ہوئے جرموں میں سے کوئی ایسا جرم کرے جو باشندوں یا راہ گیروں کے حق میں رکاوٹ یا دقت کا اندیشہ یا خطرہ یا نقصان پیدا کرے اس کو کسی مجسٹریٹ کے روبرو مجرم ثابت ہونے پر جرمانہ ہوگا جو پچاس روپے سے زیادہ نہ ہو یا ایسی قید بامشقت یا بے مشقت ہوگی جس کی معیاد آٹھ دن سے زیادہ نہ ہو اور ہر عہدہ دار پولیس مجاز ہوگا کہ ہر ایسے شخص کو بلا وارنٹ گرفتار کرے جو اس کے سامنے ان جرموں سے کوئی جرم کرے یعنی۔

اول: جو شخص کسی مویشی کو ذبح کرے یا کوئی مرا ہوا جانور صاف کرے اور جو شخص سوار ہو کر کسی جانور کو بے پرواہی سے بہت تیز دوڑائے یا گاڑی میں کسی جانور کو بے پرواہی سے یا بہت تیز ہانکے یا کسی گھوڑے یا کسی اور چار پائے کو سدھائے یا نکالے۔

دوم: جو شخص کسی جانور کو ناحق یا بے رحمی سے مارے یا اس کے ساتھ بدسلوکی کرے یا اس کو ایذا پہنچائے۔

سوم: جو شخص کسی قسم کا کوئی جانور یا کوئی گاڑی اس سے زیادہ دیر تک کھڑی رکھے جو مال لادنے یا اتارنے کے لئے درکار ہو یا جو کوئی گاڑی اس طرح چھوڑ جائے کہ

عام لوگوں کی تکلیف یا خطرے کا باعث ہو۔

چہارم: جو شخص کوئی مال فروخت کے لئے باہر کھول کر رکھے۔

پنجم: جو شخص کوڑا کرکٹ یا میلہ، ملبہ یا پتھر کے ٹکڑے یا عمارت کا مسالہ پھینکے یا ڈالے یا جو کوئی شخص گوسالہ یا اصطبل یا اس کی مانند کوئی اور شے بنائے یا جو شخص کسی مکان یا کارخانہ یا گندگی کے ڈھیر یا اس کی مانند کسی اور جگہ سے کوئی بدبودار مادہ نکلنے دے۔

ششم: جو شخص نشہ میں یا غل مچاتا ہوا پایا جائے یا جو شخص آپ اپنی حفاظت کرنے کے لائق نہ ہو۔

ہفتم: جو شخص قصداً بے شرمی سے اپنا بدن کھولے یا کوئی مکروہ جسم کی بدنمائی یا بیماری دکھائے یا کسی ایسے تالاب یا حوض میں پیشاب کرے یا پاخانہ پھرے یا نہائے یا کچھ دھوئے جو ان کاموں کے لئے مخصوص نہ ہو۔

ہشتم: جو شخص کسی کنوئیں یا تالاب یا کسی اور خطرناک مقام یا عمارت کے گھیرنے یا اس کی واجبی حفاظت کرنے میں غفلت کرے۔

دفعہ 34 الف: جو کوئی شخص دفعہ 33 الف کے تحت مرتب شدہ کسی قاعدہ یا حکم کی خلاف ورزی کرے یا ایسے کسی جرم کے ارتکاب میں اعانت کرے اس کو ایسی سزائے جرمانہ دی جائے گی جس کی حد دو سو روپے تک ہو سکتی ہے۔

دفعہ 34 ب (1): جو عدالت دفعہ 36 یا دفعہ 34 الف کے تحت کسی قابل سزا جرم کی سماعت کر رہی ہ وہ مجاز ہے کہ ملزم سے تعمیل کرائے جانے والے سمن میں اس امر کا تذکرہ کرے اور وہ (الف) اصالتاً نہیں بلکہ وکیل کے ذریعے حاضر ہو سکتا ہے یا

ب: الزام کی سماعت سے پہلے کسی مقررہ تاریخ تک رجسٹرڈ چٹھی کے ذریعے الزام کا قصور وار نا تسلیم کر سکتا ہے اور عدالت کو اتنی رقم ارسال کر سکتا ہے جس کی حد پچیس روپے سے زیادہ نہ ہو یعنی جس کی تصریح عدالت کر دے۔

(2): شخص ملزم کو لازم ہے کہ اگر وہ اقبال جرم کرے تو وہ اپنا لائسنس (اگر کوئی ہو) عدالت مذکور کو ایک چٹھی کے ہمراہ جس میں اس کا استدلال درج ہو اس غرض سے بھیج

دے تاکہ اس کے لائسنس پر اثبات جرم کر دیا جائے۔

(3): جب شخص ملزم اقبال جرم کرے اور رقم ارسال کر دے اور ذیلی دفعہ 2 کے احکام کی تعمیل کر دے تو اس جرم کی بابت اس کے خلاف کوئی مزید کارروائی عمل میں نہیں لائی جائے گی نہ ہی اسے اقبال جرم کر لینے کی بنا پر لائسنس رکھنے یا حاصل کرنے کے نا اہل قرار دیا جائے گا۔

دفعہ 35: جو نالش زیر ایکٹ ہذا کسی عہدہ دار پولیس کے نام ہو جس کا درجہ کانسٹیبل کے درجہ سے اوپر ہو اس کی تحقیقات اور فیصلہ صرف ایسا عہدہ دار کرے گا جو اختیارات مجسٹریٹ عمل میں لاتا ہو۔

دفعہ 36: اس ایکٹ کے کسی مضمون سے یہ نہیں سمجھا جائے گا کہ اس امر کی ممانعت کہ کسی شخص پر کسی اور قانون یا ایکٹ کی رو سے کسی ایسے جرم کے عوض جو اس ایکٹ کی رو سے سزا کے لائق قرار دیا گیا ہو، مقدمہ چلایا جائے یا وہ شخص کسی قانون یا ایکٹ کی رو سے اس جرمانہ یا سزا کے سوا یا اس سے سخت تر کسی اور سزا یا جرمانے کا مستوجب ہو جو اس جرم کے لئے اس ایکٹ میں مقرر ہے مگر شرط یہ ہے کہ کسی شخص کو ایک ہی جرم کے عوض دو مرتبہ سزا نہیں دی جائے گی۔

دفعہ 37: مجموعہ تعزیرات ہند (پاکستان) کی دفعات 64 سے 70 تک احکام (مع ان دونوں دفعات کے) اور مجموعہ ضابطہ فوجداری 1898ء کی دفعات 382 سے 389 تک کے احکام (مع ان دونوں دفعات کے) جو جرمانوں کے بارے میں ہیں، ان تاوانوں او رجرمانوں سے متعلق ہوں گے جو اس ایکٹ کی رو سے کسی مجسٹریٹ کے روبرو جرم ثابت ہونے پر عائد کئے جائیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ بلالحاظ کسی مضمون کے جو مجموعہ تعزیرات ہند (پاکستان) کی دفعہ 65 میں درج ہے ہر شخص جس کی نسبت اس ایکٹ کی دفعہ 35 کی رو سے سزائے جرمانہ کا حکم صادر ہو اس جرمانہ ادا نہ کرنے کی صوررت میں اتنی مدت تک قید ہو سکتا ہے جو آٹھ دن سے زیادہ نہ ہو۔

دفعہ 41,40,39,38 منسوخ ہو چکی ہیں۔

دفعہ 42: تمام ایسی نالشیں اور استغاثے خلاف کسی شخص کے جو قانوناً کسی ایسے فعل کے بدلے دائر ہوسکیں جو اس ایکٹ کے احکام کے ماتحت یا ان عام اختیارات پولیس کے ماتحت جو اس ایکٹ کے ذریعے سے دیئے گئے ہیں، یا کئے گئے ہوں، جن کے کرنے کا ارادہ کیا گیا ہو۔ اس فعل کا واقعہ ہونے کے بعد سے جس کی بابت شکایت ہو، تین مہینے کے اندر شروع کی جائیں گی نہ کہ اس کے خلاف او رایسی نالش کی اور بنائے نالش کی تحریری اطلاع نالش سے کم از کم ایک مہینہ پہلے مدعا علیہ یا اس ضلع کے ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ یا اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ کو دی جائے گی، جہاں وہ فعل واقع ہوا ہو۔

کوئی مدعی کسی ایسی نالش میں کچھ نہیں پائے گا اگر نالش دائر کرنے سے پہلے مدعا علیہ نے کافی معاوضہ پیش کیا ہو یا اس کی طرف سے داخل کیا گیا ہو اور اگرچہ نہیں پائے گا جب تک کہ جج جس کے روبرو مقدمہ دائر ہو نالش کی نسبت اپنی منظوری کا سرٹیفکیٹ نہ دے۔

مگر ہمیشہ شرط یہ ہے کہ کسی صورت میں کوئی نالش دائر نہ ہو گی جبکہ عہدہ دار مذکور کے نام اسی فعل کے بدلے فوجداری استغاثہ ہو چکا ہو۔

دفعہ 43: جب کسی عہدہ دار پولیس کے خلاف بہ سبب کسی فعل کے کہ اس نے بحیثیت عہدہ دار پولیس کیا ہو کوئی نالش یا استغاثہ دائر ہو یا اس کی نسبت کوئی کارروائی کی ہو تو عہدہ دار مذکور کو جائز ہوگا کہ یہ عذر کرے کہ وہ فعل ایک ایسے وارنٹ کے زور پر اس نے کیا تھا کہ جو مجسٹریٹ کی طرف سے جاری ہوا تھا۔ اس وارنٹ کے پیش کرنے سے جس فعل مذکور کی ہدایت وہ اور جس پر مجسٹریٹ مذکور کے دستخط ہونا واضح ہو تو عذر مذکور ثابت ہو جائے گا اور تب مدعا علیہ اپنے حق میں ڈگری پانے کا مستحق ہوگا باوجود اس بات کے کہ اس مجسٹریٹ کے اختیار سماعت میں کچھ نقص ہو اور مجسٹریٹ مذکور کے دستخط ثبت کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی جب تک کہ عدالت کو اس کے اصل ہونے کا شبہ کرنے کی وجہ نظر نہ آئے۔

مگر ہمیشہ شرط یہ ہے کہ وارنٹ جاری کرنے والے حاکم کے خلاف چارہ جوئی میں جو فریق مذکور کرسکتا ہے اس دفعہ کے کسی مضمون سے کچھ خلل واقع نہ ہو گا۔

دفعہ 44: ہر عہدہ دار پولیس کا جو کسی تھانہ پولیس کا مہتم ہو یہ فرض ہوگا کہ ایک

عام روز نامچہ ایسے نمونے کا رکھے جو وقتاً فوقتاً صوبائی حکومت مقرر کرے گی اور اس میں تمام شکایات جو پیش کی جائیں اور الزامات جو لگائے جائیں اور تمام لوگوں کے نام جو گرفتار ہوں اور شکایت کرنے والوں کے نام او روہ جرائم جن کا الزام ان پر لگایا جائے اور وہ ہتھیار یا مال جو ان کے قبضے سے یا اور طرح پر برآمد ہو اور ان گواہوں کے نام جن کا بیان لیا جائے، درج کئے جائیں گے۔

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو اختیار ہوگا کہ روز نامچہ طلب کر کے معائنہ کرے۔

دفعہ 45: صوبائی حکومت ہدایت کر سکتی ہے کہ انسپکٹر جنرل اور دوسرے عہدہ داران پولیس ایسے نقشہ جات پیش کریں جو متذکرہ صوبائی حکومت مناسب سمجھے اور اس کو اختیار ہوگا کہ نمونہ مقرر کر دے جس کے بموجب نقشہ جات مذکور پیش ہوں۔

دفعہ40(1): یہ ایکٹ محض اپنے اثر سے کسی پریذیڈنسی یا صوبہ یا مقام میں نافذ نہ ہوگا مگر صوبہ کی حکومت کو اختیار ہوگا کہ وہ گزٹ سرکاری میں ایک حکم کے ذریعہ سے اس کل ایکٹ یا اس کے کسی حصہ کو کسی پریذیڈنسی یا صوبہ یا مقامیں نافذ کرے جس پر کل ایکٹ یا اس کا وہ حصہ جس کی اس حکم میں تصریح ہو اس پریذیڈنسی یا صوبہ یا مقام میں نافذ ہو جائے گا۔

(2): جبکہ کل ایکٹ یا اس کا کوئی حصہ اس طرح پر نافذ ہو جائے تو صوبائی حکومت کو اختیار ہوگا کہ وقتاً فوقتاً سرکاری گزٹ میں اشتہار کے ذریعے سے مندرجہ ذیل امور کے لئے ہذا کے مطابق قواعد بنائے۔

الف: اس ضابطہ کا انتظام جس کی پیروی مجسٹریٹوں او رپولیس کے عہدہ داروں کو کسی ایسی خدمت کے انجام دینے میں کرنی ضروری ہے جو اس ایکٹ کے ذریعے سے یا اس کی رو سے ان کے متعلق کر دی جائے اور

ب: اس وقت او رطریقہ اور ان شرائط کا مقرر کرنا جس کے اندر او رجس کے اور جن کے بموجب دفعہ 15۔الف کی رو سے معاوضہ کے لئے دعوے پیش کئے جائیں گے اور وہ تفصیلات جو ان دعووں میں درج کی جائیں گی اور وہ طریقہ جس پر ان کی تصدیق کی جائے گی اور وہ کارروائیاں (جن میں اگر ضرورت ہو تحقیقات موقع داخل سے) ان کی بنا پر عمل میں آئیں گی اور

ج: عموماً اس ایکٹ کے احکام کو موثر بنانے کے لئے۔

(3): تمام قواعد جو اس ایکٹ کی رو سے بنائے جائیں صوبائی حکومت وقتاً فوقتاً ان میں ترمیم یا اضافہ یا ان کو منسوخ کرسکتی ہے۔

دفعہ 47: صوبائی حکومت مجاز ہوگی کہ اس ایکٹ کو اپنے اپنے زیر انتظام علاقوں کے کسی حصے میں نافذ کرتے وقت اعلان کرے کہ جو اختیار اغراض پولیس کے لئے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کسی دیہاتی چوکیدار یا کسی اور دیہاتی عہدہ دار پولیس پر اس وقت عمل میں لاتا ہے یا لا سکتا ہے وہ اختیار ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عام حکومت کے تابع ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس عمل میں لائے گا۔

ماورائے قانون تشدد

صوبہ پنجاب کے ایک سابق انسپکٹر جنرل پولیس جناب فضل حق نے ''پاکستانی پولیس، تاریخی تجزیہ کے عنوان سے'' ایک مضمون روزنامہ جنگ 15 نومبر 1996ء میں لکھا، ''فرنگ نے پولیس ایک شہنشاہیت کی خدمت اور مضبوطی کے لئے بنائی تھی۔ یہ ڈھانچہ اس تنظیم سے جدا تھا جو فرنگی کی لندن پولیس کا تھا اور کیوں نہ ہوتا؟ لندن پولیس ایک جمہوری ملک کے دارالحکومت کی پولیس تھی۔ انڈین پولیس ایک کالونی کی پولیس تھی۔ یہاں پر پولیس کا ڈھانچہ فوج جیسا تھا۔ اس کی ہیئت ایک مضبوط مرکزیت پر مبنی تھی۔ وہ کسی مقامی جج کے سامنے جوابدہ نہ تھی۔ اس کو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے نام کا ایک مائی باپ بطور سرپرست عطا کیا گیا تھا۔ 1861ء میں بنائے گئے انڈین پولیس ایکٹ (اب پاکستان پولیس ایکٹ 1861ء) میں لکھا ہے۔'' ضلع کی پولیس، پولیس سپرنٹنڈنٹ نامی ایک افسر کے کنٹرول میں ہوگی اور اس پر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی جنرل نگہداشت ہوگی۔''

1861ء کے ایکٹ کے تحت پولیس کو کہیں یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی مشتبہ مشکوک یا ملزم فرد پر اسے اصل اور قرار واقعی مجرم سمجھ کر کسی نوعیت کا بھی تشدد کرے مگر ہمارے ہاں پولیس کے پاس تشدد کی ایسی ایسی صورتیں ہیں کہ الآمان والحفیظ: بعض صورتوں کی رونمائی۔

چھتر یا لتر:

جانٹا، چھانٹا، مکا اور ٹھڈا مارنے کی شریفانہ آزادی کے بعد کہ جسے سر عام بھی استعمال کیا جاتا ہے، تھانے کے اندر تشدد کی سب سے معمولی صورت چھتر یا لتر مارنا ہے۔ ملزم کو عموماً الٹا لٹا دیا جاتا ہے عام طور پر ایک پولیس والے کو اس کے اوپر کھڑا بھی کر دیا جاتا ہے اور پھر ایک نسبتاً زیادہ طاقتور پولیس والا بیس چوبیس انچ لمبا چمڑے کا بنا جوتا نما ٹکڑا ملزم کی ننگی پیٹھ پر پورے زور سے مارتا ہے۔ یہ کوڑے کی بدترین صورت ہے کیونکہ یہی چھتر

بعض اوقات ایسا بنا ہوتا ہے کہ ملزم کی یہ پہلی تواضع ہوتی ہے۔ اس تفتیشی تشدد میں اگر اس نے پولیس والوں کو مطلوبہ اطلاع خبر یا شے فراہم کر دی تو اس کی جان فوراً چھوٹ سکتی ہے ورنہ اس سے آگے کے مرحلے شروع ہوتے ہیں۔

ڈنڈا ڈولی:

ہوتا یہ ہے کہ ملزم کے بازوؤں او رٹانگوں میں اس طرح سے ڈنڈے پھنسا دیئے جاتے ہیں کہ نہ ملزم بیٹھ سکتا ہے نہ لیٹ سکتا ہے اور نہ ہی جسم یا ٹانگوں او ربازوؤں کو حرکت میں لاسکتا ہے۔ بس گلے میں پھندہ نہیں ڈالا جاتا باقی سارا کچھ گویا سولی پر لٹکنے کے برابر ہے۔ لمبے بالوں والے لوگوں (ماضی میں سکھ ملزموں کے ساتھ) یوں ہوتا تھا کہ ان کے بال ذرا اونچی کیل یا کھونٹے کے ساتھ باندھ دیئے جاتے تھے کہ ملزم درد سے بلبلاتا رہے۔ یہ وہ طریقے ہیں جن سے جسمانی ضرب کے آثار نہیں پکڑے جاسکتے اور کوئی میڈیکل رپورٹ تیار نہیں ہوسکتی۔ اسی طور ملزموں کو مسلسل جگا کر ان سے اپنی مرضی کے مطابق بیان اگلوائے جاسکتے ہیں۔

پاؤں کی تلیاں:

جسم کا یہ حصہ بڑا حساس او رنازک ہوتا ہے۔ چنانچہ ملزم کو الٹا لٹا کر اس کے پاؤں کے تلووَں پر بید مارا جاتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ عمل یہ ہوتا ہے کہ پانی سے بھری بوتل ان تلووَں پر ماری جائے، کچھ دیر تو ملزم یہ اذیت برداشت کر لیتا ہے مگر پھر بات برداشت سے باہر ہو جاتی ہے۔ اس تشدد سے جسم یا پاؤں پر کوئی ایسا نشان نہیں پڑتا کہ طبی اعتبار سے وہ تشدد کئے جانے کا ثبوت بن جائے۔

چار پائی کے پائیوں کے نیچے ملزم کے ہاتھ دبا کر چارپائی پر بوجھ ڈال دیا جاتا ہے۔ وسطی ایشیا کی ریاستوں میں خاوند بھی عورت کو اسی طور سزا دیا کرتے تھے کہ رات بھر بیوی کے ہاتھ دو پائیوں کے نیچے رکھ کر خود چارپائی پر سو جایا کرتے تھے۔

ملزم کو دو چار پائیوں سے اس طرح باندھ دیا جاتا ہے کہ اگر ان کو مخالف سمت کی طرف کھینچا جائے تو ملزم کو یوں لگتا ہے جیسے دو حصوں میں کٹ جائے گا او رجسم کے درمیان والی سیون ادھڑ جائے گی۔

رولر یا فولادی راڈ:

لوہے کا راڈ، لکڑی کا موٹا رول لے کر لٹائے گئے ملزم کی ٹانگوں پر دو آدمی اس طرح پھیرتے ہیں کہ تختہ مشق فرد کا رواں رواں درد سے بھر جاتا ہے راڈ کے اوپر ایک آدمی بوجھ بھی ڈال دیتا ہے۔ یہ انتہائی اعصاب شکن طریقہ ہے بعض اوقات انسان معذور بھی ہو جاتا ہے۔

جن دنوں میڈیکل رپورٹ کا حصول مشکل تھا (اور دور دراز کے علاقوں میں آج کل بھی) پلاس یا کسی دوسرے ذریعے سے ملزم کے ناخن کھینچے جاتے تھے۔ داڑھی مونچھوں اور جسم کے دوسرے حصوں سے موچنے کے ذریعے بال نوچے جاتے تھے۔

جن علاقوں میں سردی ہو یا جہاں ٹھنڈے پانی کے دریا یا ندی نالے بہتے ہوں وہاں ملزم کو لے جا کر پانی میں کھڑا کر دیا جاتا ہے' یہ عذاب بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اسی طرح بعض علاقوں میں اگر ملزم علاقے کے ندی نالوں یا نہروں سے واقف نہ ہو تو اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر پانی لے جایا جاتا ہے پھر اسے کہا جاتا ہے کہ وہ اقبال جرم کر لے ورنہ اسے نہر یا دریا میں ڈبو دیا جائے گا۔

تشدد کا ایک مہذب طریقہ عموماً پڑھے لکھے' تہذیب یافتہ یا سیاسی ملزموں پر استعمال کیا جاتا ہے انہیں بہت اچھا اور مرغن کھانا کھلایا جاتا ہے پھر انہیں سونے نہیں دیا جاتا۔ ملزم کو کھڑا رکھا جاتا ہے' آنکھ جھپکنے کی صورت میں تشدد کیا جاتا ہے اور جس نیند کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ سولی پر بھی آجاتی ہے وہ ملزم سے سینکڑوں کوس دور رکھی جاتی ہے۔

درخت کے ساتھ الٹا لٹکانا' نیچے دھواں کرنا' یا آگ پر مرچیں جلانا' لٹکے ہوئے آدمی کے ننگے تلووں پر بید مانا یا پانی کی بوتل مارنا' لٹکتے جسم پر لتر مارنا۔ جسم کو جلتے سگریٹ سے داغنا (یہ کام اب ذراطبی رپورٹ کے ڈر کے باعث کم کر دیا گیا ہے) یا زخموں پر نمک چھڑکنا' پسی ہوئی مرچیں ڈالنا یہ مرچیں بعض اوقات آنکھوں میں بھی ڈال دی جاتی ہیں۔

ملزم کے منہ پر گندگی باندھ دینا:۔

جسم پر چھری، چاقو یا استرے سے چر کے لگانا۔ تھانے کے غلیظ ترین حصے

گرمیوں میں بے شمار مچھر ہوں وہاں ملزم کو ننگے جسم باندھ دینا کہ ہاتھ بھی نہ ہلا سکے۔ ایسے درخت کے ساتھ باندھنا جہاں بڑے بڑے مکوڑے ہوں، جسم پر کچھ شیرینی گڑ وغیرہ لگا دینا۔

دو ملزموں کے ایک دوسرے سے بدفعلی پر مجبور کرنا۔ خواتین سمیت افراد خانہ کو ایک دوسرے کے سامنے ننگا کرنا مثلاً باپ کے سامنے بیٹی کو یا بیٹے کے سامنے ماں کو۔۔۔ یہ ذہنی تشدد کی بدترین مثال ہے اور ان دنوں اکثر یہ الم ناک مشق تھانوں یا خفیہ جگہوں پر کی جاتی ہے۔ عورتوں کے ساتھ جنسی تشدد بھی اب عام بات ہوگئی جس میں پولیس کے اہل کار بھی ملوث ہوتے ہیں۔ مردوں یا عورتوں کے ناک میں نکیل ڈال کر انہیں کتے کی طرح بھونکنے پر مجبور کرنا اور جانوروں کی طرح چلانا۔

مخالف سیاستدانوں سے بھی بہت ہی افسوس ناک سلوک کیا جاتا رہا ہے۔ انگریز کے عہد میں بھی اور انگریز سے بعد کے عہد میں بھی ایسا ہوتا رہا ہے۔ ضیاالحق کے مارشل لاء کے دنوں میں بے شمار سیاسی عورت اور مرد قیدیوں کے ساتھ ایسا ایسا سلوک کیا گیا کہ تفصیل سن کر آدمی دہشت زدہ رہ جاتا ہے۔ مثلاً ایک گریجوایٹ جوان عورت کے سیل (قلعہ لاہور 1980ء) میں جنسی تشدد کے لئے ایک بظاہر مہذب مگر بدنیت اور بدمعاش کو بھیجنا۔۔۔۔ پولیس کی عورتوں سے نظر بند خاتون کی جسم کی بے حرمتی کروانا۔۔۔۔

زمین پر سیدھا لٹا کر اور اس طرح باندھ کر کہ بندہ ذرہ بھر بھی نہ ہل سکے اوپر برف باندھ کر اس کا قطرہ ماتھے پر مسلسل گراتے جانا آدمی تھوڑے سے قطرے تو برداشت کر لیتا ہے مگر پھر یوں لگتا ہے گویا وقفے وقفے سے سر پر ہتھوڑا برسایا جا رہا ہے۔

ملزموں خصوصاً خواتین کے جسم پر کیڑے چھوڑ دینا۔ نیوی کے ایک کمانڈر پر الزام تھا کہ اس نے سارے عملے کی تنخواہ خود چرالی تھی مگر کہا کہ رقم کسی اور نے چوری کر لی ہے۔ یہ کراچی کا واقعہ ہے ان دنوں ابھی بڑے لوگ بھی قانون سے اتنی آسانی سے نہیں بچا کرتے تھے جتنی آسانی سے اب بچ جاتے ہیں، کمانڈر صاحب پکڑے گئے، پھر ان کی بیگم پکڑی گئیں اور بیگم کی شلوار میں جب چوہے چھوڑے گئے تو رازافشا ہوگیا۔ لاکھوں کی رقم برآمد ہوگئی۔ سو تشدد کی ایک صورت یہ بھی ہے۔

جدید سہولتیں میسر آنے پر تشدد کی نت نئی صورتیں بھی دریافت کر لی گئیں مثلاً بجلی

آنے سے بجلی کے جھٹکے دیئے جاتے ہیں۔ ان جھٹکوں سے شیر ببر سرکس میں غلام بے دام بن جاتا ہے تو پھر آدمی تو نسبتاً نازک مخلوق ہے۔ یہ جھٹکے عورتوں کی شرم گاہوں میں بھی دئے جاتے ہیں۔ ہاتھوں کو بھی چھلنی کر دیا جاتا ہے۔

ریکارڈ کیا گیا شور، رونا، دھونا، چیخیں:۔

ملزم کے ساتھ کے ملحقہ کمرے سے ایسی ریکارڈ شدہ آوازیں بلند کر دی جاتی ہیں کہ اس سے وہ دہشت زدہ ہو کر جعلی یا اصلی اقبال جرم کر لے۔ تیز آوازیں تیز روشنی بھی تشدد کا ایک وسیلہ ہیں اب ان کا بھی عام استعمال ہو رہا ہے۔

تشدد کی ان صورتوں میں آدمی کو موت کا نشانہ نہیں بنایا جاتا تھا یعنی تشدد کیا جاتا ہے مگر زندہ رکھا جاتا ہے لیکن اب جبکہ تشدد دنیا بھر میں ایک کلچر بن گیا ہے اور وقت کی رفتار تیز ہوگئی اور اسی تناسب سے نتائج حاصل کرنے کے لئے تفتیشی عمل بھی تیز تر ہوگیا ہے تو اس تشدد میں کئی لوگ جان ہار جاتے ہیں۔ 1970ء میں لاہور میں ایک بوڑھے عیسائی کو صدر کے تھانے میں تشدد سے مار دیا گیا تھا مگر لوگوں نے تھانے کا ایسا گھیراؤ کیا کہ پولیس کے اعلیٰ حکام کو مصیبت پڑگئی۔ مگر اب ایک ایک تھانے میں کئی کئی لوگ تشدد سے مارے جاتے ہیں، پولیس مقابلوں میں مرنے والوں کی تعداد سینکڑوں تک پہنچ چکی ہے۔ کراچی میں دوطرفہ تشدد، پھر افغانستان میں موت بانٹتے جہاد کے سبب تشدد اور غارت گری روائتی تشدد تک محدود نہیں رہی اس سے بہت آگے نکل گئی ہے۔ پولیس کی تعریف آج بھی شائد اتنی ہی سچی ہے جتنی انڈین (پاکستان) پولیس ایکٹ 1861ء کے بننے سے سترہ سال پہلے 1844ء میں ایک اعلیٰ افسر سر ڈبلیو۔ ایچ۔ سلی مان Sir W.H. Saleeman نے اپنی کتاب Rambles and Recollections of an Indian Official میں لکھی اور روزنامہ ڈان (25 مارچ 1997ء) کے مضمون نگار ایم اے ایچ نے اپنے مضمون Police the Culture of Torture میں پیش کی ہے۔ سر سلی مان کہتا ہے۔ "پولیس افسر اصل مجرم کو پکڑنے یا اسے ملزم قرار دینے سے ڈرتے ہیں ۔۔۔۔ وہ اصل مجرموں کے چہروں سے نقاب نہیں اٹھنے دیتے تاکہ ان کی لوٹ مار میں حصہ دار بن سکیں۔ یا پھر وہ یہ کرتے ہیں کہ معصوم لوگوں کو پکڑ لیتے ہیں انہیں ڈرا دھمکا کر اقبال جرم کرا لیتے ہیں اور ایک

اورصورت یہ ہوتی ہے کہ اصل وقوع یعنی واردات کو ہی گول کر دیتے ہیں۔ پولیس والوں میں پائی جانے والی رشوت اور بدعنوانیاں دیکھ کر بھی ان لوگوں کے دلوں میں پولیس کے لئے کوئی نفرت کوئی غصہ پیدانہیں ہوتا جن میں وہ رہتے ہیں اور جن کے لئے انہیں قانون کے نفاذ کی خاطر متعین کیا جاتا ہے .... اگر کسی گاؤں میں ڈکیتی کی واردات ہو جائے تو یہ ڈکیتی خود پولیس کے لئے یافت کا بڑا پرمایہ وسیلہ بن جاتی ہے۔ جس شخص کے ہاں چوری ہوتی ہے وہ بھی پولیس کی جیب گرم کرتا ہے اور پھر گاؤں کے سارے لوگوں کو یہ نذرانہ پیش کرنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔''

تشدد کی ایک یہ صورت بھی ہے جو جسمانی تشدد کے کسی زمرے میں نہیں آتی مگر اس میں ہر نوع کا تشدد حتیٰ کہ روحانی تشدد بھی شامل ہو جاتا ہے۔ ایم۔اے۔ اچ کا کہنا ہے کہ پاکستان کے اعلیٰ پولیس افسروں میں ماسوائے ایک دو کے کسی نے بھی اپنی ایسی یادداشتیں نہیں لکھیں جن میں پولیس کے غیر قانونی، غیر اخلاقی تشدد' پولیس مقابلوں' ماورائے عدالت قتل کے واقعات بیان کئے گئے ہوں لیکن ہمارے ہمسایہ ملک ہندوستان میں متعدد اعلیٰ پولیس افسروں نے (کے۔ ایف۔ رستم' جی۔ بی۔ این ملک' این۔ کے۔ سنگھ وغیرہ) نے پولیس کے حوالے سے اپنے تجربوں کا ذکر کیا۔ ان کتابوں میں اسی سال (1997ء) مشرقی پنجاب کے سابق انسپکٹر جنرل بھگون سنگھ دانیوالیا کی کتاب'' بیسویں صدی کے پنجاب میں پولیس اور سیاست'' کا اضافہ ہوا ہے۔ اس کتاب میں دانیوالیا نے کھل کر اعتراف (اقبال) کیا ہے کہ اس کے عہد میں ماورائے عدالت قتل ہوئے ہیں اور خود اس نے (بزعم خود جج سمجھتے ہوئے) موت بانٹی ہے۔''

اس ضمن میں اکثر یوں بھی ہوا کہ ماورائے عدالت' یا زیر حراست ملزم کو پولیس مقابلے میں مارنے یا براہ راست مقابلے میں ملزموں کو قتل کرنے والے پولیس ملازمین کو انعامات یا ترقی دینے کی روائت بھی قائم کر دی گئی۔ یقیناً آج سے نہیں مدتوں سے یہ سلسلہ جاری ہے اور اس انتہائی ناپسندہ ناجائز اور ممنوع طریق کے بارے میں لاہور ہائی کورٹ نے اکتوبر 1996ء میں ایک ایسے ہی مقدمہ میں اپنے مشاہدات بھی لکھے۔ یہ تحریر درحقیقت کل اور آج کی پولیس کی اس نوع کی کارکردگی پر ایک تاریخی تبصرہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ عدالت نے لکھا ماورائے عدالت قتل کرنے والے پولیس افسروں کو نقد انعام دینا

انصاف کا مذاق اڑانے کے مترادف ہے۔ ماورائے عدالت قتل درحقیقت قانون کی مٹی پلید کرنے کے مترادف ہے اور یہ فعل ناقابل معافی ہے لیکن ہوتا یوں ہے کہ پولیس کے اعلیٰ افسر پولیس کی طرف سے طاقت کے بے محابا استعمال کے بارے میں حقیقت جاننے کی سعی کرنے کی بجائے ایسے واقعات میں ملوث ماتحتوں کا دفاع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

عدالت نے شاہ پور صدر پولیس سٹیشن میں درج قتل کے ایک مقدمے کے حوالے سے کہا کہ ہرڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اپنے ضلعے میں فوجداری انتظام کا بھی سربراہ ہوتا ہے اور پوری پولیس پر اسے کنٹرول دیا گیا ہوتا ہے ان کا فرض ہے کہ وہ تھانوں کا معائنہ کریں ۔مگر وہ سپرنٹنڈنٹ پولیس سے اچھے تعلقات رکھنے کی خاطر اپنے اس اختیار سے دستبردار ہو جاتے ہیں۔ انسپکٹر جنرل پولیس کو یہ امر یقینی بنانا چاہئے کہ اس کے گزیٹیڈ افسر ذاتی طور پر فوجداری تفتیش کی نگرانی کریں، ہر پولیس سٹیشن اور چوکی کا پولیس ایکٹ کے تحت بنائے گئے ضوابط کے مطابق سال میں کم از کم دو بار معائنہ کریں۔

گزیٹیڈ افسروں کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ تازہ جرائم کے بارے میں اندراجات اور روزنامچوں کا بھی معائنہ کریں۔ جائے واردات کا بھی معائنہ کریں اور شکائت کنندگان، گواہان اور دوسرے باخبر لوگوں سے بھی بات چیت اور پوچھ گچھ کریں مگر یہ گزیٹیڈ افسران یہ سارا کام اپنے ماتحت ملازمین پر چھوڑ دیتے ہیں۔وہ صرف ایک کام کرتے ہیں کہ وہ ادھر یا ادھر کے دباؤ کے تحت تفتیش یا تحقیقات ایک پولیس ملازم سے لے کر دوسرے پولیس ملازم کو دے دیتے ہیں۔

ایف ۔آئی۔آر:

ہائی کورٹ میں پولیس والوں کے خلاف بے شمار ایسی شکائتیں موصول ہوتی ہیں کہ ان کی ایف آئی آر درج نہیں کی جاتی، پولیس تفتیش میں کوئی دلچسپی نہیں لیتی، مجرموں خصوصاً مفروروں کو پکڑا نہیں جاتا، تفتیش ایک سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کر دی جاتی ہے، مقررہ وقت کے اندر تحقیقات مکمل نہیں کی جاتی۔

رشوت اور دوسری بدعنوانیوں کے علاوہ پولیس پر یہ الزامات بھی ہیں کہ وہ مطلوبہ مجرموں یا ملزموں کی خواتین کو ہراساں کرتی ہے۔، جعلی مقابلے کراتی ہے، جب اسے جرم یا

واردات کے بارے میں وقت اطلاع فراہم بھی کر دی جائے تب بھی وہ کوئی انسدادی کارروائی کرنے میں ناکام رہتی ہے اور یہ کہ پولیس خود بھی جرائم میں ملوث ہوتی ہے۔

عدالت نے لکھا:

پولیس افسر قانونی طور پر پابند ہے کہ اسے ایک قابل دست اندازی جرم یا واردات کے بارے میں جو بھی اطلاع ملے اسے فوراً رجسٹر میں درج کرے۔ ایف آئی آر درج کرنے کا واحد مدعا یہ ہوتا ہے کہ قانونی مشینری اس ضمن میں حرکت میں آجائے اور اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ رسمی طور پر مقدمہ درج کرنے سے پہلے ابتدائی انکوائری کی جائے۔

جو پولیس افسر مقدمہ درج کرنے سے انکار کرتا ہے وہ اپنے اس فعل پر پولیس ایکٹ کی دفعہ 29 کے تحت تین ماہ قید کی سزا کا مستوجب ہو جاتا ہے' محکمانہ کاروائی اس پر مستزاد ہے۔ ایف آر درج نہ کرنا سی پی سی کے چودھویں باب کی دفعات اور پولیس ایکٹ کی دفعہ 23 کی بھی خلاف ورزی ہے۔

آج کل ملزم کے خلاف درج کی گئی ایف آئی آر کی نقل اسے فراہم نہ کرنا ایک معمول سا بن گیا ہے۔ یوں ان کے لئے قانونی امداد حاصل کرنا مشکل بنا دیا گیا ہے۔ چونکہ وہ اپنے وکیل کو ایف آئی آر میں درج مواد کے بارے میں صحیح اطلاع ہی نہیں دے سکتے اس لئے وہ تو ضمانت تک کے لئے درخواست دینے کی پوزیشن میں بھی نہیں ہوتے۔ اس مشکل پر قابو پانے کیلئے مناسب ہوگا کہ مقررہ فیس کی ادائیگی پر ایف آئی آر کی نقل ملزم پارٹی کو تھانوں سے ہی فراہم کی جائے۔

مقدمات کی ڈائریوں کے بارے میں کسی قسم کی راز داری نہیں رکھی جاتی۔ عموماً یہ ہوتا ہے کہ سپرنٹنڈنٹ پولیس یا عدالت تک پہنچنے سے پہلے ہی یہ ملزموں کے ہاتھ لگ جاتی ہیں اور خدشہ یہ ہوتا ہے کہ مجرم وہ شواہد ہی ضائع کر دیں جو ان کے جرم میں ملوث ہونے کا ثبوت ہوتے ہیں۔ سینئر پولیس افسران کو ان ڈائریوں کو رازداری میں رکھنے کا فیصلہ کرنا چاہئے تاکہ مجرم اپنے متوقع اٹھائے جانے والے قدم یا طریق کی پیش بندی کرنے کی پوزیشن میں نہ ہوں۔

تفتیشی افسروں کی عموماً اچھی تربیت نہیں کی جاتی اور انہیں قانونی دائرے کے اندر رہ کر موثر شہادت حاصل کرنے کا موقعہ حاصل ہوتا ہے۔ ہر چند عدالتوں نے ان تفتیشی افسروں پر زور دیا ہے کہ وہ مؤثر برآمدگیوں کے سلسلے میں زیادہ سے زیادہ عام لوگوں کی شہادت حاصل کریں مگر وہ عدالت کی اس بات کو بالکل نظر انداز کردیتے ہیں۔ بعض اوقات یہ الزام بھی لگایا جاتا ہے کہ تفتیش یا تحقیقات ایسے افسروں نے کی جو اس کے مجاز ہی نہیں تھے۔ ہر چند قانون بعض افسروں کو کسی کے ہاں تلاشی اور تفتیش کا اختیار دیتا ہے مگر عموماً اس قانون کی بھی خلاف ورزی کی جاتی ہے اور مقدمات ایسے افسر درج کرتے اور پھر تفتیش کرتے ہیں جنہیں اس کا قانوناً کوئی اختیار ہی نہیں ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مقدمہ آگے چلنے سے پہلے ختم کر دیا جاتا ہے یا مجرم بری ہو جاتے ہیں۔ اس لئے پولیس حکام کو چاہئے کہ وہ اپنے ماتحت ملازموں کی مناسب تعلیم و تربیت کریں۔

پولیس کو مختلف نوعیت کے فرائض ادا کرنے پڑتے ہیں جس کی وجہ سے تفتیش اور تحقیقات کا معیار بہت گر گیا ہے۔ انہیں استقبالیہ (پروٹوکول) فرض بھی ادا کرنا پڑتا ہے' تفتیش بھی کرنا ہوتی ہے' مجرموں کو بھی قابو کرنا ہوتا ہے اس کے ساتھ امن و امان کو بحال رکھنے کے لئے احتیاطی اقدامات بھی کرنے پڑتے ہیں جبکہ دوسرے ممالک میں پولیس کو صرف مخصوص فرائض سونپے جاتے ہیں اور وہ انہی پر اپنی توجہ مرکوز رکھتی ہے۔ تجویز کیا جاتا ہے کہ پولیس کو مخصوص اور واضح فرائض سونپے جائیں تا کہ وہ ان پر پوری پوری توجہ دے سکے۔

فوجداری مقدمات کی از سر نو تفتیش ایک طرح سے یہ نیا کاروبار ہے اور اس کے بارے میں سپریم کورٹ کی رائے ہے کہ از سر نو تفتیش کرانے کا رواج ابھی ہوا ہے یہ تفتیش با اثر لوگوں کے کہنے پر اپنے حق میں نتائج حاصل کرنے کے لئے کی جاتی ہے اس سے عدالتوں کو صحیح نتائج پر پہنچنے میں کوئی مدد نہیں ملتی بلکہ اس طرح مزید پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔

ہائی کورٹ کا اختیار :

آئین کی دفعہ 199 کے تحت ہائی کورٹ کو اختیار ہے کہ آئین کی دفعہ 4 کے تحت معاملات میں از خود مداخلت کر سکے۔ آرٹیکل یہ ہے کہ ہر شہری کو یہ ناقابل تنسیخ حق حاصل

ہے کہ اس کے ساتھ قانون کے مطابق سلوک کیا جائے اور اسے قانون کا تحفظ حاصل ہو۔ آرٹیکل 9 کے تحت کسی شخص کو زندگی یا آزادی سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔ بجز قانون کی مطابقت میں آرٹیکل گرفتاری یا نظر بندی سے تحفظ فراہم کرتا ہے۔ اس کے مطابق کسی شخص کو وجہ بتائے بغیر نہ گرفتار کیا جائے گا نہ حراست میں رکھا جائے گا۔ جس شخص کو گرفتار کیا جائے یا حراست میں رکھا جائے اسے چوبیس گھنٹے کے اندر اندر نزدیکی مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کردیا جائے گا۔ مجسٹریٹ کی منظوری کے بغیر اسے چوبیس گھنٹے سے زائد عرصہ حراست میں نہیں رکھا جاسکتا۔

آئین کے آرٹیکل 14 کے تحت نہ تو کسی فرد کی عزت پر ہاتھ ڈالا جاسکتا ہے نہ اس کے گھر کی پرائیویسی کو توڑا جاسکتا ہے بجز قانون کے ۔ اس کے تحت یہ بھی ہے کہ گواہی یا شہادت حاصل کرنے کے لئے کسی شخص پر تشدد نہیں کیا جائے گا۔

ایک شہری کے متذکرہ بالا بنیادی حقوق کی خلاف ورزی ہونے پر جب ہائی کوٹ کو باخبر کیا جائے تو پھر اسے آرٹیکل 199 کے تحت حاصل صوابدیدی اختیارات کے تحت فوراً معاملہ کی تحقیقات کرنی چاہئے اور ہر معاملہ کے حقائق و آثار کی روشنی میں منصفانہ قانونی حکم دینا چاہئے ۔ سپریم کورٹ کا کہنا ہے کہ اگر پولیس یا استغاثہ بدنیتی کی بنا پر کسی کی ذاتی آزادی میں مداخلت کرتی ہے' یا زیر حراست فرد سے بیان یا گواہی لینا چاہتی ہے تو ایسی صورت میں اعلیٰ عدالتوں کو فوری طور پر مداخلت کر کے شہریوں کو ریلیف دینا چاہئے۔

اگر پولیس اور صوبے کی انتظامیہ اپنے فرائض قانون کی حدود کے اندر رہ کر ادا کریں تو پھر عدلیہ کی طرف سے مداخلت کا کوئی موقع ہی پیدا نہیں ہوگا۔ ویسے بھی تفتیش کے معاملات عدلیہ میں بار بار جانے سے ملزموں سے ناحق امتیاز برتا جاسکتا ہے اور صحیح تفتیشی عمل کے لئے بھی نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے۔ تاہم تفتیشی افسروں کو یہ حق نہیں ہوتا کہ وہ اپنی مرضی سے تفتیش کریں اور خود کو تفتیش پر مکمل طور پر بااختیار جانیں۔ عدالت مجاز افسروں کو ہدائت کرسکتی ہے کہ وہ ایک معقول عرصہ کے اندر اندر اپنی رپورٹیں مکمل کریں۔

پولیس کے خلاف ایک اور تلخ شکائت بھی ہے کہ پولیس جو مال برآمد کرتی ہے اس کی مقدار یا تعداد کم لکھتی ہے۔ یہ برآمد شدہ مال مالخانہ میں جمع کیا جاتا ہے جہاں سے پولیس خود یہ مال اڑا لیتی ہے۔ یہ بات اکثر دیکھی گئی ہے کہ پولیس جب چوری شدہ گاڑی

وغیرہ برآمد کر لیتی ہے تو مالکان کو اطلاع نہیں دیتی بلکہ اسے ذاتی استعمال میں لے آتی ہے۔ اور بعض اوقات تو وہ نئی گاری کی جگہ پرانی گاڑی تھما دیتے ہیں۔

یہ بات بھی عدالت کے نوٹس میں آئی ہے کہ پولیس ثروت مندلوگوں سے مال لینے کے لئے ملزموں کے بیانات میں ایسے لوگوں کو بھی ملوث کر لیتی ہے جب پیسے مل جاتے ہیں یا کام نکل جاتا ہے تو پھر یہ کہہ کہ ان لوگوں کے نام مقدمے یا روزنامچے میں سے نکال دیئے جاتے ہیں کہ'' بعد کی تحقیقات سے ان لوگوں کا ملوث ہونا ثابت نہیں کیا جاسکا۔''

عدالت نے کہا کہ پولیس اصل ملزموں یا خطا کاروں پر ہاتھ ڈالنے کی بجائے بالکل ہی بے گناہ لوگوں کو اپنی تفتیش میں شامل کر لیتی ہے۔ ان کے خلاف جھوٹی گواہیاں اکٹھی کر کے ان کا چالان کردیتی ہے۔ دارصل اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ حکام بالا کو یقین دلا دیا جائے کہ مجرم پکڑنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی جارہی۔ ان کے چالان کئے جارہے ہیں اور پھر جب ایسے ملزمان شہادت اور ثبوت کی کمزوری کی بنا پر بری ہوجاتے ہیں تو الزام عدالتوں پر لگادیا جاتا ہے۔

پولیس والوں کے بارے میں ایک اور شکائت ان کی طرف سے سڑکوں خصوصاً شاہراہوں پر لگائے گئے ناکوں کے بارے میں ہے۔ پولیس لاتعداد ناکے لگاتی ہے مگر اشارہ کوئی نہیں لگاتی' خصوصاً رات کو گاڑیوں ٹرکوں کو اچانک بریکیں لگانے پر مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ چیکنگ کے لئے رک جائیں ۔ یوں پولیس لوگوں کی جان کے لئے ایک طرح کا خطرہ بن جاتی ہے۔ شہروں میں بھی ناکوں کی افادیت کے بارے میں بڑی لے دے ہوتی ہے کیونکہ پولیس ٹریفک کی خلاف ورزی اور جرائم رکنے کی بجائے شادی شدہ جوڑوں سے نکاح نامے کی نقلیں مانگنے لگتی ہے۔

(روزنامہ ڈان 25 اکتوبر 1996)

لاقانونیت' تشدد' بدزبانی اور غیرانسانی سلوک صرف آج کی یا ۱۹۴۷ء کے بعد کی پولیس سے ہی خاص نہیں یہ کام پہلے بھی کیا گیا مگر بعض واقعات میں ایسے لگتا ہے کہ بدزبان اور تشدد ملازمین سے ''مناسب'' سلوک بھی کیا گیا۔

پنجاب پولیس کے پڑھے لکھے ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس ۔ این ۔ اے رضوی نے

اپنی کتاب Our Police Heritage میں اسی قسم کا ایک واقعہ لکھا ہے۔ جہلم کا سپرنٹنڈنٹ پولیس پی۔ اے ہیرن P.A. Heron ماتحت عملہ سے انتہائی بد زبانی کرتا اور گالی دینے دے بھی باز نہ آتا۔ اولاً ماتحت دیسی عملہ برداشت کرتا رہا مگر ایک مرحلہ ایسا آیا کہ سبھی ماتحت ہم مشورہ ہوئے اور پھر لوگوں کے استعفےٰ آنے شروع ہو گئے' پہلا استعفےٰ 28 اگست 1931ء کو پولیس لائنز کے ایک افسر کی طرف سے آیا اور اس کے بعد ماتحت عملے نے باوردی ہو کر لائنز سے ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی تک اجتماعی جلوس نکالا' ڈپٹی کمشنر نے ان کی بات سننے سے انکار کر دیا۔ اسی روز بعد میں ایس پی نے پولیس والوں کو ایک لائن میں کھڑا ہونے کا حکم دیا۔ مگر احتجاج کرنے والوں نے انکار کر دیا اور ایک بار پھر وہ گروپوں کی شکل میں ڈپٹی کمشنر کے پاس یہ درخواست لے کر گئے کہ وہ ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس کو اپنی شکایات سنانا چاہتے ہیں۔ بدقسمتی یہ ہوئی کہ ڈی آئی جی نے ان لوگوں کو ایس۔ پی۔ ہیرن ہی کے دفتر میں ملاقات کے لئے بلالیا اس سبب پولیس والوں میں اشتعال پھیلا۔ جب ڈی آئی جی نے لائنز کا معائنہ کیا اس موقع پر ماتحت پولیس والوں نے اپنی پیٹیاں اتار کر بطور احتجاج ڈی آئی جی کے آگے پھینک دیں۔ پولیس کے باغیانہ مزاج کی ہوا چکوال اور پنڈدادن خان کی طرف بھی اڑنے لگی اور سرائے عالمگیر میں بھی مقامی پولیس کے رویئے میں تبدیلی نظر آنے لگے۔ انتظامیہ نے فوج کے مقامی کمانڈر (ظاہر ہے انگریز ہوگا) سے پولیس کو درست کرنے کے لئے مدد مانگی' مگر اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ یہ جراثیم اس کے (دیسی) سپاہیوں کو بھی لگ سکتے ہیں اور آخر کار ایس۔ پی۔ ہیرن سے کہا گیا کہ واپس انگلینڈ چلا جائے جب وہ چلا گیا تو پھر مقامی ماتحت پولیس والے واپس اپنی ڈیوٹی پر آئے۔

رضوی صاحب نے 60-1830ء کے درمیان غیر منقسم ہندوستان کے ان صوبوں کی پولیس کی کارکردگی کا بھی ذکر کیا ہے جو باقاعدہ صوبے (یعنی جو گورنر کے صوبے تھے) تھے۔ ہر صوبے میں پولیس سے لوگوں کو بہت سی شکایات تھیں، کارکردگی غیر تسلی بخش تھی اور یہ سلسلہ شکایات لارڈ بینٹک (35-1828ء) کے زمانے سے شروع ہوا تھا۔ آبادی کے مقابلے میں پولیس کم تھی یا زیادہ تھی ہر جگہ ایک ہی شکایت تھی کہ اس کا رویہ لوگوں کے ساتھ بہت جابرانہ ہوتا ہے۔ پولیس بدعنوان اور رشوت خور تھی، نظم و ضبط سے بھی عاری تھی اس کی نگرانی بھی مناسب نہیں ہوتی تھی۔ جن لوگوں پر کچھ الزام ہوتا ان کو بغیر وارنٹ کے

حراست میں لے لیا جاتا، قید کر دیا جاتا تاکہ ہتھیلی گرم کی جا سکے۔ سر رابرٹ فریئر کی 1860ء کی تقریر، 3-1902ء کی پولیس کمیشن رپورٹ اور کورٹ آف ڈائریکٹر کے 23 اگست 1854ء کے خط کے مطابق پولیس کی رشوت خوری، نااہلی، بدنظمی، عوام دشمنی کی بنا پر یہ بھی کہا جانے لگا تھا کہ اس محکمہ پر بلاوجہ پیسہ برباد کیا جا رہا ہے، اس محکمہ کو ہی توڑ دیا جائے جو پر امن، مہذب لوگوں کو تو طرح طرح کے الزامات لگا کر ذلیل اور پریشان کرتا ہے مگر جسے چورا چکے اور جرائم پیشہ نظر ہی نہیں آتے۔ پولیس میں کئے جانے والے تشدد کے بارے میں مدراس میں 1855ء میں ایک تحقیقاتی کمیشن قائم کیا گیا تھا اس کا نام بھی ٹارچر کمیشن رکھا گیا تھا۔ اس کے سامنے اس نوعیت کے بیان دیئے گئے کہ پولیس پر خرچ کی جانے والی رقم حکومت کے لئے بدنامی اور نفرت خریدتی ہے۔ پولیس سوسائیٹی کی سب سے زیادہ مکروہ چیز بن چکی ہے۔ پولیس دہشت کی علامت بن چکی ہے اور رعایا میں جو اضطراب اور بے اطمینانی پائی جاتی ہے اس کی پوری نہ سہی آدھی ذمہ داری پولیس پر آتی ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹر اس نتیجے پر پہنچے ہوئے تھے کہ پولیس افسوس ناک حد تک ناکام ہو گئی ہے مجرم پکڑنے اور جرائم کا سراغ لگانے میں اور قانون کی خلاف ورزی روکنے میں یہ بالکل بیکار ثابت ہو رہی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ پولیس کے افراد مقامی ہیں، باقی علاقوں سے کٹے ہوئے ہوتے ہیں چنانچہ جرائم کو روکنے کے اہل نہیں اور انہیں جو اختیارات حاصل ہیں وہ صرف ناجائز کمائی کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ دیانتدار ہوں گے مگر چند ایک باقی ساری نفری بدعنوان اور حرام خور ہے اور عوام پر جبر بن کر نازل ہوتی ہے۔ انگریز حاکم بڑے پریشان تھے اور اس پریشانی میں انہوں نے پولیس کو بہتر بنانے کے لئے عجلت میں وسیع پیمانے پر تجربے کئے۔ مگر بدقسمتی سے ان تجربوں کا الٹا اثر ہوا اور نہ صرف تفتیش کی شکل وصورت اور طریقہ کار بگڑ گیا بلکہ مختلف النواع جرائم کی نوعیت اور شدت بھی بدل گئی۔ بنگال میں داروغہ کو چھوٹے چھوٹے مقامات میں پوچھ گچھ کا اختیار نہیں تھا البتہ زیادہ سنگین معاملات سے نمٹنے کے لیے اسے مکمل اختیار دیا گیا تھا جو اختیار دوسرے صوبوں میں نہیں دیا گیا تھا۔ جنوبی صوبوں میں داروغہ کا مالیہ یا ٹیکس اکٹھا کرنے سے کوئی تعلق نہیں تھا مگر شمال مغرب میں (یوپی وغیرہ میں) داروغے ریونیو افسر کا کام بھی کرتے تھے۔

بنگال میں امن و امان میں ناکامی کے اسباب کا پتہ لگانے کے لئے 1801ء

میں ایک کمیٹی مقرر کی گئی۔ ایسی ہی کمیٹی 1806ء میں مدراس میں قائم ہوئی۔ 1813ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر اختیار تمام ہندوستانی علاقوں میں پولیس اورعدلیہ کی کارکردگی کا جائزہ لینے کے لئے ایک اور کمیٹی بنائی گئی۔ 1816ء میں کمیٹی کی سفارش کے تحت داروغہ والا سلسلہ ختم کر کے مقامی امن وامان کے لئے دیہی پولیس بنانے پر زور دیا گیا۔ دلیل یہ تھی کہ شکل وصورت عادات و رسوم کے حوالے سے یہ پولیس مقامی لوگوں کے وجود کا ہی حصہ ہوگی او راس طرح اسے عام لوگوں کی امداد بھی حاصل ہوگی اور تعاون بھی۔ ڈائریکٹرز کو خیال ہوا کہ داروغہ والا کام ختم کرنے کے بعد زیادہ انحصار زمیندار پر کرنا پڑے گا او روہ نہیں چاہتے تھے کہ اس وقت زمیندار کو حکومت کی طرف سے جو عزت دی جاتی ہے اور اس سے جو تعاون لیا جاتا ہے اس میں اضافہ کر کے اسے پولیس کے اختیار بھی دے دیئے جائیں۔ چنانچہ پولیس کو کنٹرول کرنے، انہیں ایک انسانی دشمن ادارہ بننے سے بچانے او رامن وامان اور جرم وسزا میں صورت حال کو بہتر بنانے کی غرض سے بنگال، مدراس اور بمبئی میں نئے نئے قوانین بنائے گئے۔ بنگال میں ریونیو کا عملہ کم تھا او رداروغہ جرائم او رنظم ونسق کے علاوہ مالیئے کا کام بھی کرتا تھا اس لئے اس عہدے کو یا طریقہ کو ختم کرنا بڑا مشکل تھا۔ کیا یہ گیا کہ داروغہ کے اختیار کم کر کے ہر ڈویژن کے لئے ایک ہمہ وقتی پولیس سپرنٹنڈنٹ کا عہدہ متعارف کرایا گیا، پہلے صرف تین ڈویژنوں ڈھاکہ، مرشد آباد او رکلکتہ میں یہ سپرنٹنڈنٹ، نائب ناظم یعنی ڈپٹی گورنر کے ماتحت تھااور اسی کو جوابدہ بھی۔ اسے لوگوں کو معافی دینے کا بھی اختیار تھا اور مخبر (گوئندے) رکھنے کا اختیار بھی تھا، مخبر کے ذریعے حالات کا پیشگی پتہ لگا کر امن وامان کا بہتر تحفظ کیا جا سکتا تھا۔ بعد میں ایک او رپولیس افسر کرنل سیلی مان نے انہی مخبروں کے ذریعے ٹھگی کا خاتمہ کیا تھا اگرچہ گوئندے یا مخبر خود بھی جرائم پیشہ تھے او ران سے کام لینے پر بڑی لے دے ہوئی مگر ان کی وجہ سے صورت حال بہتر ہوگئی، سپرنٹنڈنٹ پولیس مقرر کرنے والا سلسلہ کامیاب رہا اور 1810ء میں بریلی، بنارس او رپٹنہ میں بھی سپرنٹنڈنٹ مقرر کئے گئے۔ انیس برس بعد کمشنروں کو سپرنٹنڈنٹ پولیس والے اختیارات بھی دے دیئے گئے مگر فوری نتیجہ یہ ہوا کہ جرائم بڑھ گئے اورصورت حال بدتر ہوگئی۔ اس کے تین برس بعد ایک سلیکشن کمیٹی بنائی گئی۔ پولیس کے ماتحت اہل کار، رشوت خور، نااہل اور ظالم تھے جبکہ ان کے سینئر ان کی مناسب نگرانی بھی نہیں کر سکتے تھے۔ بہر طور پنجاب یا

پاکستان کے موجودہ علاقوں میں فرنگی پولیس کے آنے سے پہلے دوسرے صوبوں (بھارت) میں قوانین کی موجودگی میں بھی پولیس ظلم و بربریت کا ادارہ تھی۔ جس میں طرح طرح کی متشددانہ کاروائیاں کی جاتیں اور تشدد کے نئے نئے طریقے ایجاد اور وضع کئے جاتے اور یہ سب کچھ پولیس کی تاریخ کا حصہ ہے۔

انگریز ایس پی واربرٹن کا ناقابل یقین حکم

یوں تو انگریز پولیس افسروں، انگریز حکومت اورانگریز عدالتوں کے بہت سے ایسے قصے ہیں جن کو پڑھنے یا سننے کے بعد ہی اندازہ ہوتا ہے کہ پولیس کے لئے کاغذ پر جو حدود مقرر کی گئی تھیں عملاً ان کی کوئی حیثیت نہیں تھی کیونکہ عملی طور پر افسروں کے کہنے، حکومت کی طرف سے دفاعی چھتری میسر ہونے اور خود کو ہم وطنوں کے مقابلے میں بلند درجے کا فرد تصور کرنے کی عادت کے سبب پولیس ایک بے لگام او رمنہ زور طاقت بن گئی تھی جس سے لوگوں کی زندگی پر طرح طرح کے عذاب نازل ہوتے جن کا تصور تک انسانیت سوزی کے برابر ہے۔ یہ قصبہ جو اب بیان کیا جارہا ہے انگریز پولیس اورمقامی پرلیس کے درمیان ایک زبردست مگر شرمناک معرکے کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے ذریعے پولیس کی اندرونی تاریخ پر سے پردہ اٹھ جاتا ہے اور حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ کم وبیش سو سال گزر جانے کے باوجود پولیس کی عادات واطوار وہی ہیں جو اس کے خمیر کا حصہ بنا دیئے گئے اور اس وقت بنائے گئے تھے جب مزید ایک سو سال پہلے مدراس، بنگال اور بمبئی میں اس نہال (پولیس) کی آبیاری شروع کی گئی تھی۔

بات 1890ء کی ہے، ایک انگریز ایس۔ پی۔ آئی۔ پی۔ واربرٹن کو امرتسر میں تعینات کیا گیا۔ یہ صاحب پولیس کے بہترین یورپی افسروں میں شمار کئے جاتے تھے اور امرتسر سے پہلے دوضلعوں کرنال اورلدھیانہ میں ایس۔ پی رہ چکے تھے۔ امرتسر پہنچے تو انہوں نے مقامی پولیس کوحکم دیا کہ ضلع کے تمام ناپسندیدہ اور سزا یافتہ افراد کا حلیہ نئے سرے سے تیار کیا جائے اور اس مقصد کے لئے یعنی حلیہ درج کرنے کے لئے مطلوبہ فرد کو اس کے گھر کے قریب سر عام ننگا کر کے جسم کے خفیہ حصوں کی شناختی تفصیل بھی درج کی جائے۔ دوسری کارروائی انہوں نے یہ کی کہ شہر کے تاجروں اور معززین سے ادھار کے نام پر پیسے بٹورنے شروع کر دیئے اور جو تاجر بلیک میل ہونے سے انکاری ہوتا تھا اسے درج رجسٹر کر لیا جاتا۔ واربرٹن نے یہ حکم دیا کہ اگر کسی شخص کو عدالت سے چھوٹی بڑی سزا ہوئی ہے تو اس شخص کا حلیہ بھی نمبر 9 یا نمبر 10 کے رجسٹر میں درج کیا جائے۔ مثلاً اگر کسی نے گھوڑے یا

ٹانگے پر سوار ہو کر ٹریفک کی خلاف ورزی کی ہے اور اسے قانون کے مطابق سزا ہوئی ہے تو اس کا حلیہ رجسٹر پر چڑھا دیا جائے۔

ان دنوں لاہور سے ایک ہفتہ وار انگریزی اخبار ٹری بیون نکلتا تھا جو بعد میں روزنامے کے طور پر معروف ہوا، اس کا دفتر 1947ء تک میو ہسپتال کے سامنے اس بلڈنگ میں تھا جہاں سے بعد میں پاکستان ٹائمز، امروز اور لیل و نہار شائع ہوئے۔ ٹری بیون نے امرتسر میں پولیس کی چیرہ دستیوں کے بعض واقعات شائع کر دیئے۔ ان میں سے ایک واقعہ اٹھارہ سالہ ہندو بیوہ تنوید کور کا تھا۔ بیوہ کا تعلق شہر کے ایک معزز برہمن خاندان سے تھا اس کے سسر نے پولیس کو رپورٹ دی تھی کہ اس کی بہو گھر سے زیور چرا کر لے گئی ہے۔ اصل بات یہ تھی کہ زیور اس لڑکی کے جہیز کے تھے اور جب اس کے سسر نے زیور لینے کے لئے اسے ذرا سا دھمکایا تو وہ زیور لے کر میکے چلی گئی۔ اس پر مقدمہ چلا اور اسے سزا بھی ہوگئی۔ سزا کاٹنے کے بعد وہ اپنے والدین کے ساتھ رہتی تھی۔ اب حلیہ درج کرنے کا وار برٹن حکم آ چکا تھا۔ ایک روز پولیس اس کے گھر پہنچی، ایس پی کی ہدایات کے مطابق سزا یافتہ نوجوان لڑکی کا حلیہ درج کرنا تھا چنانچہ پولیس سارجنٹ نے اسے زبردستی گھر سے نکالا، باہر گلی میں الف ننگا کر دیا تا کہ یہ تصدیق ہو سکے کہ آیا اس کی چھاتیوں پر موکے یا تل کا نشان ہے کہ نہیں اور اسی طرح جسم کے دوسرے حصوں پر کون کون سے نشانات ہیں۔ یہ کارروائی کھلی گلی میں ہوئی، کوئی پردہ کوئی حجاب نہ تھا اور تماشہ گھروں کی چھتوں سے بھی دیکھا گیا (کوئی نہیں کہہ سکتا کہ جب جلیانوالہ باغ کا حادثہ ہوا اور جب انگریز خواتین کی بے حرمتی کی گئی تو اس عمل میں 1890ء اور اس کے بعد کے اس قسم کے کاموں کا ردعمل بھی شامل نہیں تھا)۔ لڑکی نے احتجاج کیا، اس کے والدین نے پولیس کی منت سماجت کی مگر پولیس والوں نے جارحانہ طریق سے سرعام اس لڑکی کو ننگا کر کے اپنی موقعے کی کارروائی کی۔

دوسرا واقعہ ایک تاجر بلدیو داس کا تھا۔ اسے ایک بار جوا کھیلنے یا کھلانے پر اعزازی مجسٹریٹ کی طرف سے سو روپے جرمانہ کی سزا ہوئی تھی۔ اس نے دوسری عدالت میں اپیل کر دی، الزام غلط تھا اس لئے سزا یعنی جرمانہ بھی ختم ہو گیا۔ کئی برس بعد وار برٹن کے سارجنٹ نے اسے طلب کر لیا۔ وہ اس وقت گھر پر نہیں تھا اس کے بیٹے نے عدالت کے فیصلے کے کاغذات سارجنٹ کو دکھا دیئے۔ پھر بھی اسے وار برٹن کے پاس لے جایا گیا

جس نے خود جج کا فیصلہ دیکھا اور منشی سے کہا کہ وہ اسے رکھ لے۔ اگلے روز پولیس والے پھر آگئے اور اس کا حلیہ لینے کے لئے اسے گھر کے باہر لوگوں کی موجودگی میں ننگا کیا اور اس کا ''حلیہ درج'' کیا۔

تیسرا واقعہ یہ تھا کہ ایک معروف تاجر گنگا بشن کو غیر ذمہ داری ٹانگہ یا گھوڑا چلانے پر جرمانہ ہوا۔ بات کو عرصہ گزر گیا۔ لیکن اس کو بھی گھر سے باہر نکالا اور شرمناک طریق سے اس کا حلیہ لیا گیا۔

ہفتہ وارٹری بیون نے 16 اپریل 1890ء کو ایک اڈیٹوریل امرتسر میں پولیس کی ان زیادتیوں کے بارے میں لکھا جس میں ایک دوسرے اخبار پانیئر کے مالک مسٹر ایمن سے سوال کیا کہ آپ کو کسی قانونی خلاف ورزی پر تین ہزار روپیہ جرمانہ کی سزا ہوئی تھی، اور ججوں نے فیصلے میں یہاں تک لکھ دیا تھا کہ آپ قید کی سزا کے بھی مستحق ہیں، تو کیا آپ پسند کریں گے کہ آپ کو امرتسر کے مظلومین کی طرح ننگا کر کے آپ کی تصویر اتاری جائے یعنی حلیہ درج کیا جائے؟ پھر نوجوان بیوہ کی سرعام بے حرمتی کا ذکر کیا اور پوچھا کیا برطانیہ کے کسی شہر میں اس قسم کی حرکت کی جاسکتی ہے؟ پھر اہل پنجاب پر افسوس کیا جنہوں نے یہ منظر دیکھا اور برداشت کر لیا۔ تاہم اس کے بارے میں خود ہی دلیل دی کہ اگر وہ (عام لوگ) مداخلت کرتے تو انہیں سرکاری کام میں مداخلت کے جرم میں دھرلیا جاتا۔ اداریہ میں کہا گیا ہے کہ اگر پولیس کے ذمہ داروں خصوصاً واربرٹن سے اس شرمناک کارروائی کے بارے میں پوچھ گچھ نہیں کی جاتی ہے اور ان کی غیر قانونی اور غیر اخلاقی حرکت پر باز پرس نہیں ہوتی تو پھر لوگوں کا برطانیہ انصاف سے اعتماد بالکل ختم ہو جائے گا۔ اداریہ میں اس بات پر زور دیا گیا کہ پولیس کے معمولی ملازمین نے جو کچھ کیا ہے اس میں واربرٹن کا حکم اور رضا دونوں شامل تھے۔

حکومت کی طرف سے اس ضمن میں کسی کارروائی کا آغاز نہ ہوا اور دس دن بعد اخبار نے لکھا کہ بلدیوداس نے پولیس کے دو سارجنٹوں اور ایک کانسٹیبل کے خلاف تعزیرات ہند کی دفعہ 341 اور 342 کے تحت مقدمہ کر دیا ہے کہ اس کی بریت کے باوجود اس کی بے حرمتی کیوں کی گئی۔ لیکن ہوا یوں کہ بلدیوداس پر زبردست دباؤ ڈالا گیا اور اسے مقدمہ واپس لینے پر مجبور کیا گیا، یہ کام خود ایس پی واربرٹن نے اپنے تین ماتحت ملازموں کو

بچانے کے لئے کیا۔ بس اتنا ہوا کہ سارجنٹ سے تحریری معافی منگوادی گئی۔

اخبار نے تفصیل لکھی کہ جب یہ مقدمہ دائر ہوا تو واربرٹن نے شہر کے کچھ معززین کو بار بار بلایا۔ ان میں چار شہر کے آنریری مجسٹریٹ تھے دو وکیل اور میونسپل کمیٹی کے رکن شامل تھے۔ انہیں کہا گیا کہ وہ بلدیوداس سے کہیں کہ وہ مقدمہ واپس لے لے۔ واربرٹن نے ان معززین سے کہہ دیا کہ وہ ہرصورت یہ صلح کروائیں گے۔ چنانچہ دوشرفاء، ایک آنریری مجسٹریٹ اور ایک وکیل ایس پی کے حکم کے تحت بلدیوداس سے ملے اور اسے مقدمہ واپس لینے کے لیے کہا۔ انہوں نے بلدیوداس کے وکیل سے بھی دوبارہ ملاقات کی اور یوں بلدیوداس کو صلح کرنی پڑی اور جن پولیس والوں کو اس جرم پر کم از کم دو سال سزا ملنا تھی وہ آسانی سے چھوٹ گئے۔

ٹری بیون نے اس کے بعد ایک اور واقعہ چھاپ دیا۔ گاؤں بھلر میں ایک شخص کھڑک سنگھ اور اس کے ساتھی کا دوسری بار حلیہ لیا گیا۔ پولیس سارجنٹ نے وجہ یہ بتائی کہ پہلا حلیہ لیتے وقت رائج فارم کے مطابق معلومات اکٹھی نہیں کی گئی تھیں۔ اس پر اخبار نے کمشنر کرنل بیڈن سے کہا کہ وہ کم از کم وہ فائل منگوالیں جس میں واربرٹن نے ایسی حلیہ نویسی کا حکم دے رکھا ہے۔ حکم یہ ہے کہ مطلوبہ شخص کا اسی گلی میں سرعام ننگا کر کے حلیہ لیا جائے جس میں وہ رہتا ہے۔ اخبار کی نظر میں کیا ایسا آدمی اس لائق ہے کہ اسے ضلع کا پولیس سپرنٹنڈنٹ بنا دیا جائے یا ذمہ داری کا کوئی بھی عہدہ دیا جائے؟

ٹری بیون کا دعویٰ تھا کہ پولیس ایکٹ اور دوسرے متعلقہ قوانین کو بغور دیکھنے کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس قسم کی حلیہ نویسی کا حکم انسپکٹر جنرل پولیس بھی نہیں دے سکتا اور نہ ہی ہندوستان کی حکومت ایسا حکم جاری کرسکتی ہے۔ البتہ قانون میں ترمیم کر کے اس قسم کی گنجائش ضرور نکالی جا سکتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب ایک شخص جیل میں جاتا ہے تو اس کا حلیہ ضرور درج کیا جاتا ہے۔ ایس پی واربرٹن کو اگر ایسے حلئے کی ضرورت ہو تو وہ بڑی آسانی سے جیل کے حکام سے حاصل کرسکتا ہے۔

ٹری بیون نے اعلیٰ حکام خصوصاً لیفٹیننٹ گورنر سے کہا کہ وہ کوئی سے معززین کی تحقیقاتی کمیٹی بنا دیں۔ ہم اس کے سامنے جو کچھ چھاپا ہے اس کی ایک ایک شہادت اور گواہی پیش کریں گے۔ یہ معاملہ جلدی ہونا چاہیے کیونکہ خبروں کی اشاعت کے بعد امرتسر

میں پولیس نے ساری گواہیاں ضائع کرنے کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے اور جن لوگوں کے سامنے یہ حلیے لئے گئے ہیں ان کو بھی ڈرایا دھمکایا جا رہا ہے۔

ایک ''مثالی'' انگریز پولیس افسر مسٹر واربرٹن کے بارے میں اخبار نے مزید انکشافات بھی کئے: مسٹر واربرٹن کوئی ستر ہزار روپے کا مقروض ہے جن میں 65 ہزار روپے کی تفصیل کا ہمیں بخوبی علم ہے کہ واربرٹن نے کس کس پارٹی سے کتنی کتنی رقم وصول کی۔ کہنے کو تو یہ رقم ادھار کے کھاتے میں ڈالی گئی ہے مگر درحقیقت واربرٹن نے یہ رقم بدعنوانی کے تحت حاصل کی ہے وگرنہ کوئی بھی ایسے تنخواہ دار شخص کو جس کی کل تنخواہ سات آٹھ سو روپے ماہانہ ہو، آٹھ دس ہزار روپے بطور ادھار کیوں دے گا۔

اخبار کے شور کرنے پر حکومت نے ایک کمیٹی بنائی جس کے رکن ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس او رامرتسر کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ اخبار نے لکھا کہ سب سے پہلے حلیہ رجسٹر اور پھر امرتسر کے تاجروں کے کھاتے قابو کریں او رکمشنر کی تحویل میں دے دیں۔ یہ مئی کے مہینے کی بات ہے۔ دریں اثنا امرتسر میں ہی پولیس ایک بیوہ برہمن لڑکی کو پکڑ لے گئی کہ اس کے حلیئے کی تصدیق کرنی ہے اور اس لئے الزام اس پر نہیں بلکہ اس کے انجہانی باپ کندن مسر پر تھا۔ بیوہ کو یہ بتایا گیا کہ تحقیقات کے لئے کیپٹن می ڈریو آیا ہے، عورت کو اس کے سامنے پیش ہونا ہے مگر جہاں تک ہمیں خبر ہے اس شخص نے کھلے عام کوئی تحقیقات نہیں کی۔

حکومت کا حامی ایک اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ تھا اس کے ذریعے واربرٹن کی صفائیاں چھپنی شروع ہو گئیں او رٹربیون پر الزام لگایا گیا کہ وہ بے سروپا خبریں اور مضامین شائع کر رہا ہے۔ ٹری بیون نے صرف ایک مطالبہ کیا کہ مسٹر واربرٹن کو فوری طور پر معطل کیا جائے اور انکوئری کے لئے آزاد کمیشن بنایا جائے...... مگر حکومت نے کوئی بات نہیں مانی۔ تاہم ٹری بیون نے خبر دی کہ قائمقام چیف سیکرٹری ایچ۔ سی فینشا نے انسپکٹر جنرل پولیس کرنل اومینز نیز کو چٹھی لکھی جس میں کہا گیا تھا کہ واربرٹن نے مان لیا ہے کہ یہ آرڈر اس نے دیا تھا اس لئے مزید انکوائری کی ضرورت نہیں اور یہ حکم ٹری بیون کی خبروں کو صحیح بناتا ہے بجز اس کے کہ ٹری بیون نے بہت مبالغہ کیا ہے، حکومت کے پاس ایک دبیز فائل بنی ہے جس میں اصل بات یہ تھی کہ نئے حلیئے بنانے اور جسٹروں کو مکمل کرنے کا حکم ڈپٹی انسپکٹر

جنرل نے ہی دیا تھا، واربرٹن نے ضرورت سے زیادہ جوش سے کام لیا اوراخلاقی اورقانونی حدود کا بھی خیال نہ رکھا۔ اس نے کم وبیش امرتسر کے ضلع کے بتیس ہزار مردوں اورعورتوں کے حلئے اسی طور تیار کروائے جس سے لوگوں کو بھی بڑا افسوس ہوا اور محکمے کی بدنامی بھی ہوئی۔ آئندہ کے لئے یہ طریق اختیار کرنے کی ممانعت کر دی گئی اور حلئے اورجسٹروں کے بارے میں نیا آرڈر جاری کیا گیا، واربرٹن اور پوری پولیس پر ایسے سنگین الزامات بڑی حد تک صحیح ہونے کے باوجود گورنر پنجاب نے واربرٹن کے خلاف کوئی خاص قدم نہیں اٹھایا۔ صرف اتنا کہا کہ اس کی گوشمالی کر دی گئی ہے اور اسے تبدیل کر کے سیالکوٹ میں سپرنٹنڈنٹ پولیس لگا دیا گیا ہے۔ واربرٹن کی حلیہ نویسی والی المناک کارروائی میں بتیس ہزار مرد اورعورتیں نشانہ بنیں۔ کئی مہینے یہ معاملات چلے اور فیصلہ ستمبر میں جا کر ہوا۔ بعد کی مقدمہ بازی سے پتہ چلا کہ واربرٹن نے پولیس کی مدد سے ظلم کا شکار ہونے والوں کے بیان بدلوانے کی کوشش کی، تھانوں کے اندراجات تبدیل کروائے اور اپنی جان بچانے کے لئے جتنے غیر قانونی حربے ہو سکتے تھے، آزمائے۔ تنویدکور اور بلدیوداس سے رابطے کئے۔ بہرطور اسے اتنے بڑے جرم کی اتنی سی سزا دی گئی کہ اس کا تبادلہ سیالکوٹ کر دیا گیا۔

ہم نسل ہونے کے سبب انگریز افسر اس فیصلے پر ناراض بھی ہوئے اورجب واربرٹن نے ٹری بیون کے مالک دیال سنگھ مجیسٹھیہ کے خلاف ہتک عزت کا مقدمہ کر دیا تو مقدمے کے اخراجات کے لئے واربرٹن فنڈ قائم کیا گیا جس میں انگریزوں اور ان کے خیرخواہوں نے حصہ ڈالا۔

سوال یہ ہے کہ 1890ء یا اس سے بھی پہلے سے لے کر آج تک کیا پولیس کی زیادتیوں اور قانونیت میں کوئی کمی آئی ہے؟

قیام پاکستان سے پہلے کی تنظیم جاری ہے

زیادہ دیر کی بات نہیں 1905ء لارڈ میونے کہا تھا کہ جب تک آسمان پر سورج روشن ہے ہم ہندوستان کو غلام بنائے رکھیں گے، اور اس نے پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر کو بھی لکھا ''اپنے ماتحت افسران کو بتا دو کہ ہم انگریز اشراف ایک کمتر نسل کے لوگوں پر حکمرانی کے شاندار کام میں مصروف ہیں''۔ یہی جذبہ تھا جس کے تحت برصغیر میں انگریز نے اپنی پولیس کی تنظیم کی اور اس سے اسی نوعیت کا کام لیا، یقیناً یہ بات بہت مشکل تھی کہ تمام پولیس فورس ہی انگریزوں پر مشتمل ہوتی تاہم آزادی تک پولیس فورس کا یہ عالم تھا کہ ایس پی او رائے ایس پی تک عموماً انگریز ہی ہوا کرتے، ڈی ایس پی انسپکٹروں اور سارجنٹوں میں اینگلو انڈین بھی ہوتے اور پولیس اور فوج میں بھرتی مکمل طور پر فرد یا خاندان کی انگریز سرکار سے مکمل وفاداری کی بنا پر ہوتی۔ یہ فورس 1861ء کے سامراجی پولیس ایکٹ کے تحت وجود میں آئی بلکہ موجود تھی۔ اسے اس سانچے میں ڈھالا گیا۔ اس ایکٹ کے بارے میں اورتو اور خود انگریز کے 3-1902ء کے بنائے پولیس کمیشن نے کہا۔''پولیس کے کردار کے محاسبہ کے لئے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو یہ اختیار دینا ہی کافی ہے کہ وہ ایس پی سے کہہ کر کسی ماتحت پولیس والے کے کردار کے بارے میں انکوئری کرائے۔ اس سے زیادہ اختیار دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ ایس پی کی اتھارٹی کو کمزور کر دیا جائے اور اس کے احساس ذمہ داری کو ضعف پہنچایا جائے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے پہلو دار کردار کی ضرورت نہیں۔ وگرنہ یہ کوئی اصولی بات بھی نہیں بنتی اور اس طرح ڈپٹی انسپکٹر جنرل کا عہدہ بھی بے کار ہو جائے گا۔ اس کی حیثیت صرف معائنہ کرنے اور رپورٹ لکھنے والے فرد کی سی رہ جائے گی یوں اس کی ساری افادیت ختم ہو کر رہ جائے گی۔''

تاہم کمیشن نے اس کے علاوہ پولیس کے مزاج، کردار اور تنظیم میں کسی اور قسم کی تبدیلی کی تجویز یا سفارش نہیں کی۔ گویا پولیس کا جابرانہ یا لوگوں سے غیر ہمدردانہ کردار بدستور قائم رہے گا۔ 1926ء میں لمسدن رپورٹ نے پولیس کی کارکردگی کا جائزہ لیا جس کے نتیجے میں 1934ء میں پنجاب پولیس رولز وضع کئے گئے ان رولز میں پولیس والوں کے

ہر سطح کے ملازمین کے فرائض، کردار سازی، وردی، تھانے کے معائنہ، اسلحہ اور ہتھیار، نظم و ضبط کے طریق، جرائم کی تفتیش، تبادلے اور تقرریاں، ٹریفک کنٹرول، احکامات جاری کرنے کا طریق۔ غرضیکہ تقریباً ہر پہلو کی تعریف کر دی گئی اور عملی صورت دکھا دی گئی ہے۔ 1934ء کے رولز کے تحت ڈپٹی کمشنر جرائم سے متعلق انتظامات کا سربراہ ہے جبکہ نہ تو پولیس ایکٹ 1861ء اور نہ ہی ضابطہ فوجداری کے تحت اسے یہ اختیار دیا گیا تھا۔

ہندوستان آزاد ہوا۔ پاکستان قائم ہوا تو ایک طویل عرصہ تک نہ پولیس کی تنظیم نہ کردار کے بارے میں کچھ سوچا گیا نہ کچھ کیا گیا۔ دریں اثنا پولیس کے سبب کئی افسوس ناک واقعات بھی ہوئے مثلاً پنجاب میں مہاجروں (ساہیوال میں) پر گولی چلی، وزیراعظم لیاقت علی خان کا قتل ہوا۔ قتل میں ایک افغان (جو ایبٹ آباد میں نظر بند تھا) ملوث تھا بلکہ اس نے گولی چلائی تھی اور اس افغان کو پنجاب پولیس کے ایک اے ایس آئی نے موقع پر گرفتار کرنے کی بجائے گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ پولیس اس ضمن میں کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکی تھی حتیٰ کہ معاملہ مرکز میں قائم کی گئی پولیس کی وفاقی فورس کے سربراہ صاحبزادہ اعتزازالدین احمد کے سپرد کیا گیا۔ وہ ہوائی جہاز کے حادثہ میں مارے گئے آج تک لیاقت علی خان کے قتل کے محرکات کا کچھ پتہ نہیں چلایا جا سکا۔ بہرطور یہ معاملات اسی صورت 1956ء تک چلتے رہے، پانچوں صوبوں میں پولیس اسی نظام کے مطابق چلتی رہی جو انگریز وضع کر گیا تھا۔ البتہ فرق ضرور آیا کہ معاشرہ کے بکھر جانے کے باعث جرائم کی گنجائش تعداد اور شدت بڑھ گئی، 1947ء میں انسانی قدروں کی اس قدر تذلیل ہوئی کہ ان قدروں کے حوالے سے جرائم کا خود کار روک تھام والا میکنزم تقریباً ختم ہو گیا۔ سیاسی معرکہ آرائی اقتدار کی آخری حد چھونے کی خواہش اور اس کی بنا پر بددیانتی کے لئے پولیس بھی استعمال ہوئی۔ ترقی، جائداد اور جاگیردارانہ آزادی ہر چھوٹے بڑے سرکاری ملازم کی تمنا رہی اور جب موقع ملا اس کے حصول میں تمام اصولوں اور ضابطوں کو پامال کر دیا گیا۔ بہرطور 1956ء تک آئین نہ بن سکا چنانچہ 1935ء کے ایکٹ کے تحت حکومت چلتی رہی...... بلکہ گرتی پڑتی آخر 1956ء کے آئین تک آ پہنچی۔

1953ء میں شہاب الدین نے ایک رپورٹ تیار کی تھی جو دستور کے مسائل اور حقوق و فرائض کے بارے میں نئی توجیہات سے متعلق تھی۔ اس میں تھوڑا سا ذکر پولیس کا

بھی تھا مگر ادھر کسی نے توجہ ہی نہیں دی اور بعض اوقات تو ایسے لگتا ہے کہ مشرقی پاکستان کے 1971ء کے سقوط کے بارے میں حمودالرحمٰن کمیشن رپورٹ کی طرح شہاب الدین رپورٹ بھی غائب ہوگئی ہے۔

1956ء کا آئین بننے سے پہلے مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں کے (ادغام) کے ساتھ ون یونٹ قائم کر دیا گیا۔ چاروں مختلف پس منظروں والی پولیس فورسز ایک جگہ اکٹھی کر دی گئیں اور پولیس کے سربراہ انسپکٹر جنرل پولیس کے کچھ اختیارات محکمہ داخلہ نے لے لئے۔ 1956ء کا آئین بنا اس کی بنا پر انتخابات ہونے تھے مگر انتخاب سے پہلے ہی مارشل لاء لگایا گیا۔ ایوب خان کی حکومت آگئی۔

مارشل لاء کی حکومت نے جسٹس کانسٹیٹائن کی سرکردگی میں پاکستان پولیس کمیشن بنا دیا۔ کمیشن نے کہا کہ بھرتی کا موجودہ نظام درست ہے، کانسٹیبلوں اور ہیڈ کانسٹیبلوں کو تفتیش کی ذمہ داری نہ سونپی جائے، سفارش تھی کہ ایک اعلیٰ پولیس سروس (سی ایس ایس) ہو۔ دوسرے صوبائی پولیس سروس ہو اور تیسری ماتحت ملازمین کی سروس ہو۔ محکمانہ ترقی کے لئے امتحانات کا طریق کار تجویز کیا گیا۔

مارشل لاء کی حکومت ہو یا بعد از مارشل لاء یعنی ایوب خان یا ضیاء الحق کے مارشل لاء کے بعد کی نام نہاد سول حکومت بہر طور اسے عوام کے تعاون اور ان کی مرضی کی بجائے سرکاری مشینری کے زور پر چلایا جاتا ہے جس میں ہر محکمہ شیر ہوجاتا ہے لیکن اعلیٰ سول سروسز (جن میں پی ایس پی افسر بھی شامل ہیں) تو گویا ہتھ چھٹ اور منہ زور بڑھے مگر عملاً بڑھتے گئے، نوکر شاہی کے ذریعے انتخابات کے نتائج نکلوائے گئے، آخر کار یہ گاڑی نہ چل سکی، پولیس جہاں تھی وہیں رہی نہ اس کا محاسبہ ہوا، نہ حسابداری کا عمل اور طریق کار متعین ہوا۔ ہر اوپر والے نے اپنے نیچے والے سے جس قدر برا سلوک ہوسکتا تھا کیا اور دل کھول کر کیا۔

ایوب خان عوام کے طویل مظاہروں اور مار پیٹ کے بعد رخصت ہوئے اور مارشل لاء بھی اور اس کے ایڈمنسٹریٹر یحییٰ خان بھی قوم کو دے گئے بڑی محنتوں سے قائم کیا گیا ون یونٹ (جس کا اصل مقصد یہ تھا کہ بنگالیوں کو ان کی اکثریت کا حق نہ دیا جائے اور صلح کل بنگالیوں نے اس کو سیاسی مفاہمت کی خاطر قبول بھی کر لیا تھا) توڑ دیا گیا۔

صوبائی پولیس تنظیمیں واپس ہوئیں۔ کچھ عرصہ پہلے یحییٰ خان کے قریبی میجر جنرل مٹھا کی سربراہی میں پاکستان پولیس کمیشن بنا دیا گیا۔ اس کمیشن نے پولیس ملازمین کے کوٹے (براہ راست امتحان کے ذریعے اور محکمانہ طور پر) کی تقسیم کی تجویز کی۔ انسپکٹر جنرل کو ایس پی تک کے عہدہ داروں کے تبادلے اور تقرری کے اختیارات دینے کی سفارش کی۔ ڈی ایس پی کا عہدہ ختم کرنے، ہر ضلع میں فوجداری تفتیش کا محکمہ کھولنے کی سفارش کی۔ گارڈ ڈیوٹی سے پولیس واپس بلانے، ڈسٹرکٹ کونسلوں اور صوبائی اسمبلیوں میں پولیس کے بارے میں مشاورتی کمیٹیوں کی تشکیل، پولیس والوں کی بہبود کا شعبہ اور اعداد وشمار کا نظام قائم کرنے کے لئے بجٹ میں رقم مختص کرنے، غرضیکہ اس نوعیت کی سفارشات پیش کیں۔ مگر 1971ء کی شکست کے بعد پاکستان کے ذمہ دار جرنیلوں کے نام سے منسوب اچھی بری سب چیزیں یا رد کر دیں گئیں یا طاق نسیان میں چلی گئیں۔ جنرل مٹھہ کمیشن رپورٹ میں بھی عوام کے نقطۂ نظر سے پولیس کے کردار میں مطلوبہ تبدیلی لانے یا اسے جدید ترقی یافتہ ممالک کی پولیس کے ہم سر بنانے کے لئے کوئی سمت ہی نہیں مقرر کی گئی تھی اور ویسے یہ ہو بھی نہیں سکتا کیونکہ جس بوسیدہ نظام کا حصہ ہماری پولیس کا نظام ہے وہ ٹوٹے گا تو پھر پولیس کا نیا ڈھانچہ بن سکے گا۔ اگر اسے ہی برقرار رکھنا ہے تو پھر کسی ایک شعبہ میں انقلاب یا نمایاں تبدیلی لانا ممکن ہی نہیں ہے۔

پولیس میں ایوب خان کے آخری دنوں میں ایک اور تجربہ بھی کیا گیا۔ جس طرح آرمی، ائر فورس یا نیوی میں ایف اے پاس بھرتی کر کے ان کی گریجوایشن کی جاتی ہے اور پھر انہیں کمیشن دیا جاتا ہے۔ اسی طور پولیس میں بھی انڈر گریجوایٹ لے کر انہیں سرکاری خرچ پر گریجوایٹ بنا کر اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس بنانے کا سوچا گیا۔ دو سال یہ تجربہ بھی کیا گیا، آخر اس میں خرابی نظر آئی اور 1972ء میں اسے ترک کر دیا گیا۔

مشرقی پاکستان کے الگ ہونے کے بعد پیپلز پارٹی کی سیاسی حکومت آئی۔ اس نے پولیس سمیت پوری انتظامیہ کے معاملے میں غیر ضروری اور نقصان دہ مداخلت شروع کر دی۔ دھڑے بندی تو خیر کھوڑو، الٰہی بخش، نور الامین اور فضل الحق اور دولتانہ سبھی کے زمانے میں تھی اور پولیس والے بھی سیاسی دھڑوں میں باقاعدہ بٹنا شروع ہو گئے تھے مگر سقوط ڈھاکہ کے بعد معاملات اور بھی بگڑتے گئے۔ کچھ ڈر ایوب خان، یحییٰ خان اور پھر بھٹو

کے عہد میں نکالے جانے سول سروس افسروں کی وجہ سے جن میں پولیس کے اعلیٰ افسر بھی شامل تھے، پیدا ہوا۔ مٹھہ کمیشن تو یہ کہتا ہے کہ ایک ایس پی کی ایک ضلع میں یا ایک جگہ تعیناتی چار پانچ سال کے لئے ہونی چاہئے مگر بھٹو حکومت میں تو تبادلے پر تبادلے ہونے لگے اور حیرت اس بات پر کہ انسپکٹر جنرل کے عہدہ کے دو افسر راؤ رشید اور پروفیسر شیخ وزیراعظم کے سیاسی سیل میں بھی کام کرتے رہے اور مشیر بھی بنے رہے ان انتخابات کے بارے میں جو خود بھٹو کی جان لے بیٹھے۔

پولیس نے بھٹو کے ساتھ ایک زیادتی یہ بھی کی کہ بعض غیر واضح مطالبات پر درمیانے اور نچلے درجے کے اہل کاروں نے دوسرے مہینے ہی پنجاب کے بعض اضلاع لاہور، فیصل آباد اور ساہیوال میں ہڑتال کر دی۔ پولیس والے بھی اپنی ایک تنظیم (ایسوسی ایشن) بنانا چاہتے تھے۔ بہرطور یہ سول مارشل لاء کا زمانہ تھا اور مارشل لاء کے تحت ہڑتال کے رنگ لیڈروں کو سزا دی گئی۔ (یہاں ایک سابق ڈی آئی جی اصغر خان کے لاہور پولیس لائنز میں خودسر اور ڈسپلن سے عاری سپاہیوں اور رحوالداروں سے حسن سلوک یاد رکھئے۔ یہ واقعہ اسی کتاب میں کہیں درج ہے)۔

انہی دنوں معروف افسر جی احمد کو پولیس کے بارے میں ایک رپورٹ تیار کرنے کے لئے کہا گیا (آیا عزیز احمد سیکرٹری جنرل کی قربت کے باعث جی احمد کو فارغ وقت میں کمائی اور مصروفیت کے لئے یہ کام دیا گیا یا صدق دل سے؟ اس بارے میں فیصلہ کرنا مشکل نہیں لکھنا مشکل ہے) جی احمد نے پولیس کی تنظیم میں اصلاحات کے لئے رپورٹ پیش کر دی۔ 1973ء میں آئین بن گیا۔ پارلیمانی نظام قائم ہو گیا مگر اعلیٰ ملازمتوں میں ایک لیٹرل انٹری سکیم شروع ہوئی اس میں فوج کے کمشنڈ افسروں کو براہ راست پولیس میں ایس پی اور اس سے اوپر کے عہدوں پر لیا گیا حتیٰ کہ 1971ء کے پی ایس پی گروپ کے افسر بھی ان فوجیوں کے مقابلے میں جونیئر ہو گئے۔ پھر پبلک سروس کمیشن سے منظور کرائے بغیر بالکل سادہ، کورے، ناپختہ کار افراد کو براہ راست ڈی ایس پی کے طور پر بھرتی کیا گیا۔ پولیس اور عوام کا رشتہ اور خراب ہوتا گیا اور محکمہ کے اندر نئے پرانے جونیئر سینئر تجربہ کار، خاکی وردی غیر خاکی وردی کے تنازعے الگ شروع ہو گئے۔ اعلیٰ افسروں میں شاہ سے وفاداری کے اظہار کا مقابلہ بھی شروع ہو گیا۔ الیکشن ہوا تو عین الیکشن سے چند دن بعد

انسپکٹر جنرل علی حسین کو تبدیل کر دیا گیا۔ سیکرٹری داخلہ فضل حق کو آئی جی بنا دیا گیا۔ یہ مشکل وقت میں کچھ پولیس والوں کی وفاداری پر شک کرنے اور کچھ کی وفاداری پر بہت زیادہ بھروسہ کرنے کی حماقت تھی۔

اسی مکمل وفاداری اور مشکوک وفاداری میں متعلق ذوالفقار علی بھٹو نے چھٹی جگہ پر جونیئر جنرل ضیاء الحق کو کمانڈر انچیف بنا دیا۔ ضیاء الحق نے الیکشن کے بعد کے ہنگاموں کے باعث مارشل لاء لگا دیا، فوری طور پر براہ راست بھرتی ہونے والے سارے ڈی ایس پی برطرف کر دیئے گئے مگر فوج کے کپتان میجر پولیس میں ہی رہے بلکہ بعد میں آنے والی حکومتوں نے بھی فوج کے جوانوں کو اعلیٰ سول سروس میں کھپایا اور بظاہر فوج والوں کو مشکور کیا۔

ضیاء الحق نے 5، جولائی 1977ء کو مارشل لاء لگایا اور 16، مئی 1981ء تک صرف پنجاب کے صوبے میں چار سالوں میں پانچ انسپکٹر جنرل تبدیل ہوئے۔ سی ایس پی اور پولیس سروس کا تنازعہ چلتا رہا۔ سی ایس پی محکمہ داخلہ میں پولیس والوں کو قابو کرتے رہے۔ اور ایک بار معاملہ صدر تک پہنچا کہ پولیس میں تبادلے کون کرے گا اور ترقی کون دے گا؟ انسپکٹر جنرل پولیس یا ہوم سیکرٹری؟ صدر صاحب نے فیصلہ دیا کہ ترقی تو دے گا ہوم ڈیپارٹمنٹ اور تبادلے ہوں گے انسپکٹر جنرل کے ذریعے، یہ واقعہ 1983ء کا ہے۔

سول افسروں اور پولیس والوں کی آپس میں لگتی بہت دور تک چلی جاتی ہے اور چلی جا رہی ہے۔ فیصل آباد میں ایک اسسٹنٹ کمشنر نے کسی شکایت پر مجسٹریٹ کو حکم دیا کہ ٹریفک کانسٹیبل نے رشوت لی ہے اسے پکڑو۔ پکڑنے کی بجائے مارا ماری ہو گئی بات بہت اوپر تک گئی۔ پولیس نے ہڑتال کر دی، پھر تحقیقات کے نتیجے میں ہڑتالی پولیس والے برطرف ہوئے، ڈی آئی جی، ایس ایس پی اور ایڈیشنل سپرنٹنڈنٹ معطل ہوئے اور پانچ چھ ماہ بعد بحال ہوئے۔ دوسری طرف ڈپٹی کمشنر کا فیصل آباد سے تبادلہ کر دیا گیا۔

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

1985ء میں ہی حکومت پاکستان نے اسلم حیات کی سربراہی میں پولیس کمیٹی بنائی تا کہ پولیس فورس کو زیادہ مستعد او رموثر بنایا جائے۔ جون میں کمیٹی بنی اور 31 جولائی تک رپورٹ حکومت کے حوالے کر دی گئی۔ اسلم حیات کمیٹی کی اہم تجاویز یہ تھیں کہ جاپان

کی پولیس کی طرز پر اپنی پولیس کو سیاسی طور پر غیر جانبدار بنایا جائے۔ اس کے لئے پبلک سیفٹی کمیشن تشکیل دیا جائے جس میں متعلقہ وزیر، حزب اختلاف کا لیڈر، سپیکر کی طرف سے نامزد دو ایم پی اے، وزیر اعلیٰ کی طرف سے چار ارکان کی اسمبلی سے منظوری کے بعد تقرری جن میں ہائی کورٹ کے ریٹائرڈ جج، ریٹائرڈ سول سرونٹس، معروف دانشور یا سائنسدان شامل ہوں اور انسپکٹر جنرل پولیس سیکرٹری کے طور پر۔ بہر طور یہ رپورٹ بھی اور ڈی آئی جی کھوسہ کی جاپان کے بارے میں رپورٹ سب فائلوں کا ہیزم بن گئی ہیں۔

پاکستان کے آئین کے مطابق امن و امان، نظم ونسق، جرائم کی روک تھام اور انسداد کی ذمہ دار صوبائی حکومتیں ہیں۔ مرکزی حکومت غیر معمولی حالات (آفات، فسادات، سیلاب) وغیرہ کی صورت میں صوبائی حکومتوں کو مدد دینے کی پابند ہے تاہم دونوں حکومتیں جرائم کے انسداد کے بارے میں طریق کار سے متعلق قانون سازی کر سکتی ہیں۔

پولیس کا براہ راست عوام سے متعلق بنیادی یونٹ تھانے کا ہے۔ کہا تو یہ جاتا ہے کہ ایک پولیس سٹیشن ڈیڑھ سو مربع میل کے لئے ہونا چاہئے مگر بعض تھانے ایسے بھی ہیں جو ایک ہزار مربع میل کے رقبے کی ضرورت پوری کرتے ہیں۔

تھانے کا انچارج سٹیشن ہاؤس آفیسر (ایس ایچ او) کہلاتا ہے اس کا عہدہ انسپکٹر یا سب انسپکٹر پولیس کا ہوتا ہے۔ ایک علاقے کے متعدد پولیس سٹیشن ایک سب ڈویژن یا سرکل کہلاتے اور ان کا انچارج سب ڈویژنل آفیسر پولیس کہلاتا ہے عموماً یہ افسر اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس کہلاتا ہے۔ سرکل یا سب ڈویژنیں مل کر ضلع کا یونٹ بنتے ہیں ان کا انچارج سپرنٹنڈنٹ پولیس کہلاتا ہے' بڑے شہروں یا اضلاع میں ایک عہدہ سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس کا ہے جس کے تحت دو یا دو سے زیادہ ایس پی ہوتے ہیں' کراچی' لاہور' راولپنڈی' ملتان وغیرہ میں ایس ایس پی ہیں بہر طور یہ کوئی عہدہ شمار نہیں ہوتا۔ مختلف اضلاع پر مشتمل رینج کہلاتی ہے سول اصطلاح میں اسے کمشنری کہا جاتا ہے یہاں ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس ہوتا ہے جس پر پولیس کے محکمہ کی مجموعی ذمہ داری ہوتی ہے۔ آئی جی کے دفتر کو سنٹرل پولیس کہتے ہیں، ان کے ساتھ خاص یا اہم شعبے یہ ہیں سپیشل برانچ' کرائم برانچ' مواصلات وٹرانسپورٹ' ٹریفک' کنسٹیبلری' پولیس ٹریننگ کالج وسکول' تحقیق و ترقی کا شعبہ، سپیشل برانچ کا انچارج ایڈیشنل انسپکٹر جنرل ہوتا ہے جبکہ باقی خاص شعبوں کا انچارج ڈپٹی انسپکٹر

جنرل ہوتا ہے۔

1861ء کے پولیس ایکٹ کے تحت انسپکٹر جنرل پولیس صوبائی حکومت کی منظوری کے ساتھ پولیس کی تنظیم' ان کی تعیناتی ' ان کے معاملات ان کی کارگزاری' ان کے نظم ونسق کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ انہی کے ذریعے وہ قانون کے نفاذ اور جرائم سے متعلق کام لیتا ہے۔ انہی کے ذریعے مطلوبہ معلومات' جن میں خفیہ معلومات بھی شامل ہیں' حاصل کی جاتی ہیں ۔ پنجاب میں کم وبیش پچپن ہزار کے قریب فورس کی سربراہی انسپکٹر جنرل کرتا ہے۔ وہ تمام انتظامی فرائض محکمہ داخلہ کے ذریعے سرانجام دیتا ہے اور وزیراعلیٰ کے سامنے جوابدہ ہوتا ہے۔ ہوم سیکرٹری یا داخلہ کا سربراہ پاکستان سول سروس کا رکن ہوتا ہے اور بعض اوقات انسپکٹر جنرل سے جونیئر بھی ہوتا ہے۔ محکمہ میں کئی ڈپٹی سیکرٹری اور سیکشن افسر ہوتے ہیں جنہیں پولیس کے معاملات کا کوئی زیادہ اندازہ نہیں ہوتا۔ صوبے کا چیف سیکرٹری بھی سول سروس (ڈسٹرکٹ مینجمنٹ گروپ) سے ہوتا ہے ۔ وہ انسپکٹر جنرل کی سالانہ خفیہ رپورٹ بھی لکھنے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

ڈپٹی انسپکٹر جنرل تین چار اضلاع پر مشتمل ایک ڈویژن یا رینج کا انچارج ہوتا ہے۔ اس کا کام نہ صرف اپنے اضلاع میں پولیس کی نگرانی اور ان میں باہمی مطابقت اور رابطہ قائم کرنا ہوتا ہے بلکہ نوحی اضلاع کی پولیس سے رابطہ بھی کرنا ہوتا ہے۔ چونکہ وہ سپرنٹنڈنٹوں کی طرح روز روز کے معاملات میں زیادہ گرا ہوا نہیں ہوتا اس لئے وہ طائرانہ انداز میں تمام ایس پی اور اضلاع کی پولیس کی کارکردگی کا بہتر طور پر جائزہ لے سکتا ہے اور ضلعی افسروں کی مناسب راہ نمائی کر سکتا ہے۔ ڈی آئی جی ڈویژن کے کمشنر کا امن و امان اور جرائم کے بارے میں مشیر بھی ہوتا ہے۔ ڈویژنل کمشنر' علاقائی انتظامیہ ڈی آئی جی' ڈی سی اور ایس پی صاحبان کے اجلاس کی صدارت بھی کرتا ہے۔

ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ آف پولیس' فوری طور پر ڈی آئی جی کے اور پھر انسپکٹر جنرل کے ماتحت ہوتا ہے۔ ضلع میں اس پر ڈپٹی کمشنر کو تھوری سی فوقیت حاصل ہوتی ہے۔ ایس پی ضلع کی پولیس کی تنظیم کارکردگی اور اس سے امن وامان کے قیام قانون کے نفاذ اور جرائم کے انسداد کے لئے بہتر طریقے سے کام لینے کا ذمہ دار ہوتا ہے اور انسپکٹر جنرل سے اس حوالے سے مربوط ہوتا ہے۔ صوبے اور دیہی اضلاع میں وہ پولیس کے امور میں زیادہ

وقت صرف کر سکتا ہے مگر بڑے شہروں میں اسے سوطرح کے دوسرے کام بھی کرنے پڑتے ہیں۔ مثلاً عوام اور پریس سے رابطہ' پروٹو کول کی ڈیوٹی' اہم شخصیات کا تحفظ۔ چنانچہ جرائم کے معاملے میں اسے کم وقت ملتا ہے اس کی امداد کے لئے ایک اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ یا ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ بھی ہوتا ہے جسے ڈی ایس پی (ہیڈکوارٹر) کہتے ہیں۔ اسے پولیس لائن' روز مرہ کے کام' مقامی تربیتی ادارے' دفتری کام غرضیکہ ان سب سے نمٹنا پڑتا ہے۔

سٹیشن ہاؤس افسر' ایس ایچ او انسپکٹر' سب انسپکٹر ہوتا ہے اور اصل حقیقت یعنی لا اینڈ آرڈر' جرائم' نفاذ قانون وغیرہ کے سلسلے میں سب سے بڑا اور اہم رابطہ ہوتا ہے۔ 1861ء کی سی پی سی کے تحت اسے وسیع اختیارات حاصل ہیں اور ایک سطح پر پولیس کی ساری سرگرمیوں کا مرکز ہوتا ہے۔ یہاں عوام اور پولیس کے درمیان براہ راست رابطہ ہوتا ہے جہاں لوگ مدعی یا مدعاعلیہ یعنی شکائت کنندہ یا ملزم کی حیثیت میں آتے ہیں۔ اس ادارے یعنی تھانے کی کارکردگی پر ہی عوام کی نظر میں پولیس کا وقار بنتا بگڑتا ہے۔ تھانیدار کا ایک فرض تو اپنے سٹاف سے کام لینا ان کی کارکردگی وغیرہ ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اسے علاقے میں جرائم' ہنگامی صورت حال' ٹریفک حادثوں' دنگا دفساد' اور اسی نوعیت کے معاملات سے باخبر رہنا ہوتا ہے۔ اس سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ فرائض کی ادائیگی کے لئے اپنے تمام وسائل' رابطے' اور صلاحتیں بروئے کار لائے گا۔ اسے علاقہ مجسٹریٹ سے ہر دم رابطہ بھی کرنا پڑتا ہے۔ ایس ایچ او کے ماتحت ایک تھانہ محرر ہوتا ہے۔ اسے ایس آئی یا ہیڈ کانٹیبل کے عہدے کا۔ اسے سارا ریکارڈ' دارے رجسٹر اور پورے پولیس سٹیشن کے مال و اسباب کا دھیان رکھنا ہوتا ہے۔ وہی عموماً ایف آئی آر درج کرتا ہے' شکائت وصول کرتا ہے اور پھر ضروری اور فوری اطلاعات ایس ایچ او یا دوسرے اہل کاروں کو پہنچاتا ہے۔ تھانیدار کے تحت متعدد سب انسپکٹر' اسسٹنٹ سب انسپکٹر اور ہیڈ کانسٹیبل ہوتے ہیں جو نگرانی، تفتیش، گشت وغیرہ کا کام کرتے ہیں ان کی مدد کے لئے کانسٹیبل ہوتے ہیں' جو اطلاعات بھی فراہم کرتے ہیں' نوٹس اور کورٹ سمن بھی تعمیل کراتے ہیں اور دنگا فساد میں اپنے سینئر کے مددگار ہوتے ہیں۔

زنانہ پولیس:

کچھ تفصیل کسی دوسری جگہ درج کی جا چکی ہے۔ بہر طور بگڑتی ہوئی ضرورتوں کے پیش نظر اب زنانہ پولیس میں بھی توسیع ہو رہی ہے ۔ زنانہ پولیس سٹیشن اور ان کے ساتھ حوالات بھی قائم کی گئی ہے تجربہ راولپنڈی میں ہو رہا ہے ۔ ایک مرکز لاہور میں ہے۔ زنانہ پولیس کی ضرورت، زنانہ ملزموں کے لئے' خواتین کی جسمانی تلاشی کے لئے اور احتجاجی جلسوں وغیرہ میں خواتین کو قابو کرنے کے لیے بڑھتی گئی ہے' اب مقدمات کا اندراج بھی انہی کے ذریعے ہے' کسی حوالات میں خاتون کو رات کو رکھا نہیں جاسکتا۔ اس کے لئے تھانے کے حوالات میں بھی ایک آدھ خاتون سپاہی وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ پنجاب میں زنانہ پولیس اہل کاروں کی تعداد ہزار تک پہنچ گئی ہے جن میں ڈی ایس پی' انسپکٹر' سب انسپکٹر' اے ایس آئی' ہیڈ کانسٹیبل اور کانسٹیبل بھی شامل ہیں' اسی طور دوسرے صوبوں میں بھی زنانہ پولیس میں توسیع ہو رہی ہے جبکہ بھارت میں زنانہ پولیس افسر ڈی ایس پی اور ڈی آئی جی تک پہنچ چکی ہیں۔

بعض علاقائی ضرورتوں کے پیش نظر ریگستانی علاقہ میں پولیس کو سواری کے لئے اونٹ رکھنے پڑتے ہیں جبکہ بعض جگہوں پر گھوڑ سوار پولیس بھی عام پولیس کا حصہ ہوتی ہے۔

منشیات کی نقل و حرکت اور خفیہ تجارت کو روکنے کے لئے نارکوٹکس کنٹرول بورڈ بھی ہے جس میں ایکسائز والے بھی ہوتے ہیں اور پولیس والے بھی۔ کنٹرول بورڈ کا انچارج کرائمز برانچ کا ڈی آئی جی ہوتا ہے جبکہ ایک ایس پی اس کا ہم وقتی انچارج ہوتا ہے۔

سنٹرل پولیس آفس میں انسپکٹر جنرل کا معاون ایک ایڈیشنل انسپکٹر جنرل ہوتا ہے جو انسپکٹر جنرل کی طرف سے دیئے گئے فرائض خصوصاً دفتری امور سرانجام دیتا ہے اس کے علاوہ انسپکٹر کے عہدہ تک کے پولیس اہل کاروں کی سزا جرمانہ' سالانہ ترقی کی معطلی اور اسی قسم کی دوسری محکمانہ کارروائیوں کے خلاف اپیلیں سنتا ہے۔

انسپکٹر جنرل کی معاونت کے لئے ایک ڈپٹی انسپکٹر جنرل ہیڈ کوارٹر ہوتا ہے باقی اسسٹنٹ انسپکٹر جنرل ڈی آئی جی ہیڈ کوارٹر ان افسروں میں رابطہ ہوتا ہے۔ دوسری طرف انسپکٹر جنرل کا پرنسپل سٹاف افسر ایس پی کے عہدے کا ہوتا ہے ۔ آئی جی کے اسسٹنٹ کے طور پر کام کرتا ہے لوگوں کی ملاقات' رینج اور اضلاع سے آنے والی شکایات' وزیر اعلیٰ کے

لئے مختصر رپورٹس، جرائم کی تفصیل اور ماہانہ رپورٹ اور اہم معاملات، جرائم مقدمات کی آخری پوزیشن سے انسپکٹر جنرل کو باخبر کرتا ہے۔ ڈی آئی جی کی طرف سے دئے گئے خفیہ کاغذات بحفاظت رکھنے کا بھی ذمہ دار ہے۔

اسسٹنٹ انسپکٹر جنرل ''اسٹیبلشمنٹ'' آئی جی اور ایڈیشنل آئی جی کو نچلے اے ایس آئی وغیرہ) کو ریکروٹمنٹ کی پولیسی طے کرنے اور انسپکٹروں کی پروموشن لسٹ تیار کرنے میں مدد دیتا ہے۔

اے آئی جی (کلودنگ) نام سے ہی ظاہر ہے، وردی، ضروری سازوسامان، قومی رضا کار پولیس اور پولیس کے کھیلوں سے متعلق امور کی نگرانی کرتا ہے۔

ڈائریکٹر بہبود ڈی آئی جی کے مرتبے کا ہوتا ہے اور بہبود سے متعلق تمام امور بہبود فنڈ، پولیس اہل کاروں کے بچوں کے لئے وظیفے یا مالی امداد، وغیرہ کا انچارج ہوتا ہے۔

اے آئی جی جنرل ''لیگل'' قانون اور ضابطوں کی تعبیر وتشریح میں معاونت کرتا ہے۔

'' اسسٹنٹ انسپکٹر جنرل ٹریننگ : انسپکٹر جنرل کو تربیت کی پالیسی بنانے، کورس ترتیب دینے، ٹریننگ کے لئے انتخاب میں مدد بھی دیتا ہے اور اضلاع اور رینج کے ذریعے وہاں پر کام کرنے والے تربیتی مراکز کی کارکردگی سے بھی آئی جی کو باخبر رکھتا ہے۔

اسسٹنٹ انسپکٹر جنرل (ایڈمنسٹریشن) اسمبلی میں کئے جانے والے سوالات کے جواب تیار کرنا، محکمہ کے سویلین ملازمین، کلیریکل سٹاف کے امور، کانفرنسوں کے ایجنڈے کی تیاری کانفرنسوں کے انعقاد، انسپکشن افسروں کی رپورٹیں اور ان پر عملدرآمد پر نظر رکھتا ہے۔

اسسٹنٹ انسپکٹر جنرل (فنانس) بجٹ، گرانٹ، اخراجات وغیرہ سے متعلق تمام امور کو نمٹانا، ماتحت دفتروں کے اخراجات، تھانوں کی حدود کا تعین، حکومت سے نئے فنڈ حاصل کرنے کے لئے کیس تیار کرنا۔

آفیسر ان سپیشل ڈیوٹی ڈی آئی جی کے عہدے کا افسر جو اعدادوشمار ریسرچ وغیرہ اور تجربہ کے بعد نتائج کی روشنی میں پولیس کارکردگی کو بہتر بنانے کے لئے سفارشات اور تجاویز تیار کرتا ہے۔

آغاز اور ارتقا' سندھ پولیس

بہاولپور کوئٹہ اور کراچی

سندھ پولیس: سندھ بمبئی کے صوبے (پریذیڈنسی) کا حصہ تھا' جہاں 1919ء تک انسپکٹر جنرل پولیس کے عہدے پر سول سروس (آئی سی ایس) افسر مقرر کیا جاتا تھا'' 1935ء میں سندھ بمبئی سے الگ ہوا اور پورا صوبہ قرار پایا۔ اس سے پہلے سندھ کے انسپکٹر جنرل کا ہیڈ کوارٹر پونا میں ہوتا تھا اور اس کے اختیارات کمشنر استعمال کرتا تھا۔ 1905ء میں پہلی بار سندھ میں ڈپٹی انسپکٹر جنرل نامزد کیا گیا۔ اس وقت تک سندھ میں گورنر کی بجائے کمشنر ہوا کرتا تھا۔ 1935ء میں سندھ گورنر کا صوبہ بنا' یہاں ایک انسپکٹر جنرل پولیس مقرر ہوا۔ اس کے ساتھ ڈپٹی کمشنر جنرل۔ 1947ء میں آزادی کے بعد سید کاظم رضا کو کھپانے کے لئے ایڈیشنل انسپکٹر جنرل کی اسامی نکالی گئی۔ کاظم رضا اس وقت کے انسپکٹر جنرل سے سینئر تھے۔ پھر کراچی میں پولیس کی نوبت بدلنے لگی۔ دارالحکومت بننے کے سبب یہ سندھ پولیس سے آزاد بھی ہوگیا مگر جلد ہی ون یونٹ بن گیا اور کراچی پولیس کی حیثیت بھی تبدیل ہوگئی۔ کراچی پولیس اور اندرون سندھ کی پولیس میں جو فرق آیا تھا وہ ختم ہوگیا۔

بہاول پور پولیس: بہاولپور میں پولیس کا محکمہ آزادانہ طور پر قائم ہوا کیونکہ ریاست انگریزوں کے آنے سے پہلے مغلوں سے آزاد ہوچکی تھی اور انگریزوں کے آنے کے بعد انگریزوں کے ساتھ بہاولپور کے معاہدہ کے مطابق یہ ریاست نیم آزاد ہی رہی۔ ایک طویل عرصہ تک ریاست میں نظم ونسق اور امن و امان قائم رکھنے کے فرائض زمیندار ہی سرانجام دیا کرتے تھے۔ ایک ریاستی ملیشیا تھی جس کے زور پر یہ زمیندار عدالتی اور انتظامی فرائض سرانجام دیتے۔ زیادہ سے زیادہ سوا سو سال ہوئے ہوں گے کہ بہاول پور میں پولیس کی شکل ایک پیادے اور یاک کشتی سوار (چلسیک) کی صورت میں نظر آئی مگر وہ وردی کے بغیر تھا اور اس کی تنخواہ بھی زمیندار ادا کرتا تھا۔ 1866ء میں پولیس کا محکمہ افسروں

کے عہدوں کے نام سے پہچانا جانے لگا۔ نام تھے کوتوال' کاردار' نائب کاردار اور پیادہ ۔ ان کی تنخواہیں چار روپے سے لیے کر پندرہ روپے ماہوار تک تھیں۔ ان دنوں جیل خانے بھی نہیں تھے اس لئے مجرموں کو سزائیں بھاری جرمانوں کی صورت میں دی جاتیں۔ جرمانہ نہ ادا کر سکنے والے قیدی اس پولیس کے پاس ہی ہتھکڑی اور بیڑی پہنے پڑے رہتے انہیں روٹی گدا کر کے کھانی پڑتی تھی۔ این۔ اے رضوی نے ایک ایسے پولیس اہل کار کی زبانی بات سنائی ہے جو آج زندہ ہوتا تو کم وبیش ڈیڑھ سو سال کا ہوتا۔ اس وقت اس کی عمر ایک سونو سال تھی۔ اس نے کہا کہ ایک بار وہ گیارہ روپے کی مالیت کی چوری بر آمد نہ کر سکا تو اس کی تنخواہ بند کر دی گئی۔ تین ماہ کے بعد چوری مل گئی تو اس کی تنخواہ اور بقایا جات دیئے گے۔ ان دنوں پولیس کی صرف ایک نشانی تھی کہ اس کے ہاتھ میں ایک سرخ رنگ کی چھوٹی سی چھڑی ہوتی بعد میں اس کی جگہ تلوار نے لے لی۔ ہنگامی صورت میں دو انچ بور زنبوچہ بھی مل جاتا تھا۔ بعد میں تھانیدار کا عہدہ نکالا گیا اور پولیس کا پہلا سربراہ حشمت رائے کو بنایا گیا جس کی تنخواہ اکتیس روپے ماہانہ قرار پائی۔ وہ سر پرست کے نام سے مشہور تھا۔ بہاول پور میں پولیس کی موزوں تنظیم انڈین آرمی کے ریٹائرڈ کرنل منچن (جس کے نام پر منچن آباد کا شہر بھی آباد ہے) نے کی مگر جدید خطوط پر اصل کام غلام محی الدین نے کیا جو پنجاب پولیس میں انسپکٹر تھا۔ اسے بہاول پور کا پہلا ایس پی نامزد کیا گیا۔ اس کے ماتحت پولیس میں کل 540افسر اور جوان تھے ۔ اسی نے پولیس کی تربیت کے لئے پہلا سکول قائم کیا۔ پولیس والوں کے لئے وردیاں تجویز کیں اور تعزیرات ہند کا نفاذ کیا یعنی پولیس والوں کو تعزیرات ہند کے مطابق اپنے فرائض ادا کرنے کی تربیت دی۔

غلام محی الدین کے بعد 1920ء میں بہاولپور پولیس کو پنجاب کے رنگ ڈھنگ کے مطابق بنایا گیا۔ 1931ء میں کمشنر پولیس کی اسامی بھی جس پر انڈین پولیس سروس کے ریٹائرڈ خان بہادر ضیاالدین کو نامزد کیا گیا۔ تین سال بعد پنجاب پولیس کے رولز بھی نافذ کر دیئے گئے آہستہ آہستہ کریمنل انویسٹی گیشن ڈیپارٹمنٹ اور فنگر پرنٹ بیورو قائم کئے گئے پھر 1949ء میں نو سو کی نفری کی بارڈر پولیس کھڑی کی گئی اسی طرح ریلوے پولیس کو منظّم کیا گیا۔ 1953ء میں ایک گھوڑ سوار دستہ بھی کھڑا کیا گیا جو بعض اوقات تقریبات کا حسن اور وقار بڑھانے کے لئے موجود ہوتا یا اسے ہنگامی حالت میں استعمال کیا جاتا۔

ون یونٹ بننے کے موقع پر بہاول پور پولیس کا انسپکٹر جنرل محمد رحیم لغاری تھا اور فورس کی نفری ساڑھے تین ہزار سے زیادہ تھی۔ ان کا معیار اور کارکردگی پنجاب پولیس کے برابر ہی گردانی گئی اور یوں یہ نفری مغربی پاکستان پولیس میں ضم ہوگئی۔ بہاولپور پولیس کو بنانے سنوارنے میں دوسرے صوبوں کی پولیس کے ریٹائرڈ افسروں نے اہم کردار ادا کیا۔

کوئٹہ پولیس : بلوچستان میں شروع سے ہی بہت بڑے علاقے میں پولیس کی ذمہ داریاں قبائلی سردار بناہتے تھے۔ بلوچستان کا بہت سارقبہ نیم آزاد حیثیت رکھتا تھا۔ تاہم جو علاقے مکمل طور پر برطانوی نظام میں تھے ان میں کوئٹہ اور قلات ڈویژن کے کچھ حصے تھے۔ 1879ء میں کرنل سنڈیمن کی سرکردگی میں ایک کمیٹی بنی جس کی سفارشات کے مطابق ایک اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس کو ایس پی کے اختیارات دیئے گئے اور اس کے ساتھ ایک انسپکٹر تھا۔ انہوں نے 210افراد پر مشتمل پولیس فورس کے فرائض سنبھالے ۔ 1886ء میں ریلوے لائن کی نگرانی اور حفاظت کے لئے مزید بھرتی کی گئی۔ 1890ء میں پولیٹکل ایجنٹ کو ڈپٹی انسپکٹر جنرل کے اختیارات دیئے گئے اور پولیس اس کے ماتحت ہوگئی مگر سات سال بعد پولیٹیکل ایجنٹ سے اختیارات واپس لے لئے گئے ۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس کو ضلعی اور ریلوے پولیس کا اختیار دے دیا گیا۔ ون یونٹ بننے پر ریلوے پولیس کو الگ کر دیا گیا۔ 1958ء کے آخر میں مارشل لا کے دنوں میں پولیس ریجن بنا دی گئی جس کا صدر مقام کوئٹہ بنا۔

کراچی پولیس: قیام پاکستان کے بعد کچھ عرصہ یہ سندھ پولیس کا ہی حصہ رہی مگر جولائی 1948ء میں کراچی پر مرکزی حکومت کا اختیار ہونے کے بعد اسے سندھ پولیس سے علیحدہ کیا گیا اور اسے انسپکٹر جنرل کے تحت کر دیا گیا۔ انسپکٹر جنرل کو لا اینڈ آرڈر برقرار رکھنے کا اختیار تھا۔ مقدمات کی حکومت کی طرف سے پیروی کے لئے پرائیوٹ وکیلوں کی پبلک پراسیکیوٹر کے طور پر پارٹ ٹائم خدمات حاصل کی جاتی تھیں مگر اب پبلک پراسیکیوشن کی برانچ الگ سے قائم کر دی گئی۔ دو سال بعد اگست 1949ء میں انسپکٹر جنرل کا عہدہ ختم کر دیا۔ انتظامی امور ایڈمنسٹریٹر کو دے دیئے گئے اور پولیس ایک سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس کے ماتحت کر دی گئی اور اسے ڈی آئی جی کے اختیارات بھی دے دیئے گئے۔ ایس ایس پی کے ساتھ تین ایس پی تھے ایک جرائم' دوسرا جرائم کی تفتیش کے محکمہ کے لئے اور

تیسرا ٹریفک اور ہیڈکوارٹر کے امور کے لئے۔ شہر کو آٹھ سیکشنوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ہر سیکشن میں تین یا تین سے زائد پولیس سٹیشن تھے۔ ڈی ایس پی ایس ڈی او کی حیثیت میں تھانوں کی نگرانی کرتے تھے۔

1950ء میں سرحد کے سابق انسپکٹر جنرل سر اولیور گریس کو کراچی پولیس کے بارے میں رپورٹ تیار کرنے کے لئے کہا گیا۔ گریس نے برصغیر کے بڑے شہروں والی تنظیم کی تجویز دی یعنی پولیس کمشنریٹ قائم کرنے کی بات۔ مگر جب دیکھا کہ یہ سلسلہ چل نہیں سکے گا تو اس نے کہا کہ کراچی اور سندھ پولیس کو 1890ء کے بمبئی ڈسٹرکٹ پولیس ایکٹ کی بجائے 1861ء کے پولیس ایکٹ کے تحت ہوتا چاہیے ۔ یہ تجویز مان لی گئی اور گریس کو کراچی کا انسپکٹر جنرل مقرر کردیا گیا۔ اس نے پولیس کا ڈھانچہ 1861ء کے مطابق کرنے کی سفارش کی کہ یہاں بھی پنجاب پولیس کا ڈھانچہ اختیار کر لیا جائے مگر عملاً کوئی تبدیلی نہ لائی گئی۔

تربیت

انگریز پنجاب میں آیا تو اس وقت اس کے پاس پولیس تو نہ ہونے کے برابر تھی البتہ سول پولیس کی ڈیوٹی بھی فوج ہی سرانجام دیتی تھی' پھر سکھوں یا لاہور دربار کی فوج بھی فارغ ہوئی اور جو شکل دربار کی پولیس کی تھی اس میں سے کچھ انگریزوں نے رکھ لی جن سے کتارمکھی بٹالین اور سورج مکھی بٹالین بنی اور دوسری بٹالینوں میں بھی پرانی سکھ پولیس کے کچھ آدمی رکھے گئے' جو بٹالینیں تب بنائی تھیں ان میں زیادہ پرانے سپاہی تھے جو قواعد پیریڈ وغیرہ سے بخوبی واقف تھے۔ ان کے ساتھ جو لوگ بھرتی کئے گئے وہ بھی نیم سپاہی ہی تھے۔ انہیں برق انداز کہا جاتا تھا ان کے لئے ڈرل پیریڈ وغیرہ کا الگ سے انتظام نہیں کیا گیا تھا اور توقع کی گئی کہ وہ اپنے ساتھ والے سابق تجربہ کار سپاہیوں سے یہ کام سیکھ لیں گے۔

بعد میں جب انتظامیہ کی ضرورتیں بڑھیں اور پولیس میں بھی زیادہ نظم وضبط اور سلیقہ قرینہ قائم کرنے کا خیال آیا تو پھر پولیس کی پکی اور بے عیب تربیت کے لئے ایک مرکز قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ضلع جالندھر میں ایک جگہ تھی پھلور۔ یہ قصبہ دہلی سے لاہور آنے والی سڑک کے قریب آباد تھا اس جگہ شاہجہاں نے مسافروں کے لئے ایک بڑی سرائے بنا رکھی تھی۔ اودھ دربار میں انگریز ایجنٹ کے منشی مولوی عبدالقادر خان نے 1797ء میں دہلی سے کابل تک کے راستے کے بارے میں تفصیلات فراہم کی تھیں' انگریز کا ارادہ تو بہرحال نہ صرف پورے ہندوستان بلکہ کابل تک کے علاقے کو زیر تسلط لانا تھا اور اس قسم کی اطلاعات ان کے لئے ضروری تھیں۔ مولوی قادر کی رپورٹ کے مطابق اس کا نام پھلورا دیا گیا ہے۔ اور تفصیل یہ بتائی گئی ہے۔ ''لدھیانہ سے بارہ کوس کے فاصلے۔ بہترین کاشتکاری ہوتی ہے۔ سڑک کے قریب کے لوگ خوشحال' خوش باش اور محنتی ہیں۔ زیادہ تر افغان اور راجپوت ہیں۔ زمین ہموار ہے۔ سڑکیں مسافروں یا فوجوں کے لئے موافق ہیں۔ ان کے کناروں پر اونچے اونچے سایہ دار درخت ہیں' بہت سے کنوئیں اور چشمے بھی ہیں۔''

Pakhtun and Bloch History. Punjabi view compiler Ahmad Saleem 86

منشی قادر نے پھلور کو دہلی سے اٹھارھویں منزل بتایا ہے۔

پھلور میں ایک قلعہ بھی تھا جس کا ذکر پنجاب میں 1857ء کی جنگ آزدی کے حوالے سے کئی بار ہوا، یہاں ضلع کا خزانہ بھی منتقل کیا گیا۔ اس کے قریب گھاٹ بھی تباہ کیئے گئے تاکہ باغی فوجی آسانی سے دریا عبور کر کے دہلی کی طرف مارچ نہ کر سکیں۔ اور پھلور میں انگریزوں کی فوج بھی مقیم رہی یعنی ایک طرح کی چھوٹی سے چھاؤنی کے طور پر بھی 1857ء میں اس شہر کو استعمال کیا گیا۔ پھلور لدھیانے کے بالکل سامنے واقع تھا، درمیان میں دریا پڑتا تھا۔ انگریز لدھیانے تک رنجیت سنگھ کے عہد میں ہی پہنچ گیا تھا۔ انگریزوں کے اتنے قریب آجانے کے سبب سکھوں نے بھی پھلوار کو فوجی چھاؤنی بنا دیا۔ یہاں رنجیت سنگھ کا جرنیل محکم چند مقیم رہے جس نے 12-1810ء کے درمیان شاہجہاں والی سرائے کو قلعے میں تبدیل کر دیا۔ عمارت میں تبدیلی ایک اطالوی انجینئر نے کی تھی۔ جالندھر گزیٹیئر کے (1908ء) کے ایڈیشن کے مطابق جب 1846ء میں سکھ فوج یہاں سے ہٹائی گئی تو قلعے کی چابیاں موجودہ ذیلدار غلام نبی کے والد چودھری قطب الدین نے اس وقت کرنل میکنسن اور بریگیڈئر وہیلر کو دے دیں جب انگریز فوجیں دو آبے میں داخل ہوئیں۔ علی وال کی جنگ کے بعد انگریزوں نے بھی 1857ء تک اسے ایک فوجی سٹیشن کے طور پر استعمال کیا۔ 1857ء میں یہاں پر دیسی فوجیوں نے علم بغاوت بلند کر دیا تھا۔ 1857ء کے بعد یہاں اسلحے کا ڈپو ضرور رہا پہلے وہ اٹھایا گیا۔ بعد میں فوج نے بیرکیں چھوڑ دیں جن میں سے کچھ ریلوے والوں کے تصرف میں تھیں اور کچھ لدھیانہ کے عیسائی مشنریوں میں سے لوگ یہاں آبسے۔ اس علاقے کو انہوں نے اپنا ریسٹ ہاؤس بنالیا۔ فوج 1891ء میں یہ علاقہ بالکل خالی کر گئی اور قلعہ (سابق سرائے) پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔ یکم جنوری 1892ء کو یہاں پر پولیس ٹریننگ سکول کھول دیا گیا۔ بعد میں فنگر پرنٹس کا بیورو بھی کھولا گیا۔

قلعہ کی عمارت کو میونسپل کمیٹی والے جیل بنانا چاہتے تھے لیکن جب اس مقصد کے لئے ایک کمیٹی نے اس کا معائنہ کیا اور کہا کہ اس کی آب و ہوا مناسب نہیں ہے تو یہ

تجویز ترک کر دی گئی اور پنجاب سیکرٹریٹ نے فیصلہ کیا کہ پھلور پولیس کو دے دیا جائے جو یہاں پر تربیتی سکول قائم کرے گی۔

جب سکول شروع ہوا تو اس میں چھ ماہ کی تربیت دی جاتی تھی۔ مگر بعد میں اس سکول میں براہ راست مقرر کئے گئے انسپکٹروں یورپین سارجنٹوں، سب انسپکٹروں، پراسیکیوٹنگ افسروں اور ہیڈ کانسٹیبلوں کی تربیت بھی شروع کر دی گئی۔ ابتداء میں پرنسپل اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس کے عہدے کا ہوتا تھا بعد میں اسے ایس پی کے عہدے میں منتقل کر دیا گیا تاہم اس پر براہ راست کنٹرول انسپکٹر جنرل کا ہوتا تھا۔ اس سکول میں بلوچستان، سرحد، پنجاب اور پنجاب ریاستوں سے پولیس والے تربیت لینے آیا کرتے تھے۔

1927ء میں یہاں اسسٹنٹ سب انسپکٹروں کی تربیت کا بھی سلسلہ شروع ہو گیا۔ ابتدائی کلاسوں میں وہ کانسٹیبل تربیت پاتے تھے جنہیں ہیڈ کانسٹیبل بنایا جانا مقصود ہوتا تھا۔ اسی حصہ میں براہ راست بھرتی کئے گئے ہیڈ کانسٹیبلوں کو بھی تربیت دی جاتی تھی۔

پھلور میں بعد ازاں اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹوں اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹوں کی ایک سالہ تربیت کا بھی سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ ان کا کورس الگ تھا اور وہ جونیئر ملازمین سے الگ رکھے جاتے تھے مگر پڑھانے والے وہی تھے جو جونیئر اہل کاروں کو پڑھایا کرتے تھے۔ جب تک گزیٹڈ افسروں والا میس نہیں بنا انہیں الگ سے کیمپوں میں رکھا جاتا تھا۔ یورپین پروبیشنر اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹوں کو چار ماہ تک جسمانی مشقیں کرائی جاتی تھیں پھر مقامی زبان، قانون اور پولیس قوانین پڑھائے جاتے تھے۔ اس کے بعد ڈپٹی انسپکٹر جنرل ان کا امتحان لیتا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ امتحان صرف رسمی سی کارروائی تھا۔ سکول میں ایک لائبریری بھی تھی، بڑا اسلحہ خانہ تھا اور عجائب گھر بھی جس میں دیسی اور ولائتی ہر قسم کا لاتعداد اسلحہ رکھا گیا تھا اس کے علاوہ جرائم میں موجود نئے اوزار استعمال ہوتے تھے وہ بھی تھے مثلاً نقب لگانے میں جو سامان استعمال ہوتا تھا، توپ کے گولوں اور عام گولیوں کے خالی خول اور زہر کی اقسام کے علاوہ جواء کے پاسے وغیرہ۔

قیام پاکستان کے بعد ہماری پولیس کا تعلق پھلور سے بالکل کٹ گیا، غالباً وہاں سے جو حصہ مغربی پنجاب پولیس کے لئے نکلتا تھا وہ بھی حاصل نہیں کیا جا سکا۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں پولیس یا جرائم سے متعلق کوئی عجائب گھر موجود نہیں۔ اسی طرح پھلور

ٹریننگ سکول جیسا ادارہ بھی نہیں بن سکا، ہاں یہ درست ہے کہ قیام پاکستان کے بعد کچھ اور ادارے بنائے گئے ہیں ان میں سے ایک راولپنڈی کے قریب سہالہ کے مقام پر ہے جو ہے تو پولیس کا تربیتی ادارہ مگر اس کو مشہوری اس وقت حاصل ہوئی جب ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی کی سزا سنانے کے بعد ان کی بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو کو یہاں نظر بند رکھا گیا۔ یہیں سے انہیں آخری ملاقات کے لئے راولپنڈی جیل لے جایا گیا تھا اور یہیں پر انہیں 4اپریل 1979ء کو بھٹو کے پھانسی پانے کی خبر سنائی گئی۔

سہالہ والے ادارے کا نام پولیس ٹریننگ کالج رکھا گیا۔لیکن یہ ادارہ بھی دراصل ایک پرانے ادارے کی ترقی یافتہ یا ماڈرن شکل ہے۔ 1934ء میں سرگودھا رینج نے مقامی ضرورتوں کے لئے ریکورٹس ٹریننگ سنٹر کھولا، تربیت دینے کے لئے میانوالی، جھنگ اور سرگودھا کے اضلاع سے تھوڑا سا سٹاف لیا گیا۔ آزادی کے بعد جب پھلور والا مرکز بھارت میں رہ گیا تو پھر اسی سرگودھا والے سنٹر کو متبادل کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ اس کو باقاعدہ بجٹ کے ذریعے اخراجات ملنے لگے۔ پرنسپل ڈی ایس پی کے عہدے کا رکھا اور پانچ سو ریکروٹوں کی تربیت کی گنجائش رکھ دی گئی۔ 1949ء میں اس میں مزید توسیع کی گئی اور اب اوپر کے عہدے کے اہل کاروں کی تربیت کا بھی انتظام کیا گیا تاہم 1959ء میں اس کو اس کی اصلی حالت پر لوٹا دیا گیا کیونکہ 1959ء میں سہالہ میں پولیس ٹریننگ کالج کھول دیا گیا تھا۔

دراصل سرگودھا کے سکول کے لئے 1952ء میں راولپنڈی کے راول ڈیم کے قریب ڈیڑھ سو ایکڑ اراضی حاصل کی گئی مگر پانی میسر نہ آنے کی بنا پر یہاں پر تعمیر کا کام شروع نہ کیا جا سکا۔ جب ون یونٹ بنا ہے تب حکومت پنجاب کی طرف سے سہالہ کے قریب ایک انجینئرنگ کالج زیر تعمیر تھا، راولپنڈی سے گیارہ میل دور سواں ندی کے کنارے یہ کالج نہ بن سکا کیونکہ ون یونٹ کے بجٹ میں اسے فالتو قرار دے دیا گیا۔ مارچ 1957ء میں یعنی ون یونٹ بننے کے کوئی ڈیڑھ سال بعد یہ نامکمل عمارتیں پولیس کو ٹریننگ کالج کے لئے دے دی گئیں۔ عمارتیں نامکمل تھیں، حکومت اخراجات برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ تعمیر اسی حساب سے کر رہا تھا جو اس کی روز ازل سے روایت ہے۔ تاہم دو اڑھائی سال کی مدت میں کسی نہ کسی صورت بلڈنگ کو ایسی شکل

دے دی گئی کہ 15 ستمبر 1959ء کو اس کا افتتاح کر دیا گیا۔ بعد میں مزید زمین بھی حاصل کی گئی اور جو تعمیرات ضروری تھیں وہ بھی کسی نہ کسی صورت مکمل کی گئیں۔

اس کالج میں بہت سی تعلیم اور تربیت تو وہی ہے جو جالندھر کے شہر پھلور کے سکول کی تھی مگر سکول اور کالج میں جو فرق ہوتا ہے وہ یہاں بھی روا رکھا گیا ہے۔ یہاں نیچے درجے کے اہل کاروں کو بھی تربیت دی جاتی ہے اور سول سروس کے کیڈر کے افسروں کو بھی۔

نصاب میں انسپکٹروں کے لئے ایڈوانس کورس، ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے لئے ریفریشر کورس، پراسیکیوٹنگ افسروں کے لیے الگ کورس، مڈل آرڈر کے افسروں کے علاوہ زیر تربیت اعلیٰ افسروں کے لئے کورس شامل ہیں۔ ان کورسوں میں پاکستان کے تمام صوبوں کے علاوہ آزاد کشمیر کے پولیس والوں کو بھی تربیت دی جاتی ہے۔ مجموعی طور پر پولیس کے جس قدر فرائض ہیں ان سب کی تربیت کا یہاں اہتمام کیا گیا ہے اس کے علاوہ سول ڈیفنس، فرسٹ ایڈ اور اعلیٰ افسروں کے لئے اکاؤنٹینسی کی تربیت کا اہتمام کیا گیا ہے۔ پھلور کی طرز پر ایک عجائب گھر بھی بنایا جا رہا ہے اور ایک انتظام یہ بھی کیا ہے کہ پولیس والوں کو ذہنی طور پر قانون کا احترام سکھانے کے لئے تربیتی عدالتیں بھی لگائی جاتی ہیں۔ متحدہ پاکستان میں اسی قسم کا ایک بہت قدیم اور اعلیٰ ادارہ بنگلہ دیش کے شہر ساردا میں تھا، وہاں کی عمارت پھلور کی عمارت کی طرح تاریخی اہمیت رکھتی تھی اور غالباً ڈیڑھ سو سال پہلے تعمیر کی گئی تھی۔ ضلع راجشاہی میں واقع اس کالج میں پولیس سروس آف پاکستان کے تمام افسروں کو تربیت دی جاتی تھی۔

صوبہ سندھ انگریز راج کے آتے ہی صوبہ بمبئی کا حصہ بنا دیا گیا جبکہ پولیس کے نقطہ نظر سے بمبئی سے بھی بہتر پولیس ڈھانچہ سندھ میں سر چارلس نیپئر نے کھڑا کیا۔ سندھ میں کوئی الگ سے تربیتی ادارہ قائم کرنے کی بجائے سندھی پولیس والوں کی تربیت صوبہ بمبئی کے ناسک والے تربیتی مرکز میں کی جاتی تھی صدی کی تیسری دہائی کے آخر میں سندھ بمبئی سے الگ ایک صوبہ بن گیا تب پولیس کی تربیت کے مقامی انتظام کی ضرورت محسوس ہوئی مگر کئی برس بعد 1942ء میں منگو پیر کراچی میں ان رنگروٹوں کے لئے پولیس ٹریننگ سکول کھولا گیا جنہیں ابتدائی تربیت ضلعی ہیڈ کوارٹروں میں مل چکی ہوتی تھی۔ تاہم اونچے

عہدوں پر جن کو بھرتی کیا جاتا تھا ان کے لئے 1942ء سے لے کر 1948ء تک کسی قسم کی تربیت و تعلیم ضروری نہیں سمجھی جاتی تھی۔ اب طے پایا کہ ٹریننگ سکول میں ان کی تربیت بھی کی جائے۔ پہلے منگو پیر والا سکول کراچی پولیس لائنز میں منتقل کیا گیا اور پھر کراچی کے اندر مسئلہ مکانیت کا پیش آیا چنانچہ 1953ء میں کراچی سے سکول کو اٹھا کر سانگھڑ (شہداد پور) میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ عملہ کے لئے بھی رہائشی انتظام ہو گیا کیونکہ یہاں سے رینجرز کو حیدر آباد منتقل کر دیا گیا تھا۔ ان کے جانے کے بعد سکول کے سٹاف کے لئے بھی خاصی عمارتیں مل گئیں اور اب اس سکول میں درمیانے اور اوپر والے پولیس اہل کاروں کی تربیت کا کام شروع کر دیا گیا۔ 1955ء میں اسسٹنٹ سب انسپکٹروں کی تربیت کا کام شروع ہوا مگر سہالہ کالج کے شروع ہونے پر یہ کورس بھی وہاں ہونے لگا۔ 1961ء میں دوبارہ یہ کلاسیں یہاں شروع کی گئیں اس سکول کا سربراہ بھی سپرنٹنڈنٹ ہی تھا۔

1952ء میں کراچی میں پولیس ٹریننگ سکول کی عمارت مکمل ہوئی جس میں تین چار سو کے قریب اہل کاروں کو تربیت دینے کی گنجائش تھی۔ 1953ء میں نئے بھرتی کئے گئے سب انسپکٹروں کی تربیت سے آغاز ہوا۔ بعد میں کانسٹیبلوں کی ترقی کے لئے کورس شروع ہوا اور ہیڈ کانسٹیبلوں کے محکمانہ انتخابات کا کورس بھی۔ 1960ء میں اس وقت کے انسپکٹر جنرل پولیس محمد فرید خان نے سکول کو اپ گریڈ کیا اور پولیس ٹریننگ کالج سہالہ کے خطوط پر درمیانے اور اعلیٰ افسروں کی تربیت کا اہتمام بھی اس سکول میں کیا گیا۔

دوسرے ملکوں کی پولیس

پولیس کی انتظامیہ سے متعلق امریکہ کے ایک ماہر Sidney Rocker (سڈنی راکر) نے، جو جرائم او رپولیس سے متعلق Broward (بروورڈ) کمیونٹی کالج میں پڑھاتا ہے، ایک مضمون غیر ممالک میں پولیس کی تنظیم۔ ایک تجزیہ۔ کے عنوان سے لکھا جو ڈونلڈ اوشلز کی مرتبہ کتاب Modern Police Administration میں شامل کیا۔ کتاب لندن سے 1979ء میں شامل ہوئی۔ سڈنی راکر نے شکوہ کیا کہ اب تک دنیا بھر میں پولیس کے محکموں کے تقابل وغیرہ کے بارے میں کوئی خاص کام نہیں ہوا۔ دوسرے ممالک کی پولیس کے نظام کے بارے میں بہت ہی کم مواد ملتا ہے۔''

یہ بڑا اہم مسئلہ ہے اور اتفاق کی بات ہے کہ سارے جہاں کی پولیس کے بارے میں مواد بہت کم ملتا ہے، ہمارے ہاں بھی بڑا مسئلہ یہ ہے اور جو کچھ مواد فراہم کیا بھی گیا ہے وہ زیادہ تر ان انگریز مصنفین کا فیض ہے جو یا تو برصغیر میں پولیس یا سول ملازمت کر گئے یا جنہیں انگلستان یا کسی دوسرے ملک کے علمی ادبی ادارے نے اس قسم کے مطالعہ کے لئے تیار کیا۔ البتہ یورپ میں اپنے اپنے ملک میں اپنی اپنی پولیس کے بارے میں خصوصاً امریکہ اور انگلستان میں، اب بھی بہت کچھ لکھا جا رہا ہے۔ پھر بھی گلہ یہی ہے کہ مجموعی طور پر دنیا بھر میں پولیس کی جو پوزیشن ہے اس کی بھر پور تصویر سامنے نہیں آتی۔

ایک اور اہم مسئلہ بھی ہے کہ پولیس کی موجودہ شکل درحقیقت انیسویں صدی سے صورت پذیر ہونا شروع ہوئی، سرکاری اداروں کے آمر مطلق یا شاہ کی گرفت سے آزاد ہونے کے بعد ہی کوئی واضح صورت ملتی ہے۔ خود ہمارے ہاں ویدوں سے لے کر انگریزوں کے آنے تک پولیس کسی نہ کسی شکل میں موجود اور قائم رہی مگر کوئی ایسا ادارہ نہ بن سکی جس کی اپنی ایک الگ سے شناخت اور تاریخ ہوتی۔ پروفیسر اشتیاق حسین قریشی نے مغلیہ دور کے نظام حکومت سے متعلق کتاب میں عدلیہ حسبہ او رپولیس پر ایک باب لکھا جس

کے 27 صفحوں میں سے آخری دو صفحے پولیس کے بارے میں ہیں ان میں بھی ٹھوس حقائق یا نقشہ کم ہے لفظ زیادہ ہیں۔

انگریزوں نے جو کتابیں لکھیں ان کا اپنا نقطہ نظر تھا تاہم انہوں نے برصغیر کے ہندو اور مسلم ادوار میں پولیس کی جو بھی صورت رہی تھی اس کی کچھ نہ کچھ اطلاعات فراہم کیں، کہتے ہیں کہ کسی کتاب کے لکھے جانے میں جن کتابوں کو استعمال کیا جاتا ہے یعنی اس کی کتابیات سے یہ اندازہ نہیں لگانا چاہئے کہ اس موضوع پر معاملہ انہی کتابوں تک محدود ہے۔ اور کتابیں بھی ہوسکتی ہیں جو ممکن ہے اس مصنف کے مزاج کے مطابق نہ ہوں یا مصنف ان سے بے خبر ہو۔ بہر طور این۔اے۔ رضوی نے Our Police Heritage کے نام سے جو کتاب لکھی اس کی کتابیات میں بھارتی اور پاکستانی پولیس سے متعلق جو کتابیں ہیں ان کے عنوان اور مصنفین کے نام درج کرنا بے جا نہ ہوگا۔

Curry J.C The Indian Police. Garrett. H.L.O Old Police Battalions in the Punjab. Hari, Rao, P. Indian Police Act. Introduction. Kalia B.R. Development of police in the Punjab. Police Commission (1902-03) Report Police Administration Report.

تو یہ وہ کتابیں ہیں جن سے رضوی صاحب نے استفادہ کیا، اور ان سب کا تعلق عربوں کے اسلامی عہد اور برصغیر کے مختلف ادوار اور برطانوی پولیس تنظیم تک محدود ہے۔

مرحوم ڈپٹی انسپکٹر جنرل تنویر حمید کے نام سے کتاب Management in Punjab Law and Order آئی تو اس کی کتابیات کے باب میں پولیس کے بارے میں کسی پاکستان مصنف کا نام نظر نہیں آیا، دو تین ہندوستانی مصنفین کی پولیس کے بارے میں کتابوں کا ذکر ہے اور تو اور این۔اے۔ رضوی کی کتاب کا ذکر تک نہیں حالانکہ اس سے مصنف فیض یاب ہوا ہے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ مرحوم تنویر حمید کتاب کو مرتب بھی کر پائے تھے یا نہیں۔

ڈی آئی جی اظہر حسن ندیم کی کتاب

The Punjab Police in a comparative perspective.

1988ء میں آئی۔ اس کی کتابیات میں

Aslam Hayat Police Committee Report. Central Police Office Reports 1986, Moharam, Policing in the Urban area of Lahore. Policing in the Province of the Punjab, Constituation of Punjab Constabulary. Chaudhry Nasir, Main Branches of the Police. Ghafoor A. (1965) Some problems of investigation faced by the Police. (Unpublished Master's Thesis, Lahore, University of the Punjab. Hamid A.) (1981) Job adjustment among Police officers. (Master's unpublished thesis).

اور کچھ حکومت پاکستان کچھ حکومت پنجاب کے نوٹیفکیشن، کچھ افسروں کی رپورٹیں، کچھ سیمینار میں پڑھے گئے مضامین کچھ انہی صاحبان کے لکھے ہوئے کتابچے۔

پولیس کی روداد حیات اور اس پر جو افتاد آج پڑی ہے اس کے بارے میں مواد یوں سمجھئے کہ کچھ نہ ہونے کے برابر ہے۔ ممکن ہے کچھ چیزیں ہماری نظر سے نہ گزری ہوں اور کچھ چیزیں ہماری بے خبری اور کم فہمی کے باعث ہمارے لئے استفادہ کا باعث نہ بن سکی ہوں مگر حقیقت یہی ہے کہ پولیس کے بارے میں بے شمار تربیتی ادارے اور ایک آدھ کالج یا اکیڈیمی ہونے کے باوجود مقامی طور پر تیار کیا گیا لٹریچر تقریباً ناپید ہے۔ اگر یہ سادہ سی صورت کی تشنگی الامان تک پہنچ گئی ہے تو پھر پاکستان پولیس اور دوسرے ممالک کی پولیس کے تقابل اور تجزیے کہاں سے آئیں گے۔ اظہر حسن ندیم نے جو کچھ لندن میں پڑھا، مشاہدہ کیا، کورس کیا اس کی کتاب بنادی۔ اچھا کیا، طارق کھوسہ صاحب جاپان کی پولیس کا نقشہ دیکھنے گئے۔ آئے۔ انہوں نے بھی ایک رپورٹ لکھی مختصر سی البتہ افسروں نے جو سیاسی مداخلت کے ستائے ہوئے ہوں اس جاپانی رپورٹ کے حوالے سے بڑے زور سے مطالبہ کیا ہماری پولیس کی ترکیب و تنظیم بھی جاپانی ڈھنگ پر ہونی چاہئے۔

ہم یہاں اس بات کا مطالبہ نہیں کریں گے کہ دوسروں سے تقابل سے پہلے اپنے آپ پر نظر ڈال لینی چاہئے۔ مثلاً آپ کی پولیس میں خواندگی وغیرہ کا کیا حال ہے اور

جاپان، جرمنی، امریکہ، سعودی عرب یا انگلستان میں نقشہ کیا ہے۔

آپ کے افسر اور عہدہ دار کو پولیس رولز، نظم وضبط اور قوانین کا کس حد تک علم ہے اور دوسروں کا حال کیا ہے؟

آپ کے ہاں بے روزگاری کس قدر ہے اور دوسرے ممالک میں روزگار کا کیا حال ہے کیونکہ بے روزگاری کا خدشہ، ہر غیر اصولی، غیر قانونی او راخلاق اور فرائض سے گری ہوئی فرمائش یا حکم ماننے پر مجبور کر دیتا ہے۔

ہمارے ریکارڈ میں تو یہ بھی نہیں ملتا کہ کتنے پولیس والوں نے گزشتہ سوا سو سال میں غلط حکم کو ماننے سے انکار کرتے ہوئے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا یا بے روزگاری قبول کر لی۔ ایک چودھری افضل حق، (قائد احرار) یاد پڑتا ہے سرجلسہ عام وردی اتار کر چلے آئے تھے۔

جہاں تک دوسرے ممالک کی پولیس سے تعلق کی بات ہے اس ضمن میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ اپنا جنہیں خود ہوش نہیں وہ دوسروں کی کیا خبر لائیں گے اور اگر صورت حال کو بہتر ہی بنانا تھا یا تھوڑا سا فرق ڈالنا تھا تو یہ تو کیا جا سکتا تھا کہ جن پولیس والوں نے اپنی اپنی سرگزشت لکھی اس میں جہاں جہاں انہوں نے فرائض منصبی سے ہٹ کر برے اور اچھے کام کئے انہیں ہی اکٹھا کر کے شائع کر دیا جائے کہ پولیس والے پڑھیں اور اگر راہ نمائی یا گمراہی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو حاصل کر لیں۔ تاہم ایسا بھی نہیں ہوا۔ ہاں اس ضمن میں ایک کوشش پنجاب کے ایک سابق انسپکٹر جنرل چودھری سردار محمد نے یہ کی کہ انہوں نے ہیڈکوارٹر سمیت رینج کے صدر مقاموں سے پولیس کے باقاعدہ (ماہانہ) رسالے نکلوانے کا اہتمام کیا۔ اگرچہ مقصد یہی تھا کہ پولیس کا امیج بہتر ہو بہر طور اس کے باوجود اسے اچھی کوشش کہا جا سکتا ہے، بے نظیر بھٹو اور منظور وٹو کی حکومت کے آتے ہی وہ آئی جی بھی گئے اور وہ سارے رسالے سوائے ایک محافظ کے جو غالباً جانکنی کے عالم میں ہے۔

سو امریکی مصنف کے شکوہ کی آڑ لے کر کہا جا سکتا ہے کہ یہ بیماری سارے جہان کو لگی ہوئی ہے اگر امریکہ جیسے ملک میں دوسرے ممالک کی پولیس کے بارے میں لٹریچر اور مواد او راعداد وشمار دستیاب نہیں تو پاکستان میں ہم بے چارے تو نے ہاتھ باگ پر ہے نے پا ہے رکاب میں۔ سڈنی راکر کا مضمون بھی ہر چند خاصا پرانا ہے یعنی 1979ء کے

لگ بھگ کا تاہم لاعلموں کے لئے اب بھی اس میں سبق موجود ہے۔ اس نے تین ممالک امریکہ (نیویارک شہر) انگلستان اور جاپان کے تقابلی اعداد وشمار دیئے ہیں۔ جو یوں ہیں۔

1976ء جرائم کا نقشہ

	نیو یارک	انگلینڈ	جاپان
آبادی (تقریباً)	76لاکھ	5 کروڑ	سوا گیارہ کروڑ
قتل	1,600	420	2,111
ایک لاکھ کے پیچھے اوسط	21	0.9	1.9
چوری، راہ زنی	86,000	6,000	2,095
ایک لاکھ کے پیچھے اوسط	1,131	12	1.9
نقب زنی	200,000	407,000	328,000
ایک لاکھ پر	2632	831	293

امریکی مصنف نے کہا کہ یہ تقابلی جائزہ لینے کے بعد اس ضرورت کی شدت اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ ہم دوسرے ممالک میں پولیس کی کارکردگی اور تنظیم وغیرہ کے بارے میں باخبر ہوں اور تجزیہ کرتے رہیں تا کہ اس کی روشنی میں اپنی پولیس کو بہتر بناسکیں، دوسری بات یہ ہے کہ جن ممالک میں جرائم کم ہو گئے ہیں یا کم ہیں ان کے اسباب جاننا بھی ضروری ہے۔ اسی طرح جب ہمیں یہ معلوم ہو کہ دوسرے ممالک میں قوانین اور عدلیہ کے معاملات ہم سے بہتر ہیں اور وہاں پولیس کی کارکردگی میں ایک یہ عنصر بھی اہم ہے تو ہم اپنی صورت حال کو بہتر بنانے کے لئے سوچ بچار کر سکتے ہیں۔ اسی طور ہمیں دوسرے ممالک کی زندگی کے مختلف شعبوں کے بارے میں بھی پولیس اور اس کی کارکردگی کے حوالے سے بہت کچھ معلوم ہوگا۔

سڈنی راکر کہتا ہے کہ یوں تو دنیا بھر میں جرائم بڑھ رہے ہیں مگر امریکہ میں خاص طور پر 1950ء کے بعد سے تو بے لگام اضافہ ہو رہا ہے اور اس حوالے سے ہمارے نظام عدل کے شعبہ جرائم (پولیس عدالتیں اور اصلاح احوال کے ادارے) شدید تنقید کی زد میں ہیں۔

اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ پولیس کے تقابلی مطالعے کے لئے پس منظر کے طور وہاں کی سیاست کو بھی ملحوظ رکھنا ہوگا تو درست ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تقابل صرف ایک ادارے کی تنظیم، تربیت اور عملی تدابیر (آپریشن) تک ہی محدود نہیں رہتا۔ کوشش کرنی چاہیئے کہ اس مسئلہ کے ثقافتی ڈھنگ، تاریخی عوامل اور معاشرتی نظام کو بھی سمجھا جائے۔ یعنی پولیس کی کارکردگی کو اس ملک کے پورے فریم ورک میں رکھ کر دیکھا جائے کہ وہ کیوں کامیاب یا کیوں ناکام ہے اور وہاں جرائم کی رفتار زیادہ یا کم کیوں ہے۔ دیکھنا ہوگا کہ بین الاقوامی سطح پر پولیس عدالت، اصطلاح احوال اور آبادی میں کیا کیا مشترک ، اور کیا کیا مختلف ہے اور کن نوعیت کے اوصاف اور کوتاہیاں ہیں۔

مثلاً یہ دیکھنا ہوگا کہ دنیا کے بیشتر ممالک میں پولیس کی تنظیم قومی یا مرکزی نوعیت کی ہے۔ برازیل اور آسٹریلیا میں یہ اصلاً ریاستی سطح کا ادارہ ہے جبکہ امریکہ اور لندن میں یہ ادارہ بنیادی طور پر مقامی نوعیت کا ہے۔ لیکن اب انگلستان میں رجحان مرکزیت کی طرف ہے۔

امریکہ میں اب تک پولیس کے سترہ ہزار شعبے ہیں۔ ان کو باہم مربوط کرنے کے لئے کئی تجاویز اور سفارشات بھی آئی ہیں مگر ان پر دھیان کم ہی دیا جا رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جہاں سرکاری یا استعمال کی زبان انگریزی ہے وہاں سے بھی اس قسم کے تقابلی جائزے لینا اتنا آسان کام نہیں ہے لیکن جہاں دوسری زبانیں ہیں مثلاً جاپان یا یوگوسلاویہ میں تو وہاں یہ کام اور بھی مشکل ہو جاتا ہے تاہم اس کے باوجود کسی نہ کسی حد تک مختلف ممالک کی پولیس اور ان کا باہمی تقابل ہو بھی سکتا ہے......زیادہ پکا نہ سہی۔

انسائیکلوپیڈیا بریٹینکا کے مطابق فرانس میں دو قسم کی قومی پولیس ہے۔ ایک نیشنل پولیس ہے جس کے دستے نیچے ہر شعبہ میں موجود ہیں۔ اس شعبے کا انچارج نیشنل پولیس کے ڈائریکٹر جنرل کے سامنے جوابدہ ہے۔ دوسری طرف ژنید آرمری نیشنل الگ ہے۔ فرانس میں بھی پولیس کی تھی ایک وہ جو پیرس میں سرگرم عمل تھی اسے پرلیفیکچر پولیس کہا جاتا تھا جبکہ باقی قریہ وشہر کی پولیس سوزیتے نیشنل کہلاتی تھی۔ ان دونوں کو 1966ء میں مدغم کر دیا گیا۔ نیشنل پولیس کی نفری اکانوے ہزار کے قریب اور اس میں جاسوسی، جوڈیشل، پبلک سیفٹی، تحفظ، ضوابط، تربیت اور سٹاف کے شعبے شامل ہیں۔ ژنید آرمری کی نفری اکسٹھ ہزار

ہے۔ بڑے شہروں میں ایک اور نام کی پولیس بھی ہے جسے گار دینیے دی لاپسیس (محافظان امن) کہا جاتا ہے۔ یہ میونسپل اداروں کے ماتحت ہوتی ہے۔ اس کے ذمے گشت اور ٹریفک کا کام ہوتا ہے۔ پیرس کی پولیس کے پانچ شعبے ہیں۔ میونسپل پولیس دوسرا صدر اور اہم افراد کی حفاظت سے متعلق، تیسرا جو شعبہ جرائم کا ذمہ دار ہے اور ایک ٹیکنیکل یونٹ۔ پیرس میں بیس ہزار محافظان امن ہیں۔ اور یہی دراصل میونسپل پولیس ہے۔ ایک ضلعی یونٹ کا انچارج کمیسار ہوتا ہے جو پرِیفکچر کے سامنے جوابدہ ہوتا ہے اسے میئر اور میونسپل انتظامیہ سے تعاون کرنا ہوتا ہے۔ اسی طرح باقی شعبوں کے بھی فرائض متعین ہیں اور افرادی قوت، افسروں اور ماتحتوں کی تعداد، وردی سب متعین ہیں۔جن پولیس والوں کو جرائم کی تفتیش وغیرہ کرنا ہوتی ہے اور جن پولیس والوں نے انتظامی امور سرانجام دینا ہوتے ہیں وہ مخصوص وردی نہیں پہنتے۔ ان میں افسر اور انسپکٹر شامل ہوتے ہیں نظم ونسق اور دوسرے اہم معاملات کے بارے میں فیصلے پیرس میں واقع ہیڈ کوارٹرز میں ہوتے ہیں۔

پولیس نیشنل کے کئی اور خاص شعبے بھی ہیں۔ ایک ہے ضلعی پولیس (تفتیش) جو ستر شاخوں میں منقسم ہے ۔ اس میں رائٹ پولیس (انسداد دنگا پولیس) جاسوسی یا انٹیلی جنس اور انسداد انٹیلی جنس گشتی دستے، ری پبلکن سیکورٹی کمپنی شامل ہے۔ جو دو سو کے قریب کمپنیوں میں منقسم ہے اس کی نفری ساڑھے تیرہ ہزار کے قریب ہے۔ یہ نفری بیرکوں میں رہتی ہے۔مئی 1968ء میں انہوں نے پیرس کے اندر طلبا سے بڑی سختی کی تھی جس کی بنا پر ان کی بڑی بدنامی ہوئی تھی۔

ژینڈ آرمری زبردست ڈسپلن کی پابند ہے۔ یونٹوں میں منقسم، اس کے سپاہی بیرکوں میں رہتے ہیں۔ اس میں متحرک ژینڈ آرمری اور ڈیپارٹمنٹل بھی جس کا ہر سیکشن ایک خاص فوجی علاقہ میں متعین ہوتا ہے جو ایک جرنیل کے ماتحت ہوتے ہیں۔ پولیس کا یہ شعبہ براہ راست وزیر دفاع کے تابع ہوتا ہے اس کے ذمے اس کے ہیڈ کوارٹر کی ذمہ داری ہے کہ منصوبہ بندی کرے، عملہ کی تنظیم اور انتظام کرے۔

بعض علاقوں کے میئروں کے پاس دیہی پولیس یا کمیونل پولیس والے ہوتے ہیں مگر اصولاً جس جگہ کی آبادی دس ہزار یا اس سے کم ہو وہاں ژینڈ آرمری پولیس ہوتی ہے ان کا کام سڑکوں کی نگرانی بھی ہے۔بعض عدالتی پولیس کے افسر مقرر کئے جاتے ہیں اس

طرح وہ ہر قسم کے جرائم قتل، اغوا، ضرب شدید اور اسی طرح کے جرائم کی تفتیش کرنے کے مجاز ہوتے ہیں۔

اگرچہ مجموعی طور پر یہی تاثر ملتا ہے کہ فرانس کی پولیس کی شکل واحدنی ہے اور اختیار کا ارتکاز مرکز میں ہے مگر عملاً ایسا نہیں ہے ۔ یہ اندرونی تقسیم مختلف شعبوں پر ایک دوسرے کے محاسبے کی گنجائش نکالتی ہے اور یوں بدعنوانیوں سے بچنے کی بھی صورت نکل آتی ہے۔

بلجیم:۔

بظاہر اس ملک میں بھی پولیس کی حیثیت قومی نظر آتی ہے۔ یہاں ایک عدالتی پولیس ہے جو وزیر انصاف کے ماتحت ہوتی ہے۔ اس میں سول ملازمین ہوتے ہیں اس کے عملہ کا پولیس کے انتظامی امور میں کوئی عمل دخل نہیں۔ ان کا کام جرائم کی تفتیش کرنا، مقدمہ عدالت میں پیش کرنا اور مجرموں کو عدالت کے سامنے پیش کرنا ہے۔ ریلوے، ملکی تحفظ، فوج اور ایٹمی ریسرچ کے اداروں کی حفاظت کے لئے الگ پولیس ہے۔ ژیند آرمری ملک کی فوج کا ایک حصہ ہے۔ یہ انتظامی پولیس بھی ہے۔ قانون کا نفاذ بھی کراتی ہے۔ امن عامہ سے متعلق فرائض انجام دیتی ہے۔ اس حیثیت میں وزیر داخلہ کے ماتحت ہے اور عدالتی پولیس اور قومی سلامتی کے ضمن میں وزارت انصاف کے تابع ہوتی ہے۔ فوجی بھگوڑوں اور نقل و حرکت سے متعلق امور کے سلسلے میں یہ وزارت دفاع کے سامنے جوابدہ ہے۔ اس کے علاوہ علاقائی پولیس ہے (کمیونل) یہ پولیس قصبے اور دیہی آبادیاں کھڑی کرتی ہیں ژیند آرمری پولیس کو ملک کے سبھی حصوں میں کام کرنے کا اختیار ہے۔

اٹلی:۔

اٹلی میں بھی قومی سطح کی متعدد پولیس تنظیمیں یا محکمے ہیں۔ پبلک سیکورٹی گارڈز فوج ہی کا حصہ تصور ہوتے ہیں مگر ان کا کام امن عامہ، جان و مال کا تحفظ، جرائم کی روک تھام، اجتماع یا ہجوم کے مسائل، جرائم کے سلسلے میں شہادتیں فراہم کرنا ان کی ذمہ داری ہے۔ اگرچہ یہ نیم فوجی قسم کی تنظیم ہے مگر یہ سول پولیس کے تمام فرائض انجام دیتی ہے اور وزیر داخلہ کے ماتحت ہوتی ہے۔

کور آف کیرابنیئر فوجی قسم کی تنظیم ہے۔ بیرکوں میں رہتی ہے۔ بعض امور میں وزیر دفاع کے سامنے ذمہ دار ہے مگر پولیس کے فرائض کے سلسلے میں وزارت داخلہ کے ماتحت ہے۔ جرائم کی تفتیش کے سلسلے میں یہ معاملات عدالت کے سامنے پیش کرتی ہے اور یوں یہ انصاف کے شعبے سے بھی وابستہ ہے۔ کور کے کمانڈروں کو ہر سطح پر فوج، سیاسی قیادت، عدالتی اور پولیس حکام سے رابطہ رکھنا ہوتا ہے۔

ایک اور شعبہ ہے گارڈیا ڈی فنانزا جس کا کام سمگلنگ روکنے، غیر قانونی آمدورفت اور ٹیکس چوری کرنے کے انسداد ہے۔ پولیس کی ایک تنظیم میونسپل کمیٹیوں سے متعلق ہوتی ہے اسے وجیلی اربانی کیا جاتا ہے یہ میونسپل قسم کے فرائض خصوصاً ٹریفک کا کام کرتی ہے۔ بارہا یہ کوشش ہوئی ہے کہ وجیلی اربانی کو پبلک سیکورٹی پولیس میں مدغم کر دیا جائے مگر میونسپل کمیٹیاں اس کے خلاف ہیں۔

سپین:۔

یہاں بھی پولیس کی متعدد تنظیمیں ہیں جو اندرونی طور پر خاصی مربوط ہیں۔ دو بڑی تنظیمیں تو فوجی قسم کی ہیں ان کا اسلحہ بھی ویسا، تربیت بھی ویسی اور وابستگی بھی فوج سے ہے۔ سول گارڈ (گارڈیا سول) دیہی علاقے میں نفاذ قانون، امن عامہ اور جرائم کے انسداد کی ذمہ دار ہے۔ آرمڈ اینڈ ٹریفک پولیس (پولیسیا آرمیڈ ای ڈی ٹریفیکو) متذکرہ بالا نوعیت کی ذمہ دار ہے مگر شہروں میں۔ سول گارڈ کے پاس تھانے بھی ہوتے ہیں اور وہ گشت بھی کرتے ہیں اس کے علاوہ ان کے پاس ریزرو بھی ہوتے ہیں جو شاہراہوں پر نظام بحال رکھنے کے ذمہ دار ہیں۔ مسلح پولیس شہروں میں گشت کرتی ہے۔ تھرڈ سٹیٹ پولیس کور مسلح پولیس کے دفاتر میں ہوتی ہے اس کے سپیریئر ایجنٹ سادہ کپڑوں میں ہوتے ہیں۔ سول ملازم ہوتے ہیں اور جرائم کی تفتیش کا کام کرتے ہیں۔ شہروں، قصبوں میں بھی میونسپل پولیس ہوتی ہے جس کے پاس کوئی اسلحہ نہیں ہوتا۔ اسے تنخواہ بھی میونسپل اداروں کی طرف سے دی جاتی ہے۔ یہ اہل کار شہر کے میئر کے ماتحت ہوتے ہیں۔ اگر وہ کسی مجرم کو گرفتار کر لیں تو اسے فوراً مسلح پولیس کے حوالے کر دیتے ہیں۔

سکنڈے نیویا کے ممالک:۔

ان ممالک کی خوبی یہ ہے کہ ان کی آبادی خاصی تعلیم یافتہ اور باشعور ہے، تھوڑی ہے، نسلی، لسانی اعتبار سے بڑی یکساں اور ہم آہنگ ہے چنانچہ یہاں کی پولیس بڑی مربوط ہے۔ ڈنمارک، فن لینڈ، ناروے اور سویڈن سب میں ایک سی قومی سطح کی پولیس ہے۔ ریلوے، بندگارہوں دوسرے معاملات کے لئے الگ الگ شعبے نہیں ہیں۔ فن لینڈ میں پولیس مرکزی حکومت کے ماتحت ہے اور وہی اس کا خرچہ اٹھاتی ہے۔ ناروے میں پولیس پر دس فی صد خرچ بلدیاتی ادارے ادا کرتے ہیں۔ ملک کو چوون پولیس حلقوں میں تقسیم کیا گیا ہے ہر حلقے کا انچارج پولیٹمیسٹر کے ماتحت ہوتا ہے جو لاگریجوایٹ ہوتا ہے۔ یہ براہ راست وزیر انصاف و پولیس کے سامنے جوابدہ ہوتا ہے۔ کانسٹیبل بننے سے پہلے کسی بھی شہری کو کسی فورس کے ساتھ سکھلائی کی خاطر وابستہ ہونا پڑتا ہے۔ پھر پولیس سکول میں دس ہفتے کا کورس کرنا ہوتا ہے۔ اس کے بعد مزید چار ماہ تک عملی تربیت لینا ہوتی ہے۔ ڈنمارک میں مرکزی حکومت پولیس کا کمشنر مقرر کرتی ہے۔ ملک کو 72 حلقوں میں تقسیم کیا گیا ہے ہر حلقے کا انچارج یا کمانڈر چیف کانسٹیبل کہلاتا ہے اور اپنی جگہ پر آزاد ہوتا ہے۔

سویڈن میں بے پناہ ترقی ہوئی ہے ٹیکنالوجی کے میدان میں بھی اور معاشرتی شعبوں میں بھی۔ زیادہ لوگ شہروں میں اٹھ آئے ہیں، دیہی علاقوں میں آبادی کم رہ گئی۔ یوں پولیس کے لئے بھی آدمی کم ملتے ہیں۔ 1956ء سے پولیس مرکزی حکومت کا محکمہ بن چکی ہے۔ پولیس کے حلقے کم کر دیئے گئے ہیں اور تھانوں کی تعداد پانچ سو دس ہے۔ مواصلات وغیرہ کے بہتر انتظام کا باعث تھانوں اور حلقوں کی تعداد کم ہوئی قرض اداروں کی املاک کی ضبطی اور مقدمہ بازی کا شعبہ پولیس سے لے لیا گیا ہے۔ پولیس کے دو بڑے شعبے ہیں ایک جوگشت کرتا ہے اور دوسرا جو جرائم سے متعلق پوچھ گچھ اور تفتیش کرتا ہے۔ مقامی طور پر پولیس کے لئے مشاورتی کمیٹیاں بنا دی گئی ہیں۔ تاکہ پولیس کے سربراہ لوگوں سے قانون اور دوسرے مسئلوں پر تبادلہ خیال کرسکیں۔

برطانیہ:۔

برطانیہ کی پولیس قومی سطح کی نہیں مگر مرکزی حکومت کا پولیس پر کنٹرول خاصا موثر ہے پھر مسلسل عمل سے یوں ہوا ہے کہ متعدد چھوٹے شعبے یا یونٹ بڑوں میں مدغم کر دیئے

گئے ہیں اس کے باوجود آج بھی مختلف علاقوں میں مختلف قسم کا ڈھانچہ چل رہا ہے۔
میٹروپالٹین پولیس کا انچارج وزیر داخلہ ہوتا ہے جو پارلیمان کے سامنے جوابدہ ہوتا ہے (1970ء میں اس میں اکیس ہزار کی نفری تھی) میٹروپالٹین پولیس لندن شہر میں گشت کرتی ہے۔ پولیس کے دوسرے محکموں (شاخوں) کی تعداد 1860ء میں 226 تھی جو باقی انگلستان اور ویلز میں تھیں۔ 1969ء میں ان کی تعداد کم ہو کر چھیالیس ہو گئی تھی۔ اب اس کی نفری اٹھہتر ہزار ہے۔

وزیر داخلہ اگر ضروری سمجھے تو کسی چیف کانسٹیبل سے کہہ سکتا ہے کہ وہ اپنے یونٹ کی کارکردگی بڑھانے کے لئے مستعفی ہو جائے مگر وہ اسے حکم نہیں دے سکتا۔ اور جہاں تک کارروائی یا فرائض کی انجام دہی کا معاملہ ہے وہ صرف انگلستان کے قانون کے پابند ہیں۔ 1969ء میں سکاٹ لینڈ میں بائیس مختلف تنظیمیں تھیں (نفری گیارہ ہزار) ان کی حیثیت بھی انگلش دیہی پولیس کے برابر تھی۔ ان میں فرق صرف اس قدر تھا کہ انگلستان میں پولیس خود مقدمہ عدالت میں لے جاتی ہے، شہروں میں میونسپل کمیٹیوں نے ٹریفک کے معمول کیسوں کو چھوڑ کر باقی مقدمات کے لئے اپنے وکیل رکھے ہوئے ہیں جبکہ سکاٹ لینڈ میں ریاستی پولیس ہے آر یو سی (نفری تین ہزار)۔ اس کا سب سے بڑا افسر امور داخلہ کے وزیر کے سامنے جوابدہ ہوتا ہے۔ انگلستان میں ریلوے، بندرگاہوں اور دفاعی تنصیبات کے لئے الگ الگ فورس ہے۔ اس کے کانسٹیبلوں کو کسی کو گرفتار کرنے کا اختیار ہے اور ان افسروں کو شے کی بنا پر بھی کسی کو گرفتار کرنے کا حق ہے۔

1962ء میں پولیس کے بارے میں بنائے گئے رائل کمیشن نے کہا تھا کہ پولیس کو قومی سطح کا محکمہ بنانے کے لئے خاصا جواز موجود ہے اور اگر اسے اس میں ڈھال دیا جائے تو یہ زیادہ معقول بات ہوگی۔ تاہم اس نے بلدیاتی پولیس کی الگ حیثیت کو جاری رکھنے کی بھی سفارش کی۔ کمیشن کے ارکان نے یہ بھی کہا کہ قومی سطح پر پولیس کا محکمہ ہمارے نزدیک نہ غیر آئینی ہے اور نہ ہی سیاسی اعتبار سے خطرناک، برطانیہ میں پولیس کی الگ الگ تنظیموں کے باوجود ان میں بہت گہرے رابطے ہیں، تربیت گاہوں میں سب اکٹھے رہ چکے ہوتے ہیں، لیبارٹریوں میں، وائرلیس ڈپوؤں میں، جرائم کا ریکارڈ کے دفاتر میں، اکٹھے ہو جاتے ہیں پھر تفتیش میں ایک دوسرے کی مدد کی ضرورت پڑتی ہے قتل کے لئے سکاٹ

لینڈ یارڈ کی اور کمپنی فراڈ کے لئے لندن میٹرپالیٹن کی خدمات عارتیاً لی جاتی ہیں۔

برطانوی پولیس میں ایک مرحلے پر ٹریڈ یونین بنانے کا بھی مسئلہ اٹھا۔ پہلی جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد مہنگائی بہت ہوگئی پولیس والوں کی تنخواہیں بہت کم تھیں، اس میں گزارہ مشکل تھا چنانچہ اضافہ کے لئے مطالبہ ہوا۔ بات نہ مانی گئی تو لندن اور لیور پول کے بعض سپاہیوں نے ہڑتال کر دی۔ جس کے بعد تنخواہ سکیل بہتر کر دیئے گئے مگر ایک قانون پولیس ایکٹ 1919ء منظور ہوا جس کے تحت ہڑتال کی مکمل ممانعت کر دی گئی اور کہا گیا کہ جو پولیس والا ہڑتال کرے گا وہ برطرف کر دیا جائے گا۔ اب ایک پولیس فیڈریشن بن گئی جس کا سربراہ پولیس والا ہے۔ یہ فیڈریشن ترقیوں اور ڈسپلن کے امور کو چھوڑ کر باقی تمام معاملات پر اعلیٰ افسروں یا وزیر داخلہ سے بات کرسکتی ہے۔ اسی طرح سپرنٹنڈنٹوں اور چیف افسروں کی بھی ایسوسی ایشنیں بن گئیں۔

برطانوی پولیس میں گشت کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ جو برطانیہ والوں کی نظر میں جرائم کی روک تھام میں مؤثر بات ہوتی ہے، برطانیہ والوں کا 1829ء سے یہی خیال ہے کہ ایک مستعد پولیس فورس کا اولین فرض یہی ہے کہ جرائم کو روکے۔ برطانوی پولیس والے ہتھیار ساتھ نہیں رکھتے صرف اس صورت میں ہتھیار رکھنے کی اجازت ہے جب انہیں خوف ہو کہ جس مشن پر وہ جا رہے ہیں اس میں فائرنگ ہوسکتی ہے۔ تب صرف تربیت یافتہ افسروں کو مختصر مدت کے لئے اسلحہ دیا جاتا ہے۔ ویسے بھی برطانیہ میں عام شہری کے لئے اسلحہ حاصل کرنا اور رکھنا آسان نہیں ہے۔

برطانیہ اور امریکہ کے پولیس والوں میں یہ فرق بتایا جاتا ہے کہ برطانیہ والے پولیس میں بھی ایسے رہتے ہیں جیسے مسلح افواج میں۔ امریکی پولیس کی نوکری کو محض ایک روزگار سمجھتے ہیں جبکہ برطانیہ والے اسے کیرئیر تصور کرتے ہیں۔ امریکہ اور برطانیہ دونوں جگہوں پر پولیس مقامی حکام اور اداروں کا مسئلہ ہے مگر امریکہ میں مرکزی حکومت کا پولیس سے کوئی بھی تعلق نہیں جبکہ برطانیہ میں پولیس کی تمام تنظیمیں بہر طور وزیر داخلہ کو جوابدہ ہیں جو خود اس مسئلہ پر پارلیمان کے سامنے جوابدہ ہے۔ مرکزی حکومت کے دباؤ کے باعث ہی برطانیہ میں تنظیموں کی تعداد کم ہوئی ہے جبکہ امریکہ میں اب بھی سترہ ہزار تنظیمیں ہیں۔

انگلستان میں پہلی بار پولیس 1361ء میں وجود میں آئی تھی۔ بادشاہ نے عدالتوں

میں امن وامان کے لئے پولیس تشکیل دی تھی۔ اب بھی لندن کی میٹروپالیٹن پولیس کے ایک تہائی حصہ میں جسٹس آف پیس ہوتے ہوتے ہیں جبکہ باقی دو تہائی میں کاؤنٹی کے کونسلر ہوتے ہیں۔ انگلستان میں پولیس فورس کا آدھا بجٹ مرکزی حکومت سے اور آدھا بلدیاتی اداروں سے آتا ہے۔ لامحالہ پولیس مقامی طور پر اپنی کارکردگی کو ہی پیش نظر نہیں رکھتی یہ بھی دیکھتی ہے کہ وہ لوگوں کی نظر میں بھی اپنی مستعدی، حلیمی اور مروت کے اعتبار سے سرخرو رہے۔ چیف کانسٹیبل کا تقرر بلدیاتی اداروں کے نمائندوں کی کمیٹیاں کرتی ہیں تاہم اس کی تقرری کی منظوری وزارت داخلہ دیتی ہے۔ تقرری اور منظوری کے اس طریقے نے بھی انگلستان کی پولیس کو کارکردگی کے اعتبار سے ایک طرح سے مثالی پولیس بنا رکھا ہے۔

امریکہ:۔

امریکی پولیس کا نمونہ دنیا بھر میں ایک اور منفرد حیثیت رکھتا ہے، یہ ساری کی ساری مقامی پولیس ہوتی ہے۔ چنانچہ اس میں غیر معمولی تضاد بھی پایا جاتا ہے اور ایک ہی کام کے بارے میں بیک وقت مختلف نفری اور خرچہ بھی ہوتا ہے۔ ان کے حلقہ اختیار میں باہمی تنازعہ بھی چلتا ہے۔ ہر علاقے کی اپنی پولیس ہوتی ہے تاہم تفتیش کے سلسلے میں یہ وفاقی افسروں سے آزاد نہیں ہوسکتی ہے۔ مقامی طور پر بنائی جانے والی پولیس کے معیار میں بھی بڑا فرق ہوتا ہے۔ دیکھا جائے تو امریکہ میں پانچ اہم شعبے ہیں۔ پہلا وفاقی نظام ہے اس میں وہ پولیس افسر ہوتے ہیں جو محکمہ انصاف کے ماتحت ہوتے ہیں۔ ٹیکس چوری کرنے والوں کے معاملات سے متعلق بیورو ہوتا ہے۔ منشیات کی روک تھام کا ادارہ اور پوسٹل انسپکشن سروس۔ دوسرے پچاس ریاستوں میں قائم تفتیشی ادارے اور پولیس فورس۔ تیسرے تقریباً تین ہزار کاؤنٹیز میں مقرر شیرف اور ڈپٹی شیرف جمع مزید کاؤنٹی پولیس جس سے ایک تکرار بھی پیدا ہوتی ہے۔ کوئی ہزار شہروں اور بیس ہزار قصبوں یا بڑے شہروں سے ملحق قصبوں کی پولیس فورس اور پانچوں پندرہ ہزار دیہات اور چھوٹی بستیوں کی پولیس۔ ان پانچ تنظیموں کے علاوہ بعض علاقوں میں اور طرح کی پولیس بھی ہوتی ہے مثلاً کولمبیا میں ایک پولیس وہ ہوتی ہے جو پلوں، سرنگوں، یونیورسٹیوں، پارکوں وغیرہ کی حفاظت پر مامور

افسروں کی معاون ہوتی ہے۔ لیکن اس کا تعلق لوکل پولیس کے اداروں سے نہیں ہوتا۔ امریکی پولیس کی کوئی فیڈرل یونین نہیں ہے جو ان کے مالی مفادات، اوقات کار اور شکایات وغیرہ کا معاملات اٹھائے تاہم پولیس والے متعدد یونینوں کا رکن ضرور ہیں، کوئی پینتالیس کے قریب بڑے شہروں میں اس قسم کی یونینیں یا انجمنیں موجود ہیں جو اپنے مفادات کے حوالے سے لوگوں کو ہم رائے بنانے کی کوشش کرتی رہتی ہیں۔ اگرچہ 1919ء میں ہونے والی بوسٹن کی پولیس ہڑتال کے بعد ایسی کوئی مثال نہیں مگر کبھی کبھی احتجاج کی شکل یوں بھی ہو جاتی ہے کہ ایک دم بہت سے پولیس والے بیمار پڑ جاتے ہیں۔ اسی قسم کا کام سکنڈے نیویا کے ممالک اور کینیڈا میں بھی ہوتا رہتا ہے۔

امریکہ کے آئین کے تحت پولیس رکھنا، اس کے بارے میں قانون وضع کرنا اور دوسرے تمام امور ریاستوں کی ذمہ داری ہیں۔ تاہم یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس طور پر آئین کی کسی دوسری شق کی خلاف ورزی نہ ہو یہ دیکھنا فیڈرل گورنمنٹ کا کام ہے۔ اگر کسی علاقے یا شہر کی پولیس کسی قتل یا قانون کی خلاف ورزی کے سلسلے میں کوئی کارروائی نہیں کرتی اور اس طور بعض شہریوں کے حقوق متاثر ہو رہے ہیں تو پھر وفاقی حکومت کے فیڈرل بیورو آف انویسٹی گیشن کو اپنی ٹیم بھیجنا پڑتی ہے۔ جو یہ دیکھتی ہے کہ کسی نے مرنے والے کے حقوق کو غصب تو نہیں کیا۔ آئین کے مطابق یہ وفاقی حکومت کا فرض ہے کہ وہ ایف بی آئی کے ذریعے اصلی صورت حال سے باخبر ہو۔

انسائکلو پیڈیا بریٹینکا میں امریکی پولیس کے بکھراؤ (یا تنظیمی تفریق اور انتشار) کی ایک مثال یہ دی گئی ہے کہ فرض کریں ایک یورپی باشندہ کیلی فورنیا کی یونیورسٹی میں پڑھنے یا پڑھانے آیا ہے۔ وہ ہفتے کو نیوادا جاتا ہے اور وہاں سے ایک لڑکی لے کر یونیورسٹی میں اپنے ٹھکانے پر آتا ہے، کسی بات پر اسے قتل کر دیتا ہے تو اس واردات پر پولیس کی مندرجہ ذیل آزاد فورس (یا محکمے) بیک وقت کام شروع کر دیں گے۔ یونیورسٹی پولیس، سٹی پولیس، لوکل یا ؤنٹی شیرف، ایف بی آئی اور امیگریشن کے حکام۔ اگر درمیان میں معاملہ منشیات کا ہو تو ڈرگ انفورسمنٹ ایڈمنسٹریشن بھی کود پڑے گی۔ اتنے سارے جنازہ پڑھانے والوں کے ہاتھوں جنازے کا کیا حشر ہوگا؟ اندازہ کرنا کوئی مشکل نہیں!

اس نظام پولیس کے حق میں دلیل یہ دی جاتی ہے کہ مقامی مسائل کو مقامی طور پر

ہی حل کیا جانا چاہئے اور اگر پولیس کو بھی واشنگٹن کے ماتحت کر دیا گیا تو ایک تو مقامی طور پر مسائل کو فوری اہمیت نہیں دی جائے گی، پولیس فورس ایک دوسرے ڈھنگ سے طاقتور ہوگی، مقامی پولیس بہت کمزور ہو جائے گی، لوگوں کی شکایات الگ ہوں گی۔ اس کے خلاف دلیل یہ دی جاتی ہے کہ اگر انتظام مرکزی کر دیا ہے تو پوری فورس کا معیار بہتر ہوگا، بہت سی فورس رکھنے کے باعث جو بڑے اخراجات ہوتے ہیں ان سے بچا جا سکے گا۔ اور کارکردگی بہتر ہو جائے گی۔

امریکہ میں عرصہ سے یہی نظام چلا آ رہا ہے مگر تینتیس برس پہلے ایک فیصلہ کیا گیا کہ نیویارک کی ریاست میں کسی بھی پولیس فورس میں کسی کو اس وقت تک ملازم نہیں رکھا جائے گا جب تک وہ ایک مقررہ تربیتی کورس مکمل نہیں کر لیتا۔ کیلی فورنیا نے تربیت کے لئے معقول مالی ترغیب دی اور بہت سے بلدیاتی ادارے اس پیش کش سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ دوسری ریاستوں نے بھی اس قسم کے اقدامات کئے ہیں اور وفاقی حکومت بھی کم از کم تربیت کی سطح پر ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے فنڈ دے رہی ہے۔

سڈنی راکر انگلستان اور امریکہ کی پولیس کے حوالے سے کہتا ہے:۔

انگلستان میں بھی پولیس کا انتظام ایک مقامی مسئلہ ہے اور امریکہ میں بھی مگر انگلستان میں مرکزی حکومت کو ایک حد تک اس پولیس پر بھی اختیار ہے جبکہ امریکی وفاقی حکومت کو اس ضمن میں بجز ایف بی آئی کی تفتیش کے اور کوئی اختیار حاصل نہیں۔

انگلستان میں مرکزی حکومت پولیس کیلئے پچاس فیصد فنڈ فراہم کرتی ہے جبکہ امریکی حکومت ایسے کوئی فنڈ فراہم نہیں کرتی صرف تربیت کے لئے اس نے کچھ عرصہ سے فنڈ دینے شروع کئے ہیں۔

سب سے بڑا فرق' طریق تقرری میں ہے۔ امریکہ میں پولیس کی تقرری میئر یا سٹی منیجر کرتا ہے اور وہی اسے ملازمت سے برطرف کرسکتا ہے۔ جبکہ انگلستان میں عدالتوں تک نے فیصلہ دے دیا ہے کہ وہاں مقامی (بلدیاتی) اداروں اور پولیس کے اہل کاروں کے درمیان '' آقا اور نوکر'' والا تعلق نہیں ہے چنانچہ وہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں پوری طرح آزاد ہیں۔ عدالتوں کے اس فیصلے پر وزارت داخلہ نے بھی مہر ثبت کر رکھی ہے۔ فرق یہ ہے کہ امریکہ میں پولیس والے پر بڑا سیاسی دباؤ ہوتا ہے جبکہ انگلستان میں ایسا کوئی دباؤ

نہیں۔

انگلستان میں ہر سطح پر پولیس کی سخت تربیت کا انتظام ہے اور پولیس والوں کو یہ تربیت لینا پڑتی ہے ۔ تمام اداروں میں تیس برس پہلے نصاب اور عملی تربیت کو ایک معیار پر لیا گیا ہے جبکہ امریکہ میں اولاً تربیت کا کام بہت کم تھا' پھر ان میں کوئی ہم آہنگی نہیں' کچھ عرصہ بیشتر تربیت کی طرف توجہ ہوئی ہے جو ابھی ابتدائی مرحلے میں ہے۔

سکاٹ لینڈ یارڈ : انگلستان میں 1878ء میں تفتیش کے لئے سکاٹ لینڈ یارڈ میں ایک شعبہ کھولا گیا تھا۔ اب یہی ادارہ تفتیش کا سب سے بڑا ادارہ ہے اور اس شعبہ سے متعلق سبھی لوگ ایک سی تربیت حاصل کرتے ہیں۔ تفتیش وتلاش میں اس ادارے کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہوگئی ہے اور انگلستان کی پولیس بھی تفتیش اور سراغ رسانی کے لئے سکاٹ لینڈ یارڈ کی خدمات حاصل کرسکتی ہے بلکہ کرتی ہے حالانکہ ان کے اپنے پاس بھی سکاٹ لینڈ یارڈ کے ادارے کے تربیت یافتہ سکواڈ ہوتے ہیں۔

امریکہ میں کسی کی گرفتاری یا برآمدگی کے لئے پولیس کو وارنٹ لینے کے لئے عدالت کو ایک حلف نامہ دینا پڑتا ہے جبکہ انگلستان میں پولیس والا زبانی طور پر مجسٹریٹ کو معاملہ کو نوعیت بتاتا ہے اگر مجسٹریٹ مطمئن ہو تو وارنٹ جاری کر دیتا ہے ورنہ انکار کر دیتا ہے۔

انگلستان میں پولیس سے متعلق معاملات' جرائم اور معاشرتی رجحانات وغیرہ کے بعد تحقیق وتفتیش کا کام وسیع پیمانے پر ہوتا ہے ۔ وہاں ان امور پر خاص توجہ دی جاتی ہے کیونکہ ان حقائق ' کوائف اور تجزیوں کی روشنی میں پولیس کی کارکردگی کو بہت بہتر بنایا جاسکتا ہے جبکہ امریکہ میں اس نوعیت کا کام بہت کم ہوا۔ امریکہ میں پولیس کی مرکزی نوعیت نہ ہونے کے باعث اس قسم کا تحقیقی کام بہت کم ہوتا ہے۔

جرمنی : انسائکلو پیڈیا برٹینیکا کے مطابق جرمنی کی پولیس بھی اپنی موجودہ شکل میں انیسویں صدی کے شروع میں وجود میں آئی۔ اس پولیس کا تعلق مقامی اداروں سے شروع سے رہا تاہم جب نازی حکمران تھے تب پولیس کو بھی مکمل طور پر مرکز کے کنٹرول میں لے لیا گیا۔ پولیس نے فوج کے ایک ماتحت شعبہ کی حیثیت سے ریاستی مقاصد حاصل کرنے کی سعی کی ۔ ان دنوں ان جرمن شہریوں پر پولیس نے بڑی سختی کی جو سیاسی طور پر

ہٹلر اور اس کے نظریہ سے اتفاق نہیں کرتے تھے تاہم دوسری جنگ عظیم کے بعد نقشہ بدلنا شروع ہوا۔اتحادی قوتوں کو ڈر تھا کہ جرمنی میں سابق مسلح یا نیم مسلح اداروں کو دوبارہ اس طرح نہیں جڑنا چاہئے یا ان کا حیاء نہیں ہونا چاہئے تا کہ وہ اتحادیوں اور ان کے ''جمہوری'' کلچر کے لئے خطرہ بن جائیں ۔ جرمنی میں بھی پولیس کو تقریباً اسی طور دوبارہ کھڑا کیا گیا جس طور پر جاپان میں کیا گیا۔ 1949ء میں اتحادیوں کی کونسل نے فیصلہ کیا کہ پولیس سے بلدیاتی اداروں کی سطح پر کام لیا جائے گا' گویا ان کی تنظیم ہی بلدیاتی سطح پر ہوگی۔ کوئی صوبائی یا قومی پولیس نہیں ہوگی تا کہ غاصب یا قابض فوجوں کے لئے خطرہ نہ بن جائے۔ پولیس کو امن عامہ اور تحفظ کا ذمہ دار بنایا گیا ۔ جرائم کا خاتمہ اور مجرموں یا خطا کاروں کو سزا دلانا ہی پولیس کا فرض قرار پایا۔

انتظامی امور میں پیچیدگیوں کے باعث ایک سال بعد تبدیلی ہوئی۔ صوبائی یا علاقائی پولیس بھی کھڑی کر دی گئی۔ مقامی پولیس کے سراغ رسانی اور جرائم کے انسداد کی کارروائیوں میں رابطہ قائم رہنے اور اس سمت بہتر کارکردگی کی خاطر وفاقی کریمینل پولیس بیورو بھی بنادیا گیا۔ پھر ایک نیشنل فرنٹیئر پولیس بنائی گئی جو سب سے بڑا ادارہ ہے۔ ازاں بعد آفات سماوی سیلاب' دنگافساد' کے لئے ایک ایمرجنسی پولیس بنا دی گئی اس کے اہل کاروں کو مشین گنیں بھی دی گئیں۔نیشنل فرنٹیئر پولیس فورس وغیرہ وزیر داخلہ کے ماتحت ہے۔صوبائی حکومتیں پولیس کے بجٹ کی ذمہ دار ہیں جبکہ ان کے لئے اسلحہ وفاقی حکومت فراہم کرتی ہے اور پولیس پر کنٹرول بھی دفاقی حکومت کے ایک افسر کا ہوتا ہے جو بطور انسپکٹر جنرل فرائض انجام دیتا ہے ۔ یوں دونوں طرح سے وفاقی حکومت کا پولیس پر خاصا کنٹرول ہو جاتا ہے ۔ ریکروٹ مقامی پولیس میں بھرتی کئے جاتے ہیں مگر ان کی تربیت مرکزی حکومت کے قائم کردہ تربیتی اداروں میں ہوتی ہے پھر انہیں دو سال تک ایمرجنسی پولیس میں کام کرنا پڑتا ہے۔ جس کے بعد انہیں بلدیاتی پولیس کے حوالے کیا جاتا ہے۔ تاہم صوبے اور بلدیاتی ادارے مرکز کی زیادہ مداخلت نہیں ہونے دیتے اور اپنی حدود اور اختیارات کی حفاظت کرتے ہیں۔

انڈونیشیا : انڈونیشیا میں بھی یورپی سامراج کے آنے سے پہلے پولیس کی کوئی واضح شکل نہیں تھی' شہروں میں آمر حکمرانوں کے سپاہی یا محلے کے چوکیدار اور کھاتے پیتے

لوگوں کے اپنے نجی حفاظتی انتظامات تھے۔ پھر ایک طویل عرصے تک غیر ملکی حکمران رہے' ان کا تصور بھی اپنا تھا اور اس پر عملدر آمد بھی اپنا۔ انڈونیشیا کے لوگوں کو اس پولیس سے شدید نفرت تھی۔ بہر طور آزادی کے بعد انہیں میراث میں یہی پولیس ملی ۔ یوں 1950ء میں انڈونیشیا کی پولیس کے تین حصے تھے۔ ایک مرکزی پولیس جس میں پرانی پولیس کی نفری زیادہ تھی اسی نوعیت کا نظام دوسرے جزائر میں بھی تھا' پھر ایک پولیس نئی جمہوریہ نے قائم کی اور یاک نو آبادیاتی دور کی تنظیم تھی جو اس جزائر کی پولیس فورس پر مشتمل تھی اور اسے کنٹرول کرتی تھی۔

آزادی کے بعد ان سب کو آپس میں مدغم کر دیا گیا۔ یہ فورس دو سطحوں پر کام کرتی ایک پولیس ہیڈ کوارٹر کی سطح پر دوسرا اہم کمانڈرز کی سطح پر ۔ ہیڈ کوارٹر کو مزید چار شعبوں میں تقسیم کیا گیا۔ سربراہ ایک ہے اس کے نیچے اس کے نائب ہیں جو دفتری امور' تعلقات عامہ وغیرہ سے متعلق ہیں۔ ایک ایگزیکٹو برانچ ہے جس کے ذمے ٹریفک' خزانہ' سراغ رسانی ' ریسرچ ' اسلحہ' پولیس ملازمین کی فلاح و بہبود اور باہر کی دنیا خصوصاً انٹرپول سے رابطہ کا کام ہے۔

پولیس کے سربراہ کے تحت کام کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ باوردی پولیس سادہ لباس میں پولیس' سترہ مقامی کمانڈیں' (الشہری کمانڈ' تفریحی مقامات کی کمانڈ' اور سیکٹر کمانڈ۔ جکارتہ کی اپنی میٹرپالیٹن پولیس ہے۔ پھر ٹریننگ کا شعبہ ہے۔ سپاہیوں اور افسروں کے سکول اور کالج ہیں۔ عام قانون نافذ کرنے والی اور ٹریفک پولیس باوردی ہوتی ہے۔ انہیں ضروری سازوسامان فراہم کیا جاتا ہے۔ سمندری پولیس انڈونیشیا کی لازمی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ ایک فضائی پولیس بھی ہے اور یہ سب سلسلے بہت اہم ہیں۔خواتین بھی پولیس میں شامل ہیں اور ان کی کل نفری سوالاکھ کے قریب ہے۔ پولیس میں عہدے اسی طرح کے ہیں جیسے تین مسلح افواج میں ہیں ۔ پولیس کا محکمہ 1973ء میں وزارت دفاع کے ماتحت ہی آ گیا ہے اس کا انچارج بھی وزیر دفاع ہوتا ہے۔

پیدل گشت کرنے والی باوردی پولیس والوں کے پاس ریوالور ہوتا ہے جبکہ سواری والی پولیس کے اہل کاروں کے پاس رائفل یا سب مشین گن ہوتی ہے۔

جاپان:۔ آج ہمارے ملک میں جاپان کے جدید پولیس نظام کا بہت ذکر ہوتا

رہتا ہے۔کم از کم پنجاب کے ایک سابق انسپکٹر جنرل عباس خان نے وفاقی حکومت سے سفارش کی تھی کہ پولیس کو 1861ء کے پولیس ایکٹ سے رہائی دلا کر نئے تقاضوں کے مطابق اس کی تشکیل و ترتیب کریں اور فرائض منصبی اور حسن سلوک میں تبدیلیاں لائی جائیں۔

پولیس کے بارے میں امریکہ کے ایک ماہر سڈنی راکر نے بتایا کہ جاپان میں پولیس کا نظام بادشاہ کے ماتحت تھا اور جس طور مطلق الحکم حاکم یہ محکمے چلاتے ہیں جاپان میں بھی یہ اسی طور چل رہا تھا۔ 1847ء تک صورت یہی تھی کہ محکمہ ہے بھی اور نہیں بھی ۔ تاہم اس وقت تک کچھ درباریوں اور اشرفیہ کے کچھ ارکان کو پولیس وغیرہ کی نگرانی سونپ دی گئی تھی' باقاعدہ پولیس کا شعبہ 1874ء میں قائم ہوا اور اسی سال ٹوکیو کی میٹرو پالیٹن پولیس قائم ہوئی' اس پولیس کا خاکہ فرانسیسی اور جرمن پولیس کی طرز پر تھا۔یعنی مکمل طور پر مرکزی نوعیت کا محکمہ اور اختیارات کو بھی تحکمانہ انداز میں استعمال کیا جاتا تھا گویا اس کا رویہ معاشرے کی خدمت گزار کی بجائے محتسب جیسا تھا۔تاہم اس کی حیثیت باقاعدہ بنا دی گئی اور اسے وزارت داخلہ کے ماتحت کر دیا گیا۔ اس پولیس کے تحت اپنی عدالتیں ہوتی تھیں۔ پولیس خود اپنے ضابطے جاری کرسکتی تھی۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد جاپان پر پہلے اتحادیوں اور پھران میں سے امریکہ کا قبضہ ہوا۔ امریکی جنرل میکارتھرنے جاپان کی پولیس کی نئی سرے سے تنظیم کی' ایک نیا قانون بنایا گیا۔ اس کا فرض یہ بھی ٹھہرا کہ وہ جمہوریت کی محافظ ہو یعنی اس کے مزاج اور اختیارات میں جو آمریت تھی اس کا زہر نکالا گیا' گرفتاری اور تفتیش کرنے کا بے پناہ اختیار تھا اس کو محدود کیا گیا' محکمہ کی مرکزیت ختم کر کے اسے مقامی سطح تک پھیلایا گیا ۔ پولیس کو شہری یا بلدیاتی سطح تک لے جایا گیا۔ پولیس کو ضابطہ حکم جاری کرنے سے روک دیا گیا' صرف ٹریفک کے بارے میں بے ضرر قسم کے حکم جاری کرنے کا اختیار رہنے دیا گیا۔ ہر پولیس فورس کے پبلک سیفٹی کمیشن کے ماتحت کر دیا گیا جس کے تمام کے تمام رکن سویلین ہیں۔ ان میں کوئی ایسا پولیس والا شامل نہیں کیا جاتا جس کی پولیس سے وابستگی ختم ہوئے پانچ سال سے کم عرصہ ہوا ہے۔

جب پولیس فورس کو بلدیات سے وابستہ کر دیا گیا تو تربیت' طریق کار وغیرہ

میں ہم آہنگی نہ رہی اور مقامی وسائل سے اس کے اخراجات پورے کرنے مشکل ہوگئے۔ چنانچہ اس میں 1956ء سے پھر مرکزیت لائی گئی۔کمیشن کو پوری وزارت کا درجہ دے دیا گیا اور اس تبدیلی نظام میں پولیس کی دو تنظیمیں ہوگئیں نیشنل پولیس ایجنسی اور میٹروپالیٹن ڈیپارٹمنٹ آف ٹوکیو۔ یعنی اب ایک نیشنل کمیشن ہے اور دوسرا ٹوکیو کمیشن ہے۔

نیشنل ایجنسی کا کمیشن وزیراعظم مقرر کرتا ہے مگر پارلیمنٹ سے منظوری لینی پڑتی ہے۔ اس کے پانچ رکن ہوتے ہیں چھٹا چیئر مین ہوتا ہے جس کا درجہ وزیر کے برابر ہوتا ہے اور وہ کابینہ سے رابطہ بھی رکھتا ہے' وہ ووٹ ڈالنے کا مجاز نہیں ہوتا۔ٹوکیو والا کمیشن ٹوکیو کا گورنر مقرر کرتا ہے مگر منظوری ٹوکیو کی میٹرو پالیٹین اسمبلی دیتی ہے۔ اس نظام کے بارے میں ہمارے ایک سینئر پولیس افسر عباس خان' سابق آئی جی پنجاب کا کہنا ہے کہ ہمارے ہاں بھی اسی قسم کا نظام رائج کرنے کا وقت آ گیا ہے اور اس کا جواز وہ یہ دیتے ہیں۔

'' جاپان کے برعکس پاکستان کی پولیس آج بھی 1861ء کے پولیس ایکٹ کے تحت کام کرتی ہے آزادی سے پہلے اس کا کنٹرول تاج برطانیہ کے سیکرٹری آف اسٹیٹ کے تحت اور برصغیر میں وائسرائے کے پاس تھا۔ پھر بھی آئی جی' ڈی آئی جی' اور ایس پی کو اپنے محکمے پر کچھ کنٹرول حاصل تھا لیکن اب سیاسی مفادات اور اہداف نے اولیت پالی ہے۔ سارے افسروں ماتحتوں کو سیاسی حکومت والے ہی تبدیلی کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں کے اس سیاسی کنٹرول کے مقابلے میں دنیا بھر کے مہذب ممالک جمہوری کنٹرول اپنائے ہوئے ہیں۔ وہاں قانون ساز اسمبلیاں' آئینی ادارے تشکیل دیتی ہیں جو روز مرہ کی بیرونی مداخلت سے پولیس کا تحفظ کرتے ہیں جبکہ پارلیمنٹ کے احکامات قوانین کی صورت میں پولیس کے راہ نما ہوتے ہیں ۔اس جمہوری کنٹرول کے نتیجے میں پولیس خود بخود سیاسی طور پر غیر جانبدار ہو جاتی ۔

''کنٹرول کے موجودہ نظام کو تبدیل کئے بغیر بیرونی مداخلت کا خاتمہ ممکن نہیں ـــــ تمام مہذب معاشروں نے اپنی پولیس کے لئے اس کا بندوبست کر رکھا ہے ۔ان کی پولیس کو یہ تحفظ حاصل ہے اس کے نتیجے میں ان کے پولیس افسران قانون سے متصادم احکامات مسترد کر دیتے ہیں اور ان پر کوئی آنچ بھی نہیں آتی۔ انکی لاج بھی رہ جاتی ہے اور

قانون کی ساکھ بھی برقرار رہتی ہے۔ یوں ان کی پولیس قانون کی حکمرانی برقرار رکھنے میں کامیاب ہے' نفاذ کی اس قوت سے محروم ہو کر آج ہمارے قوانین محض تصورات بن کر رہ گئے ہیں اور ہماری پولیس مذاق ـــــ ہمارے ہاں دیر تو پہلے ہی ہو چکی اب اندھیر ہو جانے سے پہلے پہلے ہمیں اہتمام کر کے اپنی پولیس کو مؤثر طریقے سے قانون نافذ کرنے کے قابل بنانا پڑے گا۔ اسی سے ہمارا آج کا آرام اور کل کا چین وابستہ ہے۔ اب وقت اس تبدیلی کا متقاضی ہے کہ پولیس کو اس کے اپنے دائرہ کار میں آزاد کر دیا جائے۔

'' برطانوی پولیس کا سربراہ قانون کے تحت اپنے فرائض کی بجا آوری میں ہر طرح کے بیرونی دباؤ اور مداخلت سے مکمل طور پر آزاد ہے۔ اسے حکومت یا انتظامیہ کی طرف سے احکامات موصول نہیں ہوتے نہ ہی ہدایات جاری کی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج برطانوی پولیس اپنی راست بازی اور غیر جانبداری کے لئے عالمگیر شہرت حاصل کر چکی ہے۔

'' جاپان کے پاس بھی ہماری طرح روایات نہ تھیں لہٰذا اس نے یہ اہتمام قانون سازی کے ذریعے کیا۔ اتحادی افواج کے سربراہ میک آرتھر نے ایک پولیس کمیشن قائم کیا جسے ایک جمہوری نظام پولیس تشکیل دینے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ ایک ایسی پولیس جو پیشہ ورانہ طور پر غیر جانبدار ہو آج کی جاپانی پولیس انہی بنیادوں پر استوار ہے۔ اس مقصد کے لئے قانون سازی کے ذریعے نیشنل پبلک سیفٹی کمیشن قائم کیا گیا ہے۔ اس جمہوری کمیشن کو سیاسی طور پر غیر جانبدار رکھنے کا اہتمام اسی طرح کیا گیا ہے کہ اس کمیشن کا کنٹرول کسی سیاسی پارٹی کے پاس نہیں ہوتا نہ ہی کسی کا ایک پارٹی کے ارکان کی تعداد تین سے زیادہ ہو سکتی ہے۔ علم و دانش کے حامل ماہرین تعلیم' قانون و انصاف کا گہرا تجربہ رکھنے والے عدالت عالیہ کے ریٹائرڈ جج صاحبان' ممتاز قانون دانوں' اور اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کے حامل منتظمین کو اہلیت کی بنا پر اس کمیشن کا ممبر بنایا جاتا ہے۔

'' کل کا جاپان آج کا پاکستان سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھا۔ جاپانی کوئی پُر امن قوم نہ تھے۔ وہ بھی معاشرے میں جرائم کی صورت حال سے ہماری ہی طرح پریشان تھے اور پولیس کی کارکردگی کی طرف سے مایوس۔ فرق صرف اتنا ہے کہ انہوں نے اس صورت حال کو بدلنے کا فیصلہ کر کے قدم آگے بڑھا دیا اور آج وہ پوری دنیا سے آگے نکل گئے ہیں۔

دنیا بھر سے قانون نافذ کرنے والے اور فوجداری نظام انصاف کے ادارے جاپانی پولیس کی طرف تحیر، تجسس اور تجربے کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں ۔ امریکہ کے ڈیوڈ بیلے David Bayley جیسے ماہرین نے عرق ریزی کر کے جاپانی پولیس کی کامیابی کا راز کتابوں میں بند کر دیا ہے۔ اور تو اور بھارت کے پولیس کمیشن نے بھی جاپان کے پبلک سیفٹی کمیشن کی طرز پر نیشنل سیکورٹی کمیشن کے قیام کی سفارش کردی ہے کیونکہ جاپانی معاشرہ جرائم سے آزاد اور قانون کا پابند اسی نظام سے بنا ہے۔

''بارہ کروڑ سے زائد آبادی کے ملک میں سال 1993ء میں قتل کے صرف 1233 اور رہزنی کے 2466 واقعات ہوئے۔ قتل کی 94 فی صد اور رہزنی کی 75 فی صد وارداتوں کے ملزموں کا سراغ مل گیا۔ چالان ہوا۔ تقابل کی صورت یہ ہے:

''سال 1993ء میں جاپان کی ایک لاکھ کی آبادی کے پیچھے ایک امریکہ اور برطانیہ میں نوسو قتل ہوئے۔ اسی شرح سے رہزنی کی ایک واردات ہوئی جبکہ آبادی کی اسی شرح پر برطانیہ میں 65 اور امریکہ میں 253 وارداتیں ہوئیں۔''

یہاں جاپان کی پولیس کی مختصر سی تاریخ اور آج اس کی کارکردگی کے حوالے سے مشرق بعید میں ایک اعلیٰ پولیس نظام کی تصویر پیش کرنا مقصود تھا۔ اس کے ساتھ ہی اعداد و شمار جو عباس خان نے ایک رپورٹ میں پیش کئے!

شہر	نیویارک	لندن	ٹوکیو	لاہور
سال	1994	1995	1993	1995
آبادی	ایک کروڑ	ایک کروڑ بیس لاکھ	ایک کروڑ بیس لاکھ	ستر لاکھ
قتل	1995	174	121	450

پولیس ریفارمز صفحہ 12

انٹرپول:۔ جرائم سے متعلق پولیس کی بین الاقوامی تنظیم (انٹرپول) International Criminal Police Orgnisation قائم تو 1914ء میں کی گئی مگر سرکاری طور پر یا باقاعدہ طور پر اس کے وجود میں آنے کا سال 1956ء شمار ہوتا ہے ۔ اس ادارے کے رکن ممالک نے انٹرپول کے پیرس میں واقع مرکزی سیکریٹریٹ سے رابطہ کے لئے اپنا اپنا بیورو بنا رکھا ہے۔ یہ بیورو اپنے ملک سے جرائم کی وہ خبریں سیکرٹریٹ کو بھجواتے

ہیں جن میں دوسرے رکن ممالک کو دلچسپی ہوتی ہے۔ یہ بیورو دوسرے ممالک کی درخواست پر ان مجرموں کے بارے میں تفتیش و تحقیق کرتے ہیں جن کی نامزدگی دوسرے ممالک نے کی ہے۔ اسی طرح اگر دوسرے رکن ممالک کو کوئی مجرم چاہئے جو کسی اور رکن ملک میں آ گیا ہے تو یہ بیورو اس مجرم کو انٹرپول کے ذریعے دوسرے ملک کے حوالے کر دے گا بشرطیکہ ان ممالک کے درمیان ایسا کوئی معاہدہ موجود ہو۔ اسی طرح انٹرپول کے سالانہ اجتماع (اسمبلی) میں منظور کی گئی قرار دادوں پر عملدر آمد ہر رکن ملک کا فرض ہوتا ہے۔ ایک سو ساٹھ ممالک اس تنظیم کے رکن ہیں۔

انٹرنیشنل پولیس ایسوسی ایشن بطور سماجی تنظیم کے 1950ء میں لندن میں قائم کی گئی تھی۔ یہ تنظیم زیادہ تر یورپ میں ہی سرگرم ہے تاہم اس کے رکن دنیا کے دوسرے غیر یورپی ممالک میں بھی ہیں یہ ایسوسی ایشن پولیس والوں کی تربیت کے لئے وظائف بھی دیتی ہے اور سالانہ کانفرنس بھی منعقد کرتی ہے۔

1993ء میں امریکی پولیس چیفیس کی تنظیم نے انٹرپول کو ایک نااہل' اور بدعنوان ادارہ قرار دیا۔ تنظیم کا کہنا ہے کہ انٹرپول کے دس افسروں کو منشیات کے فروغ کے الزام میں سزا ہو چکی ہے جن میں پانامہ کا سابقہ سربراہ مملکت نوریگا بھی شامل ہے جو 1978ء میں انٹرپول کے شعبہ منشیات کا سربراہ تھا۔

امریکی تنظیم کے سربراہ مارٹن کا کہنا ہے کہ انٹرپول کے پاس تحفظ کا مؤثر انتظام نہیں اسی لئے سڑکوں پر منشیات فروشوں سے مقابلے میں انٹرپول کے اپنے ملازمین کی جانیں خطرے میں پڑ جاتی ہیں۔ مارٹن کے ایک اور ساتھی شیا کا کہنا ہے کہ انٹرپول مجرموں کے بارے میں جو نوٹس جاری کرتی ہے ان میں سے 43فی صد غلط ہوتے ہیں۔ اس کا کمپیوٹر کا نظام بڑا ناقص ہے اور کوئی بھی اس کمپیوٹر تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔

فرانس کی مہذب پولیس

فرانس کی مہذب پولیس، پولیس بھی پل چاہ، مسجد تالاب بنایا کرتی تھی، جاسوسی سکندر اعظم سے، 1893ء کی خفیہ رپورٹیں، مجرموں کے خاکے، گیلی مٹی پر ہاتھ اور انگلیوں کے نشانات، پہلی بار تار برقی، ٹیلی فون، موٹر گاڑی اور فوٹو گرافی کا استعمال۔

پولیس کے بارے میں منتظمین اور دانشوروں کے درمیان ایک بنیادی اختلاف صدیوں سے چلا آرہا ہے اور اس میں خود پولیس والے بھی ملوث ہوتے ہیں۔ ایک مکتبہ فکر کا کہنا ہے کہ پولیس کو مقامی امور سے متعلق رہتے ہوئے مقامی طور پر زیر انتظام لانا چاہئے یعنی بلدیاتی اداروں کے ذریعے پولیس کا سارا نظام چلتے رہنا چاہیے۔ جبکہ دوسرے مکتبہ فکر کا کہنا ہے کہ ایک ملک میں پولیس کا کوئی نہ کوئی مرکز تو ضرور ہونا چاہئے جو سارے ملک کی پولیس میں ایک سا معیار لا سکے اور جو ان سب میں مؤثر رابطہ کے طور پر کام کرے۔ اس مکتبہ فکر کا یہ بھی کہنا ہے کہ پولیس بہر طور مجموعی طور پر مرکز کا شعبہ ہونا چاہئے۔ ایک تیسرے دھڑے کا کہنا ہے کہ نہ مرکزی اور نہ مقامی پولیس کو ان دونوں کے درمیان رہنا چاہئے۔ نظریات جو بھی ہوں دراصل دیکھنا یہ ہوت اہے کہ پولیس کو ان دونوں کے درمیان رہنا چاہئے نظریات جو بھی ہوں دراصل دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ پولیس کون سے معاشرتی ڈھانچے میں کام کر رہی ہے مثلاً زرعی پس منظر اور معیشت والے ملک میں پولیس کے فرائض ان پولیس والوں سے مختلف ہوں گے جو صنعتی ملک میں کام کر رہے ہیں۔ اسی طرح چاروں طرف سمندر سے گھرے ملک یا جزائر (انڈنیشیا) کی پولیس کی بناوٹ چاروں طرف سے خشکی سے گھرے ملک (افغانستان) سے بہت مختلف ہوگی۔ پہاڑی علاقوں میں پولیس اور طرح کی ہوگی جبکہ ریگستان کے علاقوں میں اس کی صورت مختلف ہوگی۔ جن ممالک میں یہ چاروں خوبیاں ہیں وہاں کی پولیس کی تنظیم وترکیب مختلف ہوگی اس زمرے میں پاکستان اور ہندوستان دونوں آتے ہیں۔

مرکز سے پولیس کی ساری طنابیں ہاتھ میں لینے کی مثال پرانے فرانس کی ہے۔ یہ پولیس کا سیاسی استعمال تھا اور اسے سیاسی پولیس بھی کہا جاتا ہے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ

فرانس کے بادشاہوں نے اٹھارہویں صدی میں جس طور پر پولیس کو استعمال کیا اس کی وجہ سے فرانس کے شہری انگلستان کے شہریوں کے مقابلے میں زیادہ محفوظ تھے اور پُرامن حالات میں رہتے تھے۔ شاہ لوئی (چودھویں) نے چالیس پولیس انسپکٹر اور متعدد تنخواہ دار ایجنٹ رکھے ہوئے تھے جو بدکار افراد کے بارے میں او ردوسرے امور سے شاہ کو باخبر رکھتے تھے، شاہ نے جواباً یہ طریقہ اختیار کر رکھا تھا کہ خطا کار افراد کے خلاف خواہ ان کے بارے میں ٹھوس گواہی ہو فوری طور پر سخت کارروائی کرتا تھا۔اس نے پولیس کو حکم دیا تھا کہ ایسے لوگوں کو گرفتار کر کے ان کے خلاف مقدمے چلائے جائیں۔ بادشاہ نے مجرم، خطا کار، بدکار اور بدمعاش افراد کو نکیل ڈالنے کے لئے ایک خاص خط یا فرمان جاری کیا تھا کہ مجرموں کو فوری طور پر پکڑ کر ان پر مقدمے چلائے جائیں چنانچہ اس قسم کی کارروائی سے لوگوں کو یہ احساس اور اطمینان ہوا کہ پولیس ان کی مدد کے لئے کہیں آس پاس ہی موجود ہے۔ ایک وقت پیرس کے بارے میں یہ کہا جانے لگا تھا کہ وہاں پہ کم ازکم ایک چوتھائی گھریلو ملازمین اور آوارہ قسم کے لوگ حکومت کے تنخواہ دار مخبر ہیں۔ لوئی پنجم کے پولیس چیف سارتین نے ایک بار بادشاہ کے سامنے بڑے فخر کے ساتھ کہا تھا ''جناب والا، اگر کہیں کسی گلی میں کوئی تین افراد گفتگو کر رہے ہوں تو ان میں سے ایک آدمی میرا ہوگا۔''

پیرس کی پولیس کی تاریخ میں یہ زمانہ بڑا خوشگوار تھا، ان دنوں پولیس لوگوں کی بہبود کے بے شمار کاموں میں حصہ لیتی تھی۔ پولیس والے مارکیٹیں، سڑکیں، گلیاں، سٹاک ایکسچینج، قبرستان بناتے تھے، گلیوں میں رات کے وقت روشنی کرتے تھے، ان دنوں انہوں نے بچوں کے ہسپتال تعمیر کئے۔ سکولوں کی عمارتیں بنائیں۔ وٹرنری کالج بنایا، غریبوں کے لئے گھر بنائے، آگ بجھانے اور لوگوں کے بچاؤ کا بھی کام کرتے۔ بے روزگاروں کے لئے روزگار ڈھونڈنے میں مدد دیتے۔ شہروں کو کھانے پینے کی اشیاء کی فراہمی اور قیمتوں پر نظر رکھتے۔ حفظانِ صحت کے طور پر شراب فروخت کرنے والوں اور شیر فروشوں کو خاص برتن استعمال کرنے سے منع کرتے، دیواروں پر لگنے والے پوسٹر سنسر کرتے اور بچوں کو معاوضہ پر دودھ پلانے والی عورتوں کے معاوضے کے بارے میں بھی کام کرتے ۔ وہ گاڑیوں کے ڈرائیوروں پر بھی نظر رکھتے۔ پروٹیسٹنٹ عقیدہ رکھنے والوں پر مقدمے چلاتے، ڈاک میں ڈالے گئے لوگوں کے خط پڑھ لیتے، لاٹری کے ٹکٹوں پر بھی نظر رکھتے۔

یہ پولیس جیل خانوں کا معائنہ کرتی، مذہبی کتب کو اس نقطۂ نظر سے دیکھتی کہ اس میں کہیں بدعت تو شامل نہیں کر دی گئی۔ اور اس پولیس نے غیر ملکی تجارت کے فروغ کے لئے ایک مالیاتی ادارہ بھی قائم کر رکھا تھا۔

جب فرانس میں انقلاب آیا تو پولیس نے بادشاہ اور سرکار کو بچانے کے لئے کوئی خاص تردد نہیں کیا بلکہ انہوں نے بھی اپنے آپ کو انقلابی حکومت کے ساتھ وابستہ کر لیا۔ 1796ء میں پولیس کی ایک نئی وزارت بنائی گئی تھی اس نے فوراً ہی سیاسی پولیس کی آبیاری کی اور ملک میں بے شمار مخبر ملازم رکھ لئے۔ چنانچہ پولیس کے روایتی فرائض کی سرانجام دہی کے لئے پیرس کی پریفیکچرل پولیس بنانی پڑی۔ اس کے ساتھ ہی فوجداری انصاف کا محکمہ قائم کر دیا گیا اس محکمہ کے انچارج کے بارے میں آج بھی بہت سی حکایات مشہور ہیں کہ وہ کس طور پر بھیس بدل بدل کر کیا کیا کارروائیاں کیا کرتا تھا اور کتنا ظالم تھا۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ وہ ایسا نہ تھا مگر پولیس کو اگر مخصوص مفادات کی خاطر استعمال کیا جائے گا اور اسے عام لوگوں کے تحفظ اور امن کے لئے کام کرنے کا موقع نہیں دیا جائے گا تو پھر لوگوں میں اس کے خلاف نفرت اور غصہ کے علاوہ اور کون سا جذبہ ہوگا؟

سپیشل برانچ پنجاب کے ریسرچ افسر شاہد محمود کے (محافظ جون 1998ء۔ صفحہ 63) مطابق دنیا کے اکثر و بیشتر حکمرانوں نے سول یا فوجی یا دونوں قسم کے جاسوسوں سے بڑے بڑے کام لئے، سکندر اعظم کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ اس نے مخبری اور جاسوسی کے خاص شعبے قائم کر رکھے تھے اور وہ اپنے سپاہیوں تک کی ڈاک کو سنسر کیا کرتا تھا۔

مغلوں کے عظیم حکمران اکبر(1603ء۔1542ء) نے بڑا مضبوط اور مربوط جاسوسی نظام وضع کیا۔ جس سے دوسرے ممالک سے آنے والے سیاح، تاجر وغیرہ بھی متاثر ہوئے۔ ان میں برطانوی باشندہ جان ہاکنز بھی تھا۔ اکبر کے اس محکمہ میں کوئی چار ہزار کے قریب افسر تھے جن کے تحت ملک کے چپے چپے پر جاسوس پھیلے ہوئے تھے۔ جاسوسوں میں زیادہ ہندوؤں کی نچلی ذات کے لوگ ہوتے تھے۔

برطانیہ کا شاہ چارلس دوہم 1685-1630ء خود بہت بڑا جاسوس تھا۔ کہتے ہیں کہ برطانیہ کے حکمرانوں میں اس جیسا دنیا شناس پیدا نہیں ہوا۔ چارلس کو ایک طویل عرصہ

جلاوطنی میں گزارنا پڑا۔ اسی سے اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ کسی پر زیادہ دیر تک اعتماد نہیں کرنا چاہئے اور ہر ایک کی اصل حقیقت سے ہر لحظہ باخبر رہنا چاہئے۔ وہ زیادہ تر جاسوسی اپنے رفیقوں کی کرواتا۔ جب اسے دوبارہ بادشاہت ملی تو اس نے جاسوسی کا نظام اور پکا کر دیا۔ اس کو دو حصوں میں تقسیم کیا، ایک حصہ اپنے ہاتھ میں رکھا جبکہ دوسرے حصے کا انچارج سیکرٹری مورس اور لارڈ ارلنگٹن کو بنایا۔ ارلنگٹن کو لارڈ بھی اس کی اسی کارکردگی کی بنا پر بنایا گیا اور اسے اس کام کے لئے دس ہزار پاؤنڈ بھی دیئے گئے۔ اس نے کوڈ بھی وضع کئے، وہ اپنی داشتاؤں کے ذریعے دربار فرانس کی جاسوسی بھی کرایا کرتا تھا۔

پاکستان کے علاقے میں ایک انگریز سر رچرڈ برٹن (1890ء۔1821ء) نے جاسوس کی حیثیت سے بہت کام کیا۔ یہ وہ شخص ہے جس نے آج کے پاکستان کے علاقے سندھ میں سب سے پہلے انگریز کے لئے راہ ہموار کی۔ وہ برطانوی جاسوسی سروس میں تھا۔ اسے سندھ بھیجا گیا جہاں اس نے زبان سیکھی، اسی طرح کا لباس پہننا شروع کیا، خود کو سندھ ثقافت میں رچا بسا لیا، کراچی (کلاچی) کے علاقے میں تین دوکانیں کھولیں جہاں کپڑا اور تمبا کو سستے داموں فروخت کرتا اور یوں ضروری معلومات بھی حاصل کرتا رہتا۔ اس نے اپنا نام مرزا عبداللہ رکھا ہوا تھا، بھیس بدل لیتا تو خود اس کا اپنا کمانڈر بھی اسے نہیں پہچان سکتا تھا۔ رچرڈ برٹن نے سندھ کے علاوہ افریقہ، ایشیا اور مشرق وسطی کے دوسرے ممالک میں بھی یہ خدمات سرانجام دیں۔

امریکہ میں پہلی پولیس فورس 1823ء میں ٹیکساس کے سرحدی قصبوں کو ریڈ انڈین باشندوں کی یلغار سے محفوظ رکھنے کے لئے بنائی گئی اس کا نام ٹیکساس رینجرز رکھا گیا۔ (محافظ جنوری فروری 1994 صفحہ 90)

پنجاب پولیس کی خفیہ رپورٹوں پر مبنی ابھی تک کوئی اچھی اور فکر انگیز کتاب سامنے نہیں آئی، غالباً بہت سی فائلیں (پاکستان آرکائیوز کے کہنے کے مطابق) ضائع ہوگئی ہیں یا کر دی گئی ہیں۔ باقی کے بارے میں شنید کوئی اچھی نہیں ۔ یہاں یہ بات بتانا بے جا نہ ہوگا کہ سرکاری محکمے ہمیشہ یونیورسٹی کی سطح کی بے ضرر سی تحقیق کو بھی ہضم نہیں کر سکتے۔ پنجاب پولیس کا ایک پرائیوٹ یعنی خفیہ رسالہ ایبسٹریکٹ آف انٹیلی جینس کے نام سے محکمہ کے اندر تقسیم ہوا کرتا تھا۔ 1893ء کے ایک شمارے مارچ 1993ء میں شائع شدہ رپورٹوں پر

مبنی کچھ خبریں ماہنامہ ''محافظ'' کے مارچ 1993ء کے شمارے سے؟

فروری مارچ 1893ء میں نیپال کے وزیر اعظم سر بیر شمشیر جنگ نے انگریز حکومت کی دعوت پر راولپنڈی کا دورہ کیا۔ دورے کا مقصد اٹک کے مقام پر انگریزوں کا تعمیر کردہ ریلوے پل دیکھنا تھا۔ انگریز چاہتے تھے کہ نیپال میں بھی کسی طرح ریلوے پل تعمیر کئے جائیں۔ خفیہ رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ جن دنوں نیپال کے وزیراعظم نے راولپنڈی کا دورہ کیا ان دنوں تین مشکوک افراد نے شہر کے ایک ہوٹل میں قیام کیا تھا۔ ان میں سے ایک کا نام ایم بارن تھا، حکام کا خیال تھا کہ وہ نیپال کے وزیراعظم پر قاتلانہ حملہ کر سکتے ہیں چنانچہ وزیراعظم کے لئے حفاظتی انتظامات سخت کر دیئے گئے۔

انسپکٹر جنرل پولیس پنجاب نے فروری 1893ء میں خفیہ اداروں کو حکم جاری کیا کہ جب وہ مقامی سیاسی مذہبی اور سماجی تنظیموں کے بارے میں اطلاعات بھیجا کریں تو ان میں پوری تفصیلات دی جائیں۔ اس وقت تک اس بات کا لحاظ نہیں رکھا جاتا اور عموماً بڑی مختصر سی اطلاع بھجوادی جاتی ہے انسپکٹر جنرل نے حکم میں اپنی خفگی کا بھی اظہار کیا اور پھر تفصیل بتائی کہ کس کس طرح سے اطلاعات بھجوائی جانی چاہئیں۔

مارچ 1893ء میں حضرت محمدﷺ کے روضہ کے خادم سید عبدالوہاب نے دہلی کا نجی دورہ کیا اس کے ساتھ محمد ابراہیم نامی ایک حبشی بھی تھا۔

اسی زمانے میں حکومت نے ریلوے سٹیشن ماسٹروں کو ہدایات جاری کیں کہ وہ مسافروں کے بارے میں تفصیلی رپورٹ دیا کریں کہ کون کون مسافران کے شہر سے گیا، کہاں گیا اور کون کون آیا، خصوصاً اہم افراد کے بارے میں یہ معلومات دی جائیں۔ اس کے علاوہ مشکوک افراد کے بارے میں خبر دی جائے خصوصاً ان لوگون کی جن کا تعلق صوبہ سرحد یا افغانستان سے نظر آئے۔

انجمن حمایت اسلام لاہور کے نویں یوم تاسیس پر 25 سے 28 فروری تک تقریبات کی گئیں۔ پٹنہ سے مولوی علی حسن، دہلی سے (ڈپٹی) مولوی نذیر احمد (سابقہ ڈپٹی کلکٹر) بھیرہ سے حکم نورالدین اور دیگر مقررین نے خطاب کیا۔ سرسید کو خراج عقیدت پیش کیا۔ ڈپٹی نذیر احمد نے مغربی تہذیب کے مضر اثرات پر بات کی سید علی حسن نے کہا کہ لیور پول (برطانیہ) میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان کشیدگی پائی جاتی ہے اس لئے وہ

عنقریب وہاں کا دورہ کریں گے۔

فروری اور مارچ (1893ء) میں صوبہ پنجاب میں مندرجہ ذیل تنظیمیں سرگرم رہیں۔ آریا سماج امرتسر، سناتن دھرم سماج جھنگ، انجمن حمایت اسلام لاہور، سنگھ سبھا اور آریا سماج کا ایک اجلاس منٹگمری میں ہوا۔ مقصد یہ تھا کہ ایک شخص موہن نے دین اسلام قبول کرلیا ہے اسے دوبارہ ہندو مذہب میں شامل کیا جائے۔ تقریباً تین سو افراد نے شرکت کی۔

عیسوی عہد سے قبل مصر میں ایک مجرم کا تحریری خاکہ تیار کیا جاتا تھا آج کل بھی مجرم کے ریکارڈ یا گرفتاری یا مشینری کے لئے یہ طریقہ استعمال کیا جاتا ہے اسے خاکہ نویسی کہتے ہیں یعنی مجرم کی شکل کی رف سی ڈرائنگ۔

عراق میں ماقبل مسیح قیدیوں یا مجرموں کی انگلیوں کے نشانات گیلی مٹی پر لے کر خشک کر لئے جاتے اور جب ان کی شناخت کی ضرورت ہوتی یہ مٹی فنگر پرنٹ کام آتے۔ چین میں بھی زمانہ قدیم میں مجرموں کی شناخت کے لئے انگلیوں کے نشانات کا استعمال ہوتا تھا۔ تاہم بہت بعد میں (539ء میں) روم میں انگلیوں کے نشان کے ذریعے شناخت کے طریقے کو سرکاری اور تحریری طور پر تسلیم کرلیا گیا۔ تاریخ کے انتہائی قدیم ادوار میں مجرموں کی شناخت کے لئے ان کو داغ دیا جاتا یا ان کے جسم کے کسی حصے کو مسخ کر دیا جاتا تھا۔ برصغیر میں سرکاری جانوروں کو بھی داغ دیا جاتا تھا اور ان پر نمبر لکھ دیئے جاتے تھے۔

پرانے زمانے میں جرم تسلیم کروانے کے لئے اور بھی طریقے اختیار کئے جاتے تھے جن میں سے بعض نفسیاتی اور بعض روحانی قسم کے ہوتے تاہم یہ بہت سخت طریقے ہوتے تھے۔ لاہور میں ایک صوفی کا مزار اب تک موجود ہے ان کا نام موسیٰ آہن گر ہے۔ آہن گری کا کام کرتے تھے، روحانیت سے شغف تھا، کام کرانے کے لئے مرد و زن آتے رہتے۔ ایک غیر مسلم نوجوان خاتون بھی چرخے کے تکلے سیدھے کرانے کے لئے آئی۔ شاید کچھ انتظار کرنا پڑا یا کچھ اور بات ہوئی، علاقے کے غیر مسلم اور مسلم لوگوں نے بھی شور ڈال دیا کہ موسیٰ آہن گر نے اس نوجوان عورت پر بری نظر ڈالی ہے۔ ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ موسیٰ آہن گر نے صحت جرم سے انکار کیا۔ معاملہ یہاں پہ طے ہوا کہ موسیٰ آہن گر اپنی

آنکھوں میں یہی انتہائی گرم بلکہ سرخ ہوتے ہوئے لوہے کے تکلے پھیرلیں اگر آنکھیں سلامت رہیں تو ہم موسیٰ کو بے گناہ سمجھیں گے اور اگر آنکھیں جل کر بہہ گئیں تو وہ مجرم...... سو تاریخ کے پرانے ادوار میں دنیا بھر میں اس قسم کے مقدمے بھی چلے، یونان میں بھی، عربوں میں بھی، ایشیا اور افریقہ میں بھی، یعنی تفتیش کی ایک یہ صورت بھی طویل عرصہ تک رہی ہے اور برصغیر کے دور افتادہ یہی علاقوں میں آج تک اس قسم کے طریقے اپنے طور پر (قبائلی سطح یا برادری کے اندر) آزمائے جاتے ہیں، بہرطور دنیا کی بہت سی لوک کہانیوں میں ایسے مقدمات چلائے گئے ہیں۔

انیسویں صدی تک پولیس کا ایک دوسرے کو باخبر کرنے کا ذریعہ سیٹی بجانا، فرش پر لٹھ سے آواز پیدا کرنا یا روشنی کو جلتی بجھتی کیفیت میں لانا تھا۔ 1849ء میں پہلی بار اسکاٹ لینڈ یارڈ اور لندن کے ضلعی پولیس آفس کو ٹیلی گراف لائن سے جوڑ دیا گیا۔ اس کے بعد دوسرے شہروں کے درمیان بھی تار کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ پھر اہم مقامات پر باکس رکھ دیئے گئے تاکہ جب بھی گشت کرنے والے پولیس اہل کار کو دوسرے سٹیشن یا ہیڈ کوارٹر سے رابطے کی ضرورت محسوس ہو وہ تار کے ذریعے رابطہ قائم کر لے۔

ٹیلی فون پہلی بار 1878ء میں واشنگٹن کے پولیس سٹیشن میں نصب کیا گیا تھا، دو برس بعد ہی شکاگو پولیس نے گشت کے راستوں پر ٹیلی فون باکس لگا دیئے تاکہ ان سب کا آپس میں ٹیلی فون پر رابطہ رہے۔

پولیس کو پہلی بار موٹر 1899ء میں استعمال کرنے کا موقع امریکہ کی ریاست اوہیو کے شہر اکرون میں ملا۔ اس کے بعد بیسویں صدی میں موٹر ہی پولیس کی نقل وحمل کا ذریعہ بنی اس نے مجموعی طور پر گھوڑے، اونٹ اور اسی طرح کے لادو جانوروں کی جگہ لے لی۔ درمیان میں سائیکل اور موٹر سائیکل بھی پولیس کے زیر استعمال رہے۔ ٹیلی فوٹوگرافی کا آغاز 1908ء میں ہو جب ایک مجرم کی تصویر پیرس سے لندن بھیجی گئی اور اس طرح یہ مجرم پکڑا گیا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد یہ طریقہ عام ہو گیا۔ تاہم پولیس کی نقل وحمل اور باہمی رابطہ کا موثر ترین ذریعہ ٹرانسسٹر تھا۔

جرائم سے متعلق اولین لیبارٹریز یورپ اور امریکہ میں قائم کی گئیں ابتدائی لیبارٹریوں میں فرانس میں لیون کی لیبارٹری ہے۔

پولیس سے معاشرہ کی توقعات

پنجاب کے ایک سابق انسپکٹر جنرل پولیس چودھری محمد امین نے لوگوں کا ٹیلی فون پر سوال کرنے کا کھیل رچایا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ایک اخبار نے ''ٹیلی فونی روبرو'' کے سلسلہ میں انسپکٹر جنرل کو عوام کے سامنے پیش کر دیا۔ لوگوں نے کیا کچھ سوال کیئے؟ تفصیل تو معلوم نہیں مگر اخبار نے جو کچھ دیا ہے اس میں سے کچھ سوالوں کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔ اور وہ بھی ایک خاص مقصد کے لئے اخبار (روزنامہ جنگ ۲۵ فروری ۱۹۹۷ء) نے جو خلاصہ دیا ہے وہ یہ ہے۔ ''زیادہ تر لوگوں نے پولیس تشدد، کرپشن، ڈبل سواری پر پابندی، جعلی پولیس مقابلوں، ایف آئی آر درج نہ ہونے، قبضہ گروپ اور ٹریفک پولیس کی شکایات پر مبنی سوالات کیئے۔''

اب سوال:۔

☆ ایک شہری ایرک مسیح نے کیا کہ شیخوپورہ پولیس نے اس کے سات لاکھ روپے ہضم کر لئے ہیں رقم لوٹانے میں ٹال مٹول سے کام لیا جا رہا ہے۔

☆ اچھرہ سے چودھری محرم علی نے اپنے مقدمہ کی تفتیش کسی ایماندار افسر سے کرانے کے لئے کہا۔

☆ لاہور سے مشتاق احمد نے کہا کہ وہ (آئی جی) بھیس بدل کر تھانوں کا دورہ کریں اور خود اپنی آنکھوں سے تھانوں کی حالت دیکھیں۔

☆ لاہور سے طارق محمود نے کہا کہ شیخوپورہ کے گاؤں میں دیوار کی تعمیر کے تنازعہ پر اس کے ملازم امانت علی کی بیٹی کو قتل کر دیا گیا ہے۔ پولیس نے رپورٹ درج نہیں کی۔

☆ میجر قادر نے کہا کہ تھانہ باہلک میں مقیم ان کے بھائیوں کے گھر ڈاکہ پڑا، فائرنگ ہوئی مگر طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود ملزم نہیں پکڑے جا سکے۔

☆ گوجرانوالہ کے یونس نے کہا اس کی موٹر سائیکل گم (چوری) ہوئی، انسداد رشوت ستانی کے صوبائی مشیر غلام عباس کے کہنے پر رپورٹ درج کی گئی۔ مگر پانچ ماہ میں کارروائی کوئی نہیں ہوئی۔

☆ شیخوپورہ کے امین نے تھانوں کی حالت پر کڑی نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا کہ شرفا تھانے جانے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ تھانے میں کم از کم بی۔ اے پاس محرر مقرر کئے جائیں۔

☆ پرویز خان نے تجویز دی کہ فوج کے کمشنڈ افسر پولیس میں لے لئے جاتے ہیں اسی طرح جونیئر کمشنڈ افسر صوبیدار نائب صوبیدار بھی پولیس میں لئے جائیں۔

☆ پولیس کی کارکردگی بہتر بنانے کے لئے محلّہ کمیٹیاں بنائی جائیں۔

☆ اللہ رکھا نے کہا کہ موٹر سائیکل پر ڈبل سواری (ان دنوں یہ پابندی تھی) کا کیس پکڑ کر پولیس والے سو ڈیڑھ سو روپے رشوت لے کر چھوڑ دیتے ہیں۔

☆ کسی نے کہا اس کے بیٹے کی موٹر سائیکل کی رجسٹریشن بک گم ہوگئی ہے، اکبری منڈی تھانے والے ایف آئی آر لکھنے کے لیے دو سو روپے رشوت مانگتے ہیں۔

☆ محبوب بٹ نے دھرم پورہ (لاہور) سے فحاشی کا اڈہ ختم کرنے کا مطالبہ کیا۔

☆ شہناز بیگم نے کہا کہ پولیس نے فیصل ٹاؤن میں اس کے فلیٹ نمبر 247 پر گزشتہ چودہ سال سے قبضہ کر رکھا ہے، نہ کرایہ دیتے ہیں، نہ خالی کرتے ہیں۔

☆ گارڈن ٹاؤن لاہور سے ڈاکٹر حاکم علی نے تجویز دی کہ ہر تھانے میں شکایات کا ڈبہ رکھ دیا جائے تاکہ لوگ اپنی شکایات اس ڈبے میں ڈال دیں۔

☆ چونگی امرسدھو سے پاشا نے کہا کہ ان کے محلے میں منی سینما گھروں میں ننگی فلمیں دکھانے کا کاروبار عروج پر ہے۔ کوئی روک ٹوک نہیں۔ تھانہ فیکٹری ایریا کی سرپرستی میں منشیات کا کھلے عام کاروبار ہو رہا ہے۔

☆ سلمان نے کہا کہ چوک یتیم خانہ میں ایک بس بے قابو ہوئی پہلے ٹانگے کو ٹکر ماری، کوچوان کو زخمی کیا، پھر ان کی کار کو شدید نقصان پہنچایا مگر وہ موقع پر موجود پولیس والوں کو پچاس روپے رشوت دے کر نکل گیا۔

☆ پولیس کے چوہنگ ٹریننگ سنٹر میں زیر تربیت پولیس کے سپاہی نے کہا کہ

تربیت دینے والے بڑی بدتمیزی کرتے ہیں، اور پی ٹی کرانے کے لیے حوالداروں کو رشوت بھی دینی پڑتی ہے۔

☆ ننکانہ صاحب کے محمد اسلم نے کہا کہ تھانہ بڑا گھر میں اس کے دو بھائی قتل ہو گئے۔ سات نامزد ملزموں میں سے صرف پانچ پکڑے گئے۔ باقی دو سرعام پھرتے ہیں مگر پولیس والے انہیں دانستہ چھوٹ دے رہے ہیں۔ یہ دونوں ملزم ویسے بھی اشتہاری ہیں۔

☆ راوی روڈ کے شوکت علی نے کہا کہ قبضہ گروپ والوں نے اس کے مکان پر جعلی ڈگری حاصل کی اور قبضہ کرنا چاہا۔ پولیس نے جعل سازوں کی بجائے شوکت ہی کے خلاف کارروائی شروع کر دی۔

☆ لاہور چھاؤنی سے عبدالحمید نے کہا کہ گڑھی شاہو پولیس نے اسے دو دن حبس بے جا میں رکھا، تشدد کیا، ناجائز ریوالور اور فحش تصاویر کی برآمدگی کا مقدمہ ڈال دیا۔

☆ خلیل نے کہا کہ نارووال شکر گڑھ روڈ پر چلنے والی بسوں کے مالکوں اور ڈرائیوروں سے پولیس والے جگا ٹیکس وصول کرتے ہیں۔

☆ شبیر بھٹی نے جڑانوالہ سے شکایت کی کہ سرگودھا سے ایک سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس تبدیل ہو کر لاہور چلا گیا ہے جبکہ اس کا بھائی لوگوں سے زبردستی پیسے لے رہا ہے۔

☆ سعید نے کہا کہ گاڑیوں کا رجسٹریشن نمبر ایک طرز سے نہیں لکھا ہوتا۔ بعض اوقات پڑھا بھی نہیں جاتا۔

☆ ایک سوال پر آئی جی کی طرف سے بتایا گیا کہ جس مجرم کو دو مرتبہ عدالت سے سزا مل جائے اسے ریکارڈ یافتہ مجرم کہتے ہیں اور اس کی تصویر اور کوائف متعلقہ پولیس تھانے میں موجود ہوتے ہیں۔

☆ فاروق نے کہا کہ لاہور ریلوے سٹیشن کے باہر بسوں اور ویگنوں کے ناجائز اڈے ہیں، جو پولیس کی رضا مندی سے بنے ہوئے ہیں جہاں سے نو لکھا پولیس والے بیس ہزار روپیہ ماہانہ وصول کرتے ہیں۔

☆ پولیس میں بھرتی کے بارے میں آئی جی نے بتایا کہ شہید ہونے والے پولیس ملاز مین کے بچوں یا عزیزوں کو فوراً پولیس میں بھرتی کر لیا جاتا ہے۔

فرداً فرداً ان سوالات کی جو صورت بنتی ہے اور ان کے حوالے سے جو ذمہ داریاں پولیس والوں کی عملاً ہیں اور جن کی ان سے توقع کی جاتی ہے ان کے بارے میں تبصرہ، اور تفصیل بعد میں پہلے ایک سابق انسپکٹر جنرل پولیس پنجاب عباس خان 1996ء کی ایک رپورٹ میں سے بھرتی کے انداز واطوار کے بارے میں اقتباس۔

''عوام الناس آج قانون کی حکمرانی کے موجودہ معیار سے غیر مطمئن ہیں۔ قانون کی قوت نافذہ، پولیس کی ناقص کارکردگی، جبر وتشدد، رشوت اور غیر معیاری پیشہ ورانہ مہارت کی وجہ سے (پولیس) سخت تنقید کی زد میں ہے۔ دوسری طرف پولیس کو بھی شکایت ہے کہ اسے کام کرنے کے لیے آزاد، بے لاگ، اور غیر جانبدارانہ ماحول میسر نہیں آرہا۔ بااثر لوگوں کی طرف سے اپنے مخالفین کو دبانے کے لئے اسے بطور ہتھیار استعمال کیا جاتا ہے۔ ایسے افراد کی قانون سے متصادم خواہشات کی تکمیل کے لئے گنجائش نہ نکالنے والے پولیس افسروں کو اپنے اس انکار کی سزا تبادلہ، معطلی یا پھر محکمانہ کارروائی کی صورت میں بھگتنا پڑتی ہے۔ انہیں اپنی تقرری کی معیاد کا تحفظ حاصل ہے نہ او ایس ڈی بنائے جانے سے بچنے کی کوئی سبیل میسر......گویا عوام کا پولیس پر سے اعتماد اٹھ گیا ہے اور پولیس اپنے پیشہ ورانہ معاملات میں بے جا مداخلت کرنے والوں سے بدگمان ہے۔ ان اندھیروں میں کچھ لوگوں کو انگریزوں کے بنائے ہوئے اس نظام پولیس میں امید کی کرن نظر آتی ہے جو ہماری آزادی سے پہلے 1947ء تک نہایت مؤثر انداز میں روبہ عمل تھا اور وہ حیران ہیں کہ 1861ء کے پولیس ایکٹ اور 1934ء کے پولیس رولز کی بنیاد پر اس نظام کو اس کی حقیقی روح او راصل شکل وصورت کے ساتھ دوبارہ جاری کیوں نہیں کیا جا تاہے۔ اس معصوم خواہش کا خلوص اپنی جگہ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ تجویز آج کے مسائل کا حل پیش کرنے سے یکسر قاصر ہے......

''آزادی سے پہلے کے فوجداری نظام عدل میں پولیس مکمل طور پر انتظامیہ کے ماتحت تھی۔ نو آبادتی حکمرانوں کے عزائم واضح اور مقاصد متعین تھے۔ رعایا کو انصاف کی فراہمی ان کے حکومتی مقاصد اور فرائض میں شامل تو تھی مگر برطانوی راج کے مفادات کے

تابع ۔عمومی معاملات میں حکمرانوں اورفراہمی انصاف کے اداروں میں مکمل ہم آہنگی تھی لہٰذا انصاف اور امن و امان نے ایک قابل قدر معیار برقرار رکھا۔ اس وقت انتخابی سیاست تھی نہ حلقہ ہائے نیابت اور نہ ہی دیگرقسم کے پریشر گروپ موجود تھے جو مداخلت کرتے لہٰذا ڈپٹی کمشنر اورسپرنٹنڈنٹ برطانوی راج کے نمائندہ ہونے کے ناطے ریاستی مفادات کے تحفظ کے لئے قانون کے نفاذ کو باآسانی یقینی بنا لیتے تھے۔

''آزادی کے نتیجے میں اقتداراعلیٰ بادشاہ اور پارلیمنٹ سے پاکستان کے شہریوں کومنتقل ہوا (جمہوریت کا نفاذ جوآزادی سے پہلے تقریباً شروع ہو چکا تھا) یوں فوجداری نظام انصاف کے ادارے سیاسی کنٹرول سے چلے گئے۔ سیاسی نظام میں اراکین اسمبلی کو اپنے وزیروں کا خیال رکھنا ہوتا ہے لہٰذا مداخلت اور دباؤ کا راستہ کھل جاتا ہے۔ ہم نے سیاسی عمل شروع کر لیا مگر اس کے اثرات کو جذب کرنے کے لئے فوجداری نظام انصاف کے اداروں کوتحفظ وتوازن فراہم نہ کیا......اس بے جا مداخلت کے نتیجے میں پولیس کے اندر اختیارات کے ناجائز استعمال کے رجحان میں بھی اضافہ ہوا اور پولیس کی کارکردگی، غیر جانبداری، اور ساکھ بھی مجروح ہوکر رہ گئی۔ جیسا کہ درج زیل مثالوں سے واضح ہے۔

''ایک فورس ہونے کے ناطے مقررہ معیار کے مطابق میرٹ پر بھرتی کا پولیس کی کارکردگی اور ڈسپلن سے گہرا تعلق ہے۔قواعد وضوابط کے مطابق پولیس کانسٹیبل کی بھرتی ایس پی ضلع کو کرنا ہوتی ہے مگر اب ایس پی کو اس کی اجازت کم کم ہی نصیب ہوتی ہے۔ ماضی قریب (رپورٹ 1996ء کے وسط میں لکھی گئی۔ مولف) میں بااثر شخصیات کو کانسٹیبلوں کی بھرتی کا کوٹہ تک دیا جاتا رہا۔تعلیم اور جسمانی اعتبار سے مطلوبہ معیار سے کہیں کم تر اہلیت کے حامل یہ افراد اس عنایت کی وجہ سے محکمہ کی بجائے ہمیشہ اپنے محسنوں کے ہی وفادار رہتے ہیں۔ ان افراد کے دل اپنے فرائض کی بجائے با اثر افراد کی خوش آمد اور خدمت پر ہی دھڑکتے ہیں۔ ان با اثر افراد کی چھتری کی پناہ میں آکر وہ محکمانہ احتساب سے آزاد ہو گئے ہیں۔ یوں ترجیحات کی تبدیلی اور مقررہ معیار سے انحراف سے پولیس کی کارکردگی کافی حدتک متاثر ہوئی ہے۔

''پولیس رولز 12.1 کے مطابق اسسٹنٹ سب انسپکٹر کی بھرتی ایک سلیکشن بورڈ کی سفارش پر ہوتی ہے جس کی صدارت ڈپٹی انسپکٹر جنرل کرتا ہے ۔ اس کام میں جب کمیشن کو

منتقل کر دیا۔ صوبہ پنجاب میں بھی ایسا کرنا اور اس مقصد کے لئے متعلقہ پولیس رولز میں ترمیم کرائی گئی مگر اب یہ ترمیم بھی منسوخ کی جاچکی ہے۔

نگران دور کے چند ماہ چھوڑ کر (نگران معین قریشی کی حکومت جس نے اکتوبر 1993ء کے انتخابات کرائے) پہلے کئی سالوں میں اسسٹنٹ سب انسپکٹر جنرل صاحبان (ماتحتان اعلیٰ) کی سو فی صد بھرتی میرٹ سے ہٹ کر کی گئی ہے۔ صرف ایک صوبہ میں میرٹ کونظر انداز اور قواعد وضوابط کو نرم کر کے 836 اسسٹنٹ سب انسپکٹر اور 53 انسپکٹر بھرتی کئے گئے۔ جن میں سے کچھ کی عمر مقررہ حد سے دس سے پندرہ سال زیادہ تھی۔ کئی ایک کم از کم تعلیمی معیار کے بھی حامل نہ تھے اور چند ایک کے قد مطلوبہ معیار سے تین انچ تک کم تھے۔ بعض ایسے بھی تھے جو مجرمانہ ریکارڈ رکھتے تھے۔ ان سب کی بھرتی کے احکامات صوبہ کے انتظامی سربراہ کی طرف سے جاری کئے گئے۔ اس انداز سے پولیس میں شامل ہونے والے ان تھانہ داروں کی کارکردگی کے بارے میں اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ جب پولیس میں بھرتی کو محض روزگار کے حصول کا ذریعہ سمجھ لیا جائے تو پولیس کا یہی حال ہوتا ہے جو آج سب پر عیاں ہے۔ اور تو اور بعض انتہا پسند فرقہ وارانہ تنظیموں نے اپنے حامی اراکین کی مدد سے محکمہ پولیس کی صفوں ایسے تربیت یافتہ کارکن گھسیڑ دیئے جن میں سے بعض نہ صرف بھرتی کے بعد اپنی مخالف تنظیموں کے نمایاں افراد کے قتل کے مرتکب ہوئے بلکہ اپنی تنظیموں کو مالی وسائل مہیا کرنے کے لئے جا بجا بینکوں اور دیگر مالیاتی اداروں کو ڈکیتی کا نشانہ بناتے بھی دیکھے گئے۔

''سفارش پر بھرتی ہونے والے اسسٹنٹ انسپکٹر پولیس افسران کے ایک گروپ نے ٹریننگ کالج میں تربیت کی سختی اور امتحانات کے انعقاد کے خلاف اپنی انتہائی ناپسندیدگی کے اظہار میں ڈسپلن کے تمام تقاضے بالائے طارق رکھتے ہوئے شدید ردعمل کا اظہار کیا۔ وہ افسران جنہیں امن و امان قائم رکھنے اور قانون ہاتھ میں لینے والوں کو پکڑنے کا فریضہ سرانجام دینے کی خوش فہمی میں بھرتی کیا گیا تھا، ڈسپلن، ضابطے اور قانون کی دھجیاں بکھیرتے ہوئے سہالہ ٹریننگ کالج سے بسوں پر سوار ہو کر جلوس کی شکل میں لاہور پہنچے اور وزیر اعلیٰ کے دفتر کے سامنے مظاہرہ کرنے لگے۔ حکومت پنجاب کو یاد دلایا کہ بھرتی کرتے وقت ان سے تربیتی امتحان نہ لینے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ چنانچہ یہ وعدہ وفا ہو کر رہا۔ بغیر امتحان

دیئے کامیابی کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنے والے ان افسران کے ہاتھوں آج عوام اور قانون جس امتحان سے گزر رہے ہیں وہ اسی پالیسی کا نتیجہ ہے جس نے شاید چند لوگوں کو انفرادی سطح پر کوئی فائدہ پہنچایا ہو مگر اب معاشرے کے اجتماعی مفاد پر تازیانہ بن کر برس رہی ہے۔

کوٹہ پر بھرتی ہونے والے ایک اسسٹنٹ سب انسپکٹر کو امتحان پاس نہ کرنے کی وجہ سے محکمہ سے فارغ کر دیا گیا۔ اس نے نئے احکامات جاری کروا کے خود کو دوبارہ بھرتی کروا لیا اور بالائے ستم یہ کہ اب کی بار تقرری بطور انسپکٹر پولیس۔ اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اسے بنیادی تربیتی کورس سے بھی مستثنٰی قرار دیا گیا۔ اس مقام بلند پر فائز ہونے والا یہ انسپکٹر مزید عنایات سے مستفیض ہوتے ہوئے لاہور کے ایک اہم ترین تھانہ میں ایس ایچ او کے طور پر تعینات ہو گیا۔ یہ انتخاب تو کسی اور کا تھا مگر اس کی سزا حکومت محکمہ اور عوام کو یوں ملی کہ اس حضرت نے عدم صلاحیت ناتجربہ کاری، اور کام سے ناواقفیت کی بنا پر افواج پاکستان کے افسران کے ساتھ مسئلہ بنا کر پولیس کو افواج پاکستان کے مقابلے میں لا کھڑا کیا۔

''ایک ٹریفک سارجنٹ نے ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی پر با اثر شخصیت کے خلاف قانونی کارروائی کی تو صوبہ کے انسپکٹر جنرل کو تبدیل کر دیا گیا حالانکہ وہ اس وقت ایک سو چالیس میل دور سرکاری دورے پر تھے۔ اسی پاداش میں ایس پی ٹریفک کو دو سال تک او ایس ڈی رہنا پڑا اور ٹریفک سارجنٹ کو جیل جانا پڑا...... ضلع سرگودھا کے ایک با اثر فرد نے مقامی ایس ایچ او کے تبادلے کا مطالبہ منوانے کے لئے اپنے حامیوں کی قیادت کرتے ہوئے باقاعدہ طور پر تھانے کا گھیراؤ کر لیا۔ ایک دوسرے ضلعے سے اپنی مرضی کے تھانیدار کو بلوا کر ایس ایچ او کی کرسی پر بٹھا لینے کے بعد اس کی تسلی ہوئی اور وہ موقع سے ہٹنے پر آمادہ ہوا۔ ضلع گوجرانوالہ میں ایک بااثر شخص نے منشیات فروشوں کی رہائی کے لئے مسلح ہو کر تھانہ پر حملہ کیا اور مجرمان کو چھڑا کر لے گیا اور ہر قسم کی قانونی گرفت سے محفوظ رہا۔ اسی طرح گلبرگ لاہور میں ایک بااثر شخص کو شراب میں مدہوش پا کر گرفتار کرنے پر ڈی ایس پی کو معطل کر دیا گیا۔''

پنجاب کے سابق انسپکٹر جنرل عباس خان آخر میں ایک بار پھر برطانوی دور حکومت کو یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ ''نو آبادتی دور میں پولیس تاج برطانیہ کے کنٹرول

میں تھی، ریاستی کنٹرول سیکرٹری آف سٹیٹ کے پاس اور انتظامی کنٹرول وائسرائے ہند کے پاس تھا۔ آزادی کے بعد یہ دونوں کنٹرول سیاسی عمل کے ذریعے جمہوری کنٹرول میں بدل گئے۔ سیاسی مفادات اور اہداف نے اولیت پائی اور ہر چیز ان مفادات کے تابع ہوگئی۔ آج انسپکٹر جنرل آف پولیس کی قیادت اور راہ نمائی سرکتے سرکتے مکمل طور پر پس منظر میں جا چکی ہے۔''

تاج برطانیہ......سیاسی عمل دخل اور تقرریاں......عباس خان نے جو کچھ کہا وہ اپنی جگہ پر سچ بھی ہے اور جھوٹ بھی...... سچ یہ ہے کہ ہم پر گزر رہی ہے اور جھوٹ یہ کہ ہم نے فرض کر لیا ہے کہ ماضی میں کارکردگی سے لے کر بھرتی تک بڑی ہی آئیڈیل صورت احوال تھی۔ ایسا نہیں ہے یہاں پولیس کو شروع دن سے جو افرادی قوت انگریز نے اپنے آنے کے بعد دی ہے اس پر بھی قیاس کرنا نہ صرف ضروری ہے بلکہ خرابیوں کی جڑیں ان پنجاب چیفس (رؤسائے پنجاب) یا پاکستان کے پورے علاقے کے رؤسا کے گھرانوں میں ڈھونڈنی چاہئیں جنہوں نے اپنے جگر کے ٹکڑوں کو انگریز کی پولیس میں بھرتی کروایا۔ بعض اوقات نام نہ گنوانے سے مقدمہ میں زور پیدا نہیں ہوتا مثلاً جب ایک ایم پی اے جلال الدین ڈھکو کی گاڑی کا چالان کیا گیا تب پنجاب میں شریف وزیر اعلیٰ غلام حیدر وائیں اور ان کے ساتھی میاں شہباز شریف اور چودھری پرویز الٰہی اور سردار ذوالفقار کھوسہ تھے۔ منظور وٹو سپیکر تھے۔ مرکز میں نواز شریف وزیر اعظم تھے اور پولیس کے انچارج یعنی وزارت داخلہ چودھری شجاعت حسین کے پاس تھی۔ مگر ہوا یہ کہ ساری کی ساری اسمبلی اپنے رکن کو خود سزا دینے کی بجائے آگ بگولا ہوگئی، انسپکٹر مارا گیا، ایس پی کھڈے لائن لگا اور آئی جی بے چارہ تبدیل ہوگیا۔ افسوس آئی جی کے بھی پاؤں نہ تھے وگرنہ اسی پنجاب اسمبلی نے اپنی طرف سے ایک ایس پی میجر مبشر اللہ کو کسی تاجر کے بیٹے کے قتل کے الزام میں معطل یا تبدیل کر دیا تھا۔ یہ اسمبلی کا حق نہیں کہ وہ انسپکٹروں اور ایس پی صاحبان کو معطل یا برطرف کرتی پھرے۔ مبشر ہائی کورٹ میں پہنچا اور اسمبلی کے اس اختیار کو چیلنج کر کے کم از کم تبادلہ رکوا لیا۔

ناموں کا لیا جانا یا نہ لیا جانا یہ بڑا بامعنی کام ہے اور پولیس افسر کا بروقت اقدام کرنا بھی بہت معنی رکھتا ہے۔ ایک صاحب (1997) اب ضلع بھکر سے آزاد حیثیت میں

قومی اسمبلی کے ممبر بن گئے ہیں لاہور میں جب 68۔ 1997ء میں ڈی ایس پی تھے تو ہلا کو خان کہلاتے تھے اپنے اس خطاب کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے محمد اصغر خان (سابق ڈی آئی جی کرائمز) کہتے ہیں (جنگ سنڈے ایڈیشن 30 مارچ 1997ء) ''62۔ 1961ء کی بات ہے میں لاہور میں ٹریفک انسپکٹر تھا اس کے ساتھ مجھے ریزرو انسپکٹر پولیس لائن کے فرائض بھی اضافی طور پر سونپے گئے تھے ان دنوں پولیس لائن میں لوگوں نے بالکل بغاوت کر دی تھی اور وہ احکامات نہیں مانتے تھے ان ڈسپلن ہوگئے تھے اور ان پر کوئی کنٹرول نہیں تھا۔ صورت حال اس حد تک خراب ہوگئی تھی کہ پولیس لائن میں جوئے خانے کھل گئے تھے۔ وہاں لڑکیاں لائی جاتی تھیں۔ زنا کے واقعات بھی ہوئے۔ ان دنوں میاں بشیر ڈی آئی جی تھے اور ایس ایس پی خلیل الرحمٰن تھے۔ نہ جانے ان کو کس نے مشورہ دیا کہ میری وہاں پر تعیناتی کر دی جائے۔ میں نے احتجاج کیا کہ آخر وہاں مجھے کیوں پھنسایا جا رہا ہے۔ انہوں نے کہا آپ کے پاس ریزرو انسپکٹر کا ایڈیشنل چارج ہوگا۔ تعیناتی کے دوسرے دن پولیس لائن میں پریڈ تھی۔ سویرے سویرے تیار ہو کر گیا۔ لائن افسر' چیف ڈرل انسٹرکٹر' اور دوسرے افراد موجود تھے لیکن کوئی سپاہی گراؤنڈ میں پریڈ کے لئے موجود نہیں تھا میں نے پوچھا کہ ان کا رنگ لیڈر کون ہے۔ انہوں نے اس کا نام اور بیرک بتائی میں نے کہا آؤ ادھر چلتے ہیں تو لائن افسر نے مجھے منع کیا کہ مجھے رنگ لیڈر کی بیرک میں نہیں جانا چاہئے تاکہ کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آ جائے۔ اس وقت ہماری بھی جوانی عروج پر تھی۔ میں اس بیرک میں گیا۔ ایک نوجوان منہ میں داتن لیے کچھا بنیان پہنے تولئے کو کندھے پر رکھ کر باتھ کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا ''تم پریڈ پر کیوں نہیں آئے۔ کہنے لگا ''جی جاگ نہیں کھلی۔'' تو میں نے کہا آئندہ کے لئے کیا خیال ہے؟ کہنے لگا ''اگر جاگ کھل جائے گی تو آ جائیں گے۔ نہیں تو نہیں آئیں گے۔ میں اس کے قریب ہو گیا اور اس کی گردن پر زور سے مکا مارا وہ گر گیا میں نے اس پر ٹھڈوں اور مکوں کی بارش کر دی اور اسے وہیں ہتھکڑی لگوا دی۔ پولیس ایکٹ میں ہے کہ جو ملازم حکم نہ مانے اسے سزا دی جائے۔ اسے اسی روز سردار تیمور شاہ اے ڈی ایم نے تین ماہ کی سزا دے دی۔ دوسرے دن ساتھ آٹھ آدمی اور تین تین ماہ کی سزا پر جیل چلے گئے۔ گرمیوں کا موسم تھا میں نے حکم دیا کہ پولیس لائن میں جتنے سپاہی ہیں صبح کی بجائے دوپہر کو پریڈ میں آیا کریں گے۔ دوپہر کی

پریڈ نے سب کا دماغ ٹھیک کر دیا۔ حالات ٹھیک ہو گئے اور یہ سپاہی تھے جنہوں نے میرا یہ نام (ہلاکو خان) ڈال دیا تھا۔

محمد اصغر خان کا والد تحصیل دار تھا' جلد انتقال کر گیا' اصغر خان ابھی بی اے کا طالب علم تھا جب اس نے اے ایس آئی بھرتی ہونے کے لئے انگریز ایس پی کو درخواست دی' ڈی آئی جی سے انٹرویو میں کامیاب ہوا مگر نوکری نہیں ملی۔ انتظار یہ فہرست میں رکھا گیا۔ اگلے سال اے ایس آئی بھرتی ہو کر تربیت کے لئے پھلور (جالندھر۔ مشرقی پنجاب) چلا گیا۔ اصغر خان نے اس انٹرویو میں یہ بھی کہا کہ احمد رضا قصوری نے اپنے والد کے قتل کے شبہ میں جن لوگوں کو نامزد کیا ان میں ذوالفقار علی بھٹو کا نام بھی تھا جو اس وقت وزیراعظم تھے چنانچہ ایف آئی آر میں وزیراعظم کا نام شامل ہوا۔ میں اس وقت ایس پی تھا۔

مراد یہ کہ یہ تو نہیں کہ اصغر خان صاحب آئیڈیل پولیس افسر ہوں گے مگر اتنی بات تو لگتی ہے کہ آدمی کھڑا ہونا چاہئے تو کھڑا ہو سکتا ہے۔ بھٹو شائد بڑا آدمی تھا جس نے ایف آئی آر میں نام رہنے دیا یا اسے ٹریجک ہیرو بننا تھا' مگر وائیں' شہباز شریف' پرویز الٰہی، منظور وٹو بڑے چھوٹے آدمی تھے کہ انہوں نے غلط کار ایم پی اے کے لئے انسپکٹر پولیس، ایس پی اور آئی جی سبھی کو رگڑا لگا دیا اور بدقسمتی سے یہ افسر بھی بخوشی رگڑا کھا گئے۔

سوال یہ ہے کہ پولیس کی نفری شروع دن سے کیسی رہی ہے۔ سرلیپل گرفتھ نے 1909ء میں پنجاب کے رؤسا کے بارے میں کتاب لکھی' اس کا اردو ترجمہ اس صدی کی تیسری دہائی میں نوازش علی خان قزلباش نے کیا۔ انگریز نے محکمہ مال'عدلیہ اور پولیس میں بھرتی انہیں وفادار خاندان کے افراد سے کی۔ افرادی قوت کے حوالے سے آج کی پولیس کی بنیاد بھی ان ابتدائی اینٹوں پر رکھی گئی ہے اس لئے تاریخ کے حصے کے طور پر ان خاندانوں (ہندو' سکھ' مسلمان) میں سے پولیس میں بھرتی کئے گئے فرنگی کے بندگان بے دام کے ناموں اور اضلاع کی نشاندہی ایک تاریخی ریکارڈ کو آج کے خدو خال نمایاں کرنے کے لئے قابل تعریف سمجھی جائے گی۔ B. R. Kalia کی کتاب Development of Police in the Punjab کے حوالے سے سابق ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس این۔اے۔ رضوی نے اپنی کتاب Our Police Heritage میں لکھا ہے کہ ایک انسپکٹر جنرل نے عوام کے بارے میں پولیس کے رویے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا

تھا۔'' جیسے ہی پولیس ملازم کے سینے پر پولیس کی ملازمت اور عہدے کا بیج لگتا ہے اسی لمحے اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنے ہم وطنوں کے مقابلے میں ایک درجہ بلند ہو گیا ہے''۔ انسپکٹر جنرل نے سچ کہا تھا۔ جن دنوں گاؤں کی پنچائیت تمام چھوٹے موٹے معاملات طے کرتی تھی اور جب لوگوں کو ایذا پہنچانے والے کو سب سے بڑی سزا دی جاتی تھی ان دنوں سرکاری ملازم کو یہ گمان (دوسروں سے بلند ہونے کا) ہرگز نہیں ہوتا تھا' مگر انیسویں صدی کے شروع میں مقامی لوگوں کو تمام ذمہ دار اسامیوں کے لئے نا قابل قرار دیا گیا۔ تب کسی بھی نوع کی ذہانت' تجربہ' صفت مقامی باشندے کو سرکاری ملازمت نہیں دلا سکتی تھی۔ ان دنوں اگر کسی مقامی کو کوئی ملازمت مل بھی جاتی تو وہ خود کو ہم وطنوں کے مقابلے میں طرم خان سمجھنا شروع کر دیتا۔ 1861ء میں راجہ نگون (ندون؟) جیسے بلند مرتبہ آدمی کو جب پولیس کا صرف اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ کا عہدہ دیا گیا تو اس نے اس عہدہ کو بہت بڑا اعزاز سمجھا۔ امپیریل سروس کا رکن ہونا بہت بڑا اور بہت کم یاب اعزاز تھا۔ چنانچہ تمام سول سرونٹس سروس اپنے آپ کو اپنے وطن کے مقابلے میں بلند مرتبہ سمجھتے تھے اور اس لئے بھی کہ اس قسم کی مثال ان کے یورپی ساتھیوں نے قائم کر دی تھی۔ یہ رجحان بعد کی نسلوں نے بھی ورثے میں پایا اور آج بھی کسی حد تک یہ احساس موجود ہے۔

اور اب پورے پنجاب سے وہ ملازمین پولیس جن کا اپنے اور خاندانوں کا واحد قابل قبول صفت معیار گورے سے مکمل وفاداری تھی اور یہ ان دنوں کی بات ہے جب انگریز افسر ہی اس قسم کی بھرتی براہ راست کیا کرتے تھے۔ پنجاب میں ہی نہیں دوسرے صوبوں میں اور دوسرے ممالک میں بھی ایک طویل عرصہ تک وفاداری ہی اول و آخر شرط پسندیدگی ٹھہری تھی۔

ضلع گوڑ گاؤں میں فرخ نگر کے رئیس **محمد علاؤالدین حیدر** کے خاندان کے تفضّل حسین خان مئی 1857ء میں ناگپور میں مقالہ رسالہ کے افسر تھے تفضّل نے بغاوت کی ایک کوشش ناکام کی۔ صلے میں اسے سوار پولیس کا رسالدار بنایا گیا اور سردار بہادر کا خطاب بھی۔

ضلع کرنال نوابزادہ لیاقت علی خان والے خاندان میں مہتاب علی خان پہلے آنرری سیکنڈ لیفٹیننٹ ہوئے پھر پنجاب میں اسسٹنٹ سب انسپکٹر پولیس۔

سردار عطر سنگھ رئیس دھنورا کے عزیز دھجا سنگھ کو ہیڈ کانسٹیبل بنایا گیا
سردار ہرنام سنگھ رئیس منگور کے سردار شونرائن سنگھ کو سب انسپکٹر پولیس۔
سردار امراؤ سنگھ کے عزیز راجندر سنگھ کو اسسٹنٹ سب انسپکٹر پولیس

ضلع کانگڑہ راجہ عظیم اللہ خان رئیس رہلو کے عزیز مرزا ولی اللہ خان کو انسپکٹر پولیس۔

ضلع ہوشیار پور مکیریاں کے سردار شوسنگھ کے خاندان کے سدھ سنگھ نے غدر 1857ء میں انگریزوں کا ساتھ دیا۔ بعد میں انسپکٹر پولیس بنایا گیا۔

امرتسر کے سردار امر سنگھ رئیس نوگجہ کے عزیز منشی وریام سنگھ نے پولیس انسپکٹر کی حیثیت سے وائسرائے کے ساتھ ڈیوٹی دی اس کا چچا بھی ڈپٹی انسپکٹر پولیس تھا۔

بہرام کے رئیس بھگت سنگھ اور بھائی جسونت سنگھ دونوں انسپکٹر پولیس تھے۔

افغانستان کے شاہ شجاع الملک کے خانوادے میں سردار محمد ہمدم سدوزئی لدھیانہ (نادر آباد لاہور) کے بھائی محمد معظم اور محمد عمر انگریز پولیس میں ملازم۔ ان کے عزیز محمد اکبر اور مختار علی بھی پولیس میں ہی تھے۔

شاہ زمان (سابق والئی افغانستان) کے پوتے عالمگیر کے پانچ بیٹے پولیس میں بھرتی کئے گئے ۔عبدالوہاب سب انسپکٹر۔ باقی کامران' سیف الرحمن اور محمد نصیر الدین بھی پولیس میں تھے۔

اسی خاندان کا شہزادہ ففغور رئیس لدھیانہ تھا۔ 1889ء میں پنجاب پولیس میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ 1920ء میں ننکانہ میں تحریک نافرمانی کے سلسلے میں اچھی خدمات سرانجام دیں۔ بیٹا شہزادہ حبیب احمد بھی پولیس میں۔ پاکستان بننے کے بعد بھی لاہور میں افسر تھا۔

ضلع فیروز پور کپتان سوڈھی ہرنام سنگھ جو خود گورو رام داس کے خاندان سے تھا۔ اس کا عزیز مان سنگھ پولیس میں بھرتی کیا گیا۔

قصور یہ خاندان کا عثمان قصور یہ پولیس میں بھرتی کیا گیا۔

گورجگت سنگھ کا بیٹا مان سنگھ 1872ء میں پولیس میں ملازم رکھا گیا۔

شہزادہ سلطان اسمٰعیل 35 سال سرحدی پولیس میں ملازم رہا۔ 1901ء میں بطور اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس ریٹائر ہوا۔ اسے سمندری (ضلع فیصل آباد) میں دس مربعے

اراضی دی گئی۔ اس کا عزیز سلطان حمید اورنگ آباد (حیدر آباد دکن) میں کوتوال تھا۔

لاہور فقیر خاندان کے فقیر سید ظفرالدین ریلوے پولیس کے ڈی ایس پی کے عہدہ تک پہنچے۔

نواب امام الدین کا خاندان: جی معین الدین کے والد شیخ ریاض الدین کو براہ راست پولیس انسپکٹر بھرتی کیا گیا۔ جو کانگڑہ ضلع میں ڈی ایس پی بھی رہے۔

معرف کملا خاندان کے امر سنگھ کا بیٹا ڈپٹی انسپکٹر پولیس رہا۔

سردار تیجا سنگھ (ٹھیٹھر خاندان) پولیس میں انسپکٹر تھا۔ گورنر پنجاب کا ایڈی کانگ بھی رہا۔ اسی خاندان کا فرد گورچرن سنگھ فوج میں لیفٹیننٹ تھا اسے انسپکٹر پولیس بنایا گیا۔ ایک اور فرد اوتار سنگھ پولیس کا انسپکٹر جنرل رہا۔ سردار بھوپندر سنگھ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس تک پہنچا۔

نکئی خاندان (سکھ حصہ) کا اتم سنگھ ترقی کر کے پولیس انسپکٹر بنا اس کے دو بیٹے بھی پولیس انسپکٹر تھے۔

مسر بشمبر داس خاندان کے گوبند رام کا بیٹا پولیس میں ملازم رکھا گیا۔

موکل خاندان آدھا سکھ اور آدھا مسلمان تھا۔ مانا سنگھ 1858ء میں پولیس میں رسالدار تھا۔ کشن سنگھ کا دادا چانن سنگھ ہیڈ کانسٹیبل تھا اور 1928ء میں ڈی ایس پی سانڈرس کے ساتھ شہید بھگت کے ہاتھوں شدید زخمی ہوا تھا۔ متذکرہ بالا مانا سنگھ کا بھائی بڈھا سنگھ بھی پولیس میں ملازم تھا۔

کول خاندان دیوان گنیش داس۔ تاراچند۔ پولیس کے ڈپٹی انسپکٹر

قصور۔ خویشگی پٹھان شہباز خان خلف ژئی کا بھائی سردار فتح خان پھلور میں سب انسپکٹر تھا۔ میر باز خان کا لڑکا محمد اصغر خان لندن میں سپیشل کانسٹیبل رہا۔

مڑا کے گوردے سنگھ پولیس بٹالین سورج مکھی میں صوبہ دار۔ ایڈ جوئنٹ اس کا بیٹا ہر کشن سنگھ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس تھا۔

ماڑی: سید اولا حسین خاندان کے محمد شاہ کو فوج سے تبدیل کر کے پولیس کا کمیدان بنایا گیا۔ سردار علی لاہور میں انسپکٹر پولیس تھا' افتخار علی بنارس میں پولیس انسپکٹر اور حسین شاہ کا بیٹا نوازش علی بھی پولیس میں ہی تھا۔

امرتسر رام گدڑ ڈھیا خاندن کا سردار بشن سنگھ 1900ء میں ڈی ایس پی تھا۔ اسے کنگ پولیس میڈل بھی ملا۔ بھائی گوبخش سنگھ اور دیال سنگھ بھی پولیس میں فوجداری تفتیش کے انسپکٹر۔

نوشہرہ کے سہائے خاندان کا شوسہائے 1913ء میں جزائر انڈیمان (کالا پانی) میں پراسیکیوٹنگ انسپکٹر تھا' کالا پانی میں برصغیر کے معرج سیاسی اور انقلابی راہ نماؤں کو قید کیا گیا۔ 1913ء میں لالہ لاجپت رائے اور بھگت سنگھ شہید کا تایا اجیت سنگھ کالا پانی میں ہی تھے جنہیں 1907ء کی پگڑی سنبھال جٹا تحریک میں گرفتار کیا گیا تھا۔

رسول پور یہ خاندان کا پریتم سنگھ فوج میں جمعدار تھا بعد میں سب انسپکٹر پولیس بنایا گیا۔ بھیلووال خاندان کے بلونت سنگھ کو ڈپٹی انسپکٹر پولیس رکھا گیا۔

ضلع گورداسپور بھاگو والا کے کرپال سنگھ کا بھتیجا پولیس میں ملازم رکھا گیا۔

پنج ہٹہ کے بھگوان سنگھ خاندان کا فوج دار سنگھ تھانیدار بھرتی کیا گیا۔

ضلع سیالکوٹ وڈالہ کے حاکم سنگھ سندھو کے خاندان کا بھگیل سنگھ 1861ء میں اودھ پولیس میں' بعد میں پنجاب پولیس میں انسپکٹر ہوا۔ 1873ء میں جزائر انڈیمان میں اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ ہوا۔ بیٹا ٹھاکر سنگھ بھی انڈیمان میں ہی پولیس تھا۔ کلاس والہ کے رندھیر سنگھ خاندان کا سنت سنگھ پہلے فوج میں پھر برما کی فوج پولیس میں بھرتی ہوا۔ اوتار سنگھ خاندان کا بسنت سنگھ انسپکٹر تھا۔

ضلع گوجرانوالہ وڈیالہ کے رجونت سنگھ خاندان کا مان سنگھ 1852ء میں پولیس میں بھرتی ہوا اور کرم سنگھ بھی پولیس میں گیا۔

وزیر آباد میں دیوان بدری داس دگل خاندان کا نند گوپال سیالکوٹ میں کوتوال تھا 1861ء میں کورٹ انسپکٹر پولیس ہوا۔

حافظ آباد کے ہربنس سنگھ خاندان کا ہربنس سنگھ 1931ء میں ڈپٹی انسپکٹر پولیس تھا۔

رام نگر کا امریک سنگھ برما پولیس میں صوبیدار بعد میں ٹھگی ڈکیتی کے محکمہ کا اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ۔

احمد نگر کا کرم الٰہی چٹھہ خاندان' خدا بخش چٹھہ کے دو پوتے غلام حیدر اور شمس

الدین علی الترتیب تھانیدار اور نائب تھانیدار ہوئے۔

ایم آباد کے گنگا بشن خاندان کا کرم چند 1857ء میں پولیس بٹالین نمبر 10 کا کمیدان ہوا۔ جے سنگھ چمنی خاندان کا حکما سنگھ سوسوار کا کمیدان ہوا۔ اس کے بیٹے امر سنگھ اور مہر سنگھ پولیس میں ہی ملازم ہوئے۔

مانانوالہ خاندان کا گوپال سنگھ ڈی ایس پی ہوا اور اسی خاندان کا ہیرا سنگھ بھی پولیس میں تھا۔

ضلع شاہ پور : ٹوانہ خاندان کے کئی افراد فوج اور پولیس میں اچھے عہدوں پر بھرتی کئے گئے۔

ہمو کا کے خدا بخش ٹوانہ خاندان میں ملک سلطان محمود 1857ء کے بعد پولیس انسپکٹر رہا۔

ضلع جہلم ہرن پور کا سوڈھی گیان سنگھ خاندان ۔ گیان سنگھ کا بیٹا کرم سنگھ سب انسپکٹر ہوا۔' سوڈھی پرکاش سنگھ بھی سب انسپکٹر تھا) (فوجداری تفتیش) اور سوڈھی نانگ سنگھ بھی پولیس میں تھا۔

ڈلوال راجہ افضل خان کا بیٹا محمد سردار خان انسپکٹر پولیس رہا۔

ضلع راولپنڈی : پھر والہ کے راجہ کرم داد گکھڑ خاندان کا علی بہادر خان اور اس کا والد فضل داد 1808ء میں پولیس میں بھرتی ہوئے۔ علی بہادر انسپکٹر ریٹائر ہوا۔

گور دت سنگھ چھاچھی خاندان کا گوپال سنگھ ڈپٹی انسپکٹر پولیس اور رام سنگھ برما پولیس میں انسپکٹر پولیس تھا۔

بابا نروتم سنگھ خاندان کا بابا پروت سنگھ پولیس میں انسپکٹر ہوا۔

کونتریلہ کے میجر بخشی اوتار سنگھ خاندان کا تیجا سنگھ اودھ پولیس میں ڈپٹی انسپکٹر امر سنگھ تھانیدار تھا۔ 1879ء میں ریٹائر ہوا۔ بسنت سنگھ انسپکٹر پولیس تھا۔ اس کا بیٹا سپورن سنگھ ڈی ایس پی جبکہ بخشی ہر دیو سنگھ صوبہ سرحد میں سب انسپکٹر پولیس بھرتی کیا گیا۔

واہ کے کھٹڑ خاندان کا محمد حیات خان پہلے فوج میں بعد میں پولیس میں تھانیدار اور پھر تحصیل دار ہوا۔ بہادر خان 1879ء میں فوت ہوا وہ ڈپٹی انسپکٹر پولیس تھا۔

ضلع میانوالی : عیسیٰ خیل کے خان عبدالکریم خاندان کا عبداللہ خان انسپکٹر پولیس ہوا اور خدا داد خان سرحد پولیس کا ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ بنا۔

ملتان : گردیزی خاندان کا صدرالدین ڈپٹی انسپکٹر پولیس رہا۔

ڈیرہ غازی خان مزاری خاندان کے سربہرام خان کا بھائی عطا محمد ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس ہوا اور بھتیجا غوث بخش خان سرحدی ملٹری پولیس میں جمعدار تھا۔

لغاری خاندان کا فتح محمد لغاری سب انسپکٹر پولیس اور لال خان لغاری بارڈر پولیس میں تھا۔

کھوسہ مبارک خان خاندان کا غلام حیدر خان پولیس میں رسالدار تھا۔

دریشک خاندان کا غلام حیدر خان پولیس میں رسالدار' امن خان ملٹری پولیس میں اور جاڑا خان دریشک سارجنٹ پولیس تھا۔

گورچانی خاندان لاشکر خان بارڈر ملٹری پولیس میں اور حسن خان گورچانی میں انسپکٹر پولیس تھا۔

قیصرانی خاندان کے سردار فضل علی کے بیٹے مٹھو خان اور غلام حیدر بارڈر پولیس میں سوار تھے۔

ٹبی لنڈ کا بہادر خان سب انسپکٹر پولیس

سدوزئی خاندان کا عبدالرحیم خان' سردار خان' قادر داد خان اور عبدالخالق خان پولیس میں تھے۔

نتکانی خاندان کا محمد مسوخان 1870ء میں ڈپٹی انسپکٹر پولیس تھا۔

سیاسی زندگی میں پولیس کا عمل دخل

سابق ڈی ایس پی نے سرکاری امیدوار کو کیسے کامیاب کرایا۔

1861ء کے پولیس ایکٹ یا پنجاب رولز میں پولیس کے سیاسی کردار کے لئے کوئی گنجائش نہیں مگر پولیس کو بنگال کے حاجی شریعت اللہ (1840۔1780) دودھومیاں 1819ء اور تیتو میروشارعلی نے تحریک کا آغاز 1827ء میں کیا) کے خلاف جس طرح استعمال کی گیا اور پھر برصغیر میں پولیس نے آزادی کی تحریک کے خلاف جس طرح استعمال کیا گیا اور پھر برصغیر میں پولیس نے آزادی کی تحریک کے خلاف جو کارنامے سرانجام دیئے وہ اب طاق نسیاں کا حصہ بن گئے۔ پیرپگاڑہ کے والد کے خلاف سندھ میں پولیس کی کار روائی' قصہ خوانی بازار اور ایسے بے شمار واقعات ہیں جن کا اصل ریکارڈ کسی کے پاس نہیں۔ پولیس کا رسمی ریکارڈ بھی سلامت نہیں۔ کیونکہ مختلف مراحل پر فرنگیوں پر جان نثار کرنے والوں نے اپنی بخشت کے لئے کچھ نہ کچھ ریکارڈ تلف کر دیا۔ چھاپا اس لئے نہیں گیا کہ آزادی کے بعد جو حکمران آئے تھے وہ حکمرانی میں خود مختار نہ انداز میں طاق نہ تھے،عوام اور پارٹی کی بجائے پولیس اور سرکاری مشینری سے کام لیا کرتے تھے اور آخر کار اسی پولیس اور نوکر شاہی کے ہاتھوں رسوا ہو کر عوامی زندگی سے نکل جایا کرتے تھے۔

یہاں ایک بات پھر دہرانے کو جی چاہتا ہے کہ پاکستان میں پولیس سمیت کسی بھی محکمے کے ماضی اور حال کی تاریخ منضبط شکل میں نہیں ملتی ۔ جو گولی مکے پر چلائی گئی تھی اس کا سارا ریکارڈ پہلی جنگ عظیم کی ضلعی رپورٹوں اور بعد میں سرفراز کئے جانے والے مقامی اشرافیہ کے بارے میں انگریز حکومت کی مطبوعہ کتب میں مل جاتا ہے مگر اسے بھی بکھر جانے دیا گیا۔ اس لئے کہ نقاب انہی چہروں اور خاندانوں پر سے اٹھتا تھا جو پے درپے عوام دشمنی کے باوجود پولیس فوج اور سرکار کی مدد سے حکمران ہے۔ چنانچہ نہ پولیس کی کوئی معقول تاریخ ملتی ہے نہ ان دیوانوں کے بارے میں تفصیلی واقعات و حالات جو عروس آزادی کی آرزو میں کبھی پھانسی پر کبھی زنداں میں اور کبھی سرمیدان جان رہا گئے ۔ نہ ان کے نام رہنے دیئے گئے نہ ان کے کارناموں کے احوال و آثار ۔کبھی انہیں ڈاکوؤں میں

شامل کر دیا گیا۔ اور کبھی راہزانوں اور بدکاروں کے بستوں میں ان کا اندراج ہوا۔

پولیس سے سیاسی مقاصد کے لئے 1947ء سے پہلے یعنی 1757ء سے بھی پہلے سے لے کر اب تک کیا کیا کام لئے گئے اور کہاں یہ کام جائز تھے اور کہاں ناجائز اس پر بھی کوئی کام نہیں ہوا۔ امر مانع وہی ہے کہ منصف بھی وہی ہیں قاتل بھی وہی ہیں گواہ بھی وہی ہیں اس لئے ۔ ع

اقربا میرے کریں خون کا دعویٰ کس پر

یہ بھی اتفاق کی اتفاق ہے کہ پولیس کے اعلیٰ افسروں میں سے شاید ہی کسی نے اپنی محکمانہ خودنوشت اتنی دیانتداری سے لکھی ہو، اول تو ایسے لکھنے والے کہاں۔ دوسرے یہ وہ شعبہ ہے جس میں خدا جانے بندے نے کیا کیا کچھ کیا ہوتا ہے کہ اس پر سے پردہ ہٹانے میں بھی شرم دامن گیر ہوتی ہے۔ بہرطور عجب اتفاق ہے کہ جونیئر پولیس اہل کار نے جو اے ایس آئی بھرتی ہوا اور ایس پی ریٹائر ہوا۔ پولیس کے سبھی بڑے اعزاز حاصل کئے۔ اپنی خودنوشت میں تین چار الیکشنوں کا حال درج کیا ہے۔ 1946ء کے انتخابات میں پولیس افسر شیخ ابرار احمد ضلع کرنال میں موضع گوہلہ میں افسر انچارج تھے۔ مسلم لیگ کے امیدوار صوفی عبدالحمید تھے مخالف یونینسٹ تھا۔ ہر چند اس الیکشن میں پورے پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کی طرف سے پولیس اور دوسرے محکموں کے ذریعے مسلم لیگ کے خلاف دباؤ ڈالا گیا لہٰذا ناجائز مداخلت بھی ہوئی مگر شیخ ابرار کے حلقے میں ایسا نہیں ہوا۔ لکھتے ہیں:

''میں نے مختلف پولنگ سٹیشنوں پر جا کر نگرانی کی۔ صرف ایک پولنگ سٹیشن پر ایک بدمعاش کو فریق مخالف کے لئے کوشاں پایا۔ میں نہ رہ سکا۔ بلایا کہنے لگا کہ آپ نے مجھے کب کہا کہ صوفی صاحب کی امداد کرنی ہے۔ میرا جواب تھا ''قائداعظم نے پاکستان کا مطالبہ کیا ہے۔ مسلم لیگ کی امداد کے لئے پکارا ہے۔ پھر مخالفت کیسی۔ وہ نادم ہوا۔ کیمپ چھوڑ کر چلا گیا۔''

شیخ ابرار احمد نے ان الیکشنوں کا کوئی ذکر نہیں کیا جو میاں ممتاز دولتانہ نے ان دنوں کرائے تھے جب لیاقت علی خان وزیراعظم تھے۔ یہ متحدہ پاکستان میں ہونے والے سب سے پہلے الیکشن ہیں جن میں بے انتہا بدعنوانی ہوئی تھی اور پھر ان انتخابات کے بعد جھرلو کی بڑی ہی خوفناک روایت چل نکلی۔

شیخ ابرار احمد نے اپریل 1955ء میں سیالکوٹ میں بلدیہ کے انتخابات کرائے تھے۔ تب وہ ڈی ایس پی تھے۔ انہوں نے 1951ء میں جناح عوامی لیگ کے افتخار حسین ممدوٹ اور خواجہ صفدر کے الیکشنوں کا ذکر نہیں کیا، پھر ضمنی انتخابات میں کس طور پر برسراقتدار جماعت کے امیدوار کو کامیاب کرایا گیا؟ شیخ ابرار نے سیالکوٹ کے بلدیاتی انتخابات کا جائزہ صرف انتظامی طور پر پیش کیا ہے۔ انتخابات کے پیچھے سیاسی کھیل سے صرف نظر کر لیا۔

1964ء میں ڈی ایس پی کی حیثیت سے فیصل آباد میں بنیادی جمہوریت کے انتخابات کرائے۔ یہ معاملہ بھی انتظامی نوعیت کا تھا تاہم اس سے اگلا الیکشن انہیں ٹوبہ ٹیک سنگھ سے قومی اسمبلی کا کرانا پڑا اور ان کو فوری طور پر فیصل آباد سے ٹوبہ ٹیک سنگھ بھیجا گیا۔ حلقہ ٹوبہ ٹیک سنگھ گوجرہ اور کمالیہ پر مشتمل تھا۔ کنونشن لیگ کے امیدوار چودھری سلطان احمد تھے، حزب مخالف کے امیدوار حمزہ تھے جبکہ دوسرے امیدواروں میں ملک نادر ٹوانہ اور ان کے ساتھی عباس گادھی تھے۔ شیخ ابرار کی تحریر کو اگر ہم نے اپنے الفاظ میں پیش کیا تو ممکن ہے ترازو کا کوئی پلڑا نادانستگی میں ہماری وجہ سے جھک جائے۔ ابرار لکھتے ہیں:

''بنیادی جمہوریت کے انتخابات کا مرحلہ گزر گیا۔ اس کے بعد مرکزی اسمبلی کے ممبران کا ممبران بنیادی جمہوریت نے چناؤ کرنا تھا۔ انتخابات میں جب چھ روز باقی تھے لاہور سے وائرلیس موصول ہوئی کہ میرا تبادلہ لائل پور شہر سے ٹوبہ ٹیک سنگھ ہو گیا ہے اور مجھے اسی شام جائے تعیناتی پر پہنچنا تھا۔ قہر درویش، برجان درویش۔ تعمیل ہوئی۔ ظاہر ہے کہ یہ تبادلہ بعض اغراض کی بنیاد پر تھا۔ چودھری سلطان احمد مرکزی اسمبلی کے لئے سرکاری پارٹی (کنونشن مسلم لیگ) کے امیدوار تھے۔ ملک سروش علوی اے ایس پی ٹوبہ ٹیک سنگھ تھے۔ صاف گو، سلجھے ہوئے نوجوان۔ سلطان احمد کو نامناسب خطرات تھے کہ اے ایس پی ملک ہیں اور ملک نادر ٹوانہ انتخابات سے دستبردار ہو جائیں لیکن وہ اپنی ضد پر قائم رہے۔ میرے ٹوبہ ٹیک سنگھ پہنچنے سے پہلے چودھری سلطان احمد نہ اپنے حلقہ میں آئے تھے اور نہ کوئی اشتہار دے سکے تھے۔ مایوسی کے عالم میں لاہور پہنچے۔ ایسے حالات میں سب سے کمزور عضو ملازمان سرکار ہوتے ہیں۔ امیدوار جن کے پاس سرکاری پارٹی کے ٹکٹ ہیں سرکاری ملازمان کو کھلونے کی طرح استعمال کرتے ہیں اور یہ بھی امر واقعہ ہے کہ ملازمین کی غالب

اکثریت کو گنڈیری کی طرح چوستے ہیں، استعمال کرتے ہیں۔ وقت نکلنے پر چھلکے جان کر ٹھوکر مار دیتے ہیں۔

ٹوبہ ٹیک سنگھ اس سے پہلے صرف ایک مرتبہ نجی کام کے سلسلے میں آیا تھا۔ نہ لوگوں سے آشنا نہ حالات سے واقفیت ۔ ملک امیر محمد خان گورنر مغربی پاکستان اپنی شہرت کے عروج پر تھے۔ بھلا کسی ماتحت کی کیا مجال کہ تعمیل نہ ہو۔ ڈی سی اور ایس پی کی خصوصی ہدایات پر ہم جو کبھی غیر جانبداری کا عہد کرتے تھے یہاں حکم غلام بلکہ حکم حاکم مرگ مفاجات کی تصویر تھے۔ عقل عیار ہے سو بھیس بنا(بدل) لیتی ہے۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ کہاں ضمیر! کس کی حمیت۔ لیکن ایک فیصلہ میں نے کیا کہ اس کے باوجود ظلم نہ کروں گا۔ مجھے حکم تھا کہ ایک بڑے پیر اسرار حسین شاہ کو فوراً گرفتار کر کے حوالات میں بند کروں۔ میں نے اسی رات ایک تھانیدار سے دانستہ ذکر کیا۔ اگلے دن پیر صاحب کی گرفتاری کے لئے چھاپہ مارا۔ وہ گاؤں میں موجود نہ تھے۔ میں جان گیا کہ پیر صاحب کو اطلاع ہو چکی ہے۔

''اس حلقہ سے چودھری سلطان احمد ملک نادر ٹوانہ اور مسٹر ایم اے حمزہ امیدواران تھے اس تکون میں چودھری سلطان او رملک نادر کے ووٹ تقسیم ہوتے تھے جس کا فائدہ جناب حمزہ کو تھا۔ پہلی رات ملک نادر ٹوانہ سے طویل نشست ہوئی۔ ان کے بزرگوں سے شناسائی تھی۔ بزرگوں کا کرم زیادہ میری کوشش کم۔ وہ مان گئے اور انتخابات سے دستبردار ہو گئے۔ اگلی صبح میں نے مجبور کر کے انہیں اپنی جیپ میں بٹھایا اور علاقہ کا جائزہ لینے خود لوگوں کے پاس گیا۔ مقامی تھانیدار کی تجویز تھی کہ میں ریسٹ ہاؤس میں بیٹھوں وہ لوگوں کو ملانے اور بلانے کا بندوبست کرے گا۔ وقت بہت کم تھا۔ میں نہ مانا۔ خود علاقہ میں گیا۔

عباس گادھی ممبر بنیادی جمہوریت اور سابق چیئر مین بنیادی جمہوریت تھا وہ نوجوان اپنے قبیلے کا سردار با اثر تھا۔ احباب کا حلقہ وسیع تھا۔ ہم اس کے ڈیرے پر پہنچے مجھے اور ملک نادر ٹوانہ کو اکٹھے جیپ سے اترتے دیکھا اور حیران رہ گیا۔ میری پوسٹنگ کی اطلاع بجلی کی طرح علاقہ میں پھیل گئی تھی۔ عباس سے میں واقف تھا۔ وہ ملک نادر کا امدادی تھا میری آمد کو فوراً بھانپ گیا۔ فضا سیاسی تھی موسم الیکشن کا تھا۔ آنکھیں چار ہوئیں اور دل کی ترجمانی کر گئیں۔ چند ساعت کے بعد تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے عباس

گادھی نے پوچھا ''ڈپٹی صاحب کب اور کیسے آنا ہوا۔ میرا صرف ایک جملہ تھا'' چل کر آیا ہوں۔ آپ کی مرضی۔'' کچھ دیر گفتگو ہوئی۔ آخر عباس نے وعدہ کیا اور لاج رکھ لی۔ ملک نادر نے بہت امداد کی۔ چنانچہ تین دن علاقہ میں پھرا۔ میرے ساتھ چودھری عبدالستار راجپوت اور خان دین محمد نے کافی تعاون کیا۔ مجھے باخبر رکھا۔ حالات کا رخ کافی بدل گیا۔ مجھے ہائی کورٹ سے تار موصول ہوا کہ الیکشن میں مداخلت نہ کریں۔

''الیکشن سے ایک رات پہلے تقریباً گیارہ بجے کا وقت تھا۔ میں ریسٹ ہاؤس ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ٹھہرا ہوا تھا۔ مقامی وکلا کے ایک وفد نے جگایا۔ ایک درخواست پر مسٹر جاوید قریشی ایس ڈی ایم سے حکم لکھوا کر لائے تھے۔ درخواست کا متن تھا'' پولیس نے نو دس ممبران جمہوریت کو اپنی تحویل میں ناجائز رکھا ہوا ہے۔ وہ کل رائے دینے کے حق سے محروم ہو جائیں گے۔ فوری تدارک کیا جائے۔ ایس ڈی ایم نے فوری حکم لکھا کہ ڈی ایس پی ٹوبہ ایسے ممبران فوری طور پر رہا کر دیں۔ اور رپورٹ کریں۔ میں سویا ہوا تھا وکلا کا وفد میرے پیش ہوا۔ درخواست مجھے دی اور ان سب کے چہروں پر زیر لب فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ میں نے درخواست پڑھی۔ قلم ان سے مانگا اور بلا تامل لکھا ''نہ ایسے اشخاص پولیس کی تحویل میں ہیں اور نہ مجھے علم ہے۔ کسی رائے دہندہ کو ووٹ کے حق سے محروم نہ ہونے دیا جائے گا۔''

''درخواست میں نے وکلا حضرات کو دے دی۔ میرا جواب سب نے باری باری پڑھا انہوں نے مجھ سے گفتگو کرنا چاہی۔ میں نے آپ تحریر لائے تھے تحریری جواب لے جائیں۔ میں نے اٹھ کر دروازہ تک رخصت کیا۔ اگلے دن وکلا کے خدشات غلط ثابت ہوئے۔ ویسے تمام ممبران نے ووٹ کے حق کا استعمال کیا۔''

ایم اے حمزہ متحمل، تعلیم یافتہ، سادہ، دیانت دار، اچھے چلن اور خلق کی وجہ سے علاقہ میں مقبول ہیں اپنے الیکشن کی مہم انہوں نے زیادہ تر اکیلے سائیکل پر سفر کر کے چلائی۔ ویسے ارائیں برادری کا تعاون انہیں حاصل تھا اور ہر لحاظ سے مضبوط امیدوار تھے۔

ٹوبہ ٹیک سنگھ اور کمالیہ دو جگہ پولنگ سٹیشن تھے۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ پولنگ سٹیشن پر عجب منظر تھا۔ حمزہ اکیلے کرسی پر براجمان نہ تنبو نہ قنات نہ کرسی نہ میز نہ ایجنٹ نہ کوئی امدادی۔ سلطان احمد کے کیمپ میں خوب گہما گہمی تھی۔ اپنے اور پرائے سب شامل تھے۔ ووٹروں کی

ایک قطار لگی ہوئی۔ شام کو جب گنتی ہوئی تو حمزہ ٹوبہ ٹیک سنگھ سے زیادہ ووٹ لے گئے مگر مجموعی نتیجہ پر سلطان احمد چند ووٹوں سے جیت گئے۔ اور میں واپس لائل پور شہر پہنچ گیا۔ (صفحہ نمبر 124)

شیخ ابرار احمد نے انتخابات میں نہ صرف اپنے بلکہ پولیس کے کردار کے بارے میں جو کچھ لکھ دیا ہے وہ 1861ء سے لے کر آج تک پولیس پر صادق آتا ہے مگر ایسا اقبال جرم کرنے والے پولیس افسر بالکل ناپید ہیں۔ اگر وہ کچھ دلیر ہوتے تو ہوسکتا ہے کہ لوگوں کے ذہنوں میں پولیس کا پرانا قصور کسی حد تک مٹ چکا ہوتا اور مستقبل میں پولیس کو استعمال کرنے والے دیکھ بھال کر اسے استعمال کرتے یا استعمال سے سبکدوش ہو جاتے۔ شیخ ابرار نے محترمہ فاطمہ جناح اور فیلڈ مارشل ایوب کے صدارتی الیکشن کے حوالے سے فیصل آباد میں صورت حال کی طرف ایک بلیغ اشارہ کیا۔ ''الیکشن سے چند دن پہلے فوج نے لائل پور میں آ کر ڈیرے جما لئے۔ بریگیڈیئر احسن رشید شامی (65 میں کھیم کرن کے محاذ پر شہید ہوئے) انچارج تھے پولنگ سے پہلی شام مجھے شامی صاحب نے پوچھا کہ ڈپٹی صاحب کل کیسے گزرے گا۔ میں نے کہا حالات ایسے ہوں گے جیسے جمعہ کی نماز۔ انشاء اللہ کوئی گڑبڑ نہ ہوئی۔ لائل پور شہر میں پولنگ ٹاؤن ہال میں تھا، فوج کے انتظامات ایسے تھے کہ پولنگ سٹیشن کے ندر بھی فوجی ٹیلی فون، فوجی جوان، مقامی باغ کی گراؤنڈ میں فوج تیار اور موجود۔ پولیس ہر جگہ ڈیوٹی پر......''

واضح رہے کہ اس صدارتی الیکشن میں مغربی پاکستان میں کراچی ایک ایسا شہر تھا جس میں فاطمہ جناح کو ایوب خان کے مقابلے میں زیادہ ووٹ پڑے تھے، اور حیدر آباد اور ٹوبہ ٹیک سنگھ دو ایسے سٹیشن تھے جہاں دونوں امیدواروں کو برابر ووٹ ڈالے گئے تھے۔ باقی سارے پولنگ سٹیشنوں میں ایوب خان کو برتری حاصل تھی یا دلائی گئی تھی۔

ایک سال......ایک آئینہ

انسانی حقوق کے کمیشن کی نظر میں

قانون کے نفاذ اور امن عامہ کی ذمہ دار پولیس کے سماجی کردار کے بارے میں خود اعلیٰ پولیس افسران بھی مطمئن نہیں عوام کی بے زاری یا ناپسندیدگی کی تو انتہا کوئی نہیں۔ تاہم انتہائی متنازعہ ادارے کی حیثیت سے اس کے وجود کے نفع نقصان کا اندازہ عام طریق سے ہٹ کر بھی لگانا چاہیے اور نتائج یا تاثرات پڑھنے والے پر چھوڑ دینے چاہئیں۔ اس ضمن میں پاکستان ہیومن رائٹس کمیشن کی 1995ء کی سالانہ رپورٹ کی مدد سے کوائف پیش کیے جاتے ہیں۔

جرائم:

☆ کراچی میں دو ہزار سے زائد افراد تشدد کا شکار ہو گئے۔ ان میں سے 260 افراد مبینہ طور پر پولیس کی حراست میں یا پولیس مقابلوں میں مارے گئے جبکہ دو سو بیالیس پولیس والے بھی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

☆ ملک کے دوسرے حصوں میں بھی تشدد غیر انسانی سلوک اور پولیس حراست میں مارے جانے والوں کی بھی بڑی خبریں موصول ہوئیں۔ صرف پنجاب میں پولیس مقابلے میں 180 افراد مارے گئے۔

تفصیلی رپورٹ کے مطابق روایتی جرائم، قتل، عصمت دری، اغوا، راہزنی، ڈکیتی، چوری، کار چھیننے وغیرہ میں تواتر بھی رہا اور واردات کا تھوڑا سا بدلا ہوا انداز بھی شامل ہوا جو باعث تشویش ہے۔

کراچی میں سیاسی وجوہ کی بنا پر قتل کیے جانے والوں سے بعد از مرگ بھی غیر معمولی سلوک یوں کیا گیا کہ انہیں مارنے کے بعد ان کے جسم کے ٹکڑے کیے گئے یا ویسے ہی بوریوں میں بند کر کے لاشیں سر عام پھینک دی گئیں۔ بعض اوقات مرنے والے کے کسی فعل کے حوالے سے ایک چٹ پر کچھ لکھ بھی دیا جاتا گیا مثلاً فلاں افسر یا وزیر کے

لئے۔ ''عید کا تحفہ'' پنجاب میں بھی بعض ایسی وارداتیں ہوئیں۔ جن سے قیاس کیا جاتا ہے کہ بہیمانہ سلوک کا یہ اظہار کراچی سے باہر نکل کر دوسرے علاقوں میں بھی گیا یا یہ کہ کراچی کے سیاسی قاتل پنجاب کے علاقوں میں بھی گئے۔

- ☆ تاوان یا بدمعاشی کا ٹیکس وصول کرنے کی وارداتیں بڑھ گئیں۔
- ☆ اسلام آباد میں سنگین جرائم میں اضافہ کا رجحان رہا۔
- ☆ بچوں (خصوصاً کم سن بچوں) پر تشدد کی وارداتیں پورے ملک میں بڑھ گئیں۔
- ☆ اشتہاری اور مفرور مجرموں نے زیادہ تعداد میں قبائلی علاقوں میں پناہ لینا شروع کر دی۔ پولیس کے اپنے کہنے کے مطابق ایسے گیارہ سو مجرم قبائلی علاقے میں پناہ لئے بیٹھے ہیں۔
- ☆ بعض وارداتوں میں مجرموں نے پولیس کی وردیاں پہنی ہوئی تھیں۔ ہو سکتا ہے کہ خود پولیس والے ہی جرائم کے مرتکب ہوئے ہوں، (چند وارداتوں کے بارے میں وثوق سے بتایا گیا کہ پولیس والے ان میں ملوث تھے۔ بعض پکڑے گئے اور ان کے خلاف کارروائی بھی ہوئی) بعض زیادہ سنسنی خیز جرائم بھی ہوئے۔
- ☆ ملک کے صدر مقام اسلام آباد کے قریب اسلام آباد، مری روڈ پر راہزنوں نے رات کے وقت مسافروں کو لوٹنا شروع کر دیا۔ کوئی سو کے قریب بسیں ویگنیں کاریں لوٹی گئیں اور یہ کارروائی کوئی ڈیڑھ گھنٹے تک جاری رہی۔ ملزموں نے ہوا میں فائرنگ بھی کی اور جاتے ہوئے اپنے سردار کالا بھگیاڑ کی طرف سے پولیس کو چیلنج بھی دے گئے۔
- ☆ ماڈل ٹاؤن لاہور کی ایک مارکیٹ میں ایک تاجر کو گولی مار کر ملزم اس کی کار لے اڑے۔
- ☆ لاہور کے ایک سکول کے باہر دو سیاسی جماعتوں کے نونہالوں میں گولیوں کے تبادلہ میں ایک طالب علم مارا گیا۔
- ☆ گجرانوالہ میں انسداد دہشت گردی کی عدالت کے باہر فائرنگ سے ایک شخص ہلاک اور سات زخمی ہو گئے۔

☆ لاہور کے علاقہ گوالمنڈی میں ایک شخص کو جو ایک مقدمہ میں گواہ تھا گولی مار کر گواہی کو ختم کر دیا گیا۔

☆ اسلام آباد کے دامن کوہ میں ایک نوبیاہتا کیپٹن کو گولی مار دی گئی۔

☆ لاہور کے تاجر کو دوپہر کے وقت گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا اور مجرم پینتالیس لاکھ روپے لے گئے۔

☆ لاہور کے محلّہ اسلام پورہ میں زیورات کی دوکان میں ڈکیتی ہوئی۔

☆ جیل روڈ پر دن دیہاڑے واردات میں ملزم (35) پینتیس لاکھ روپے لوٹ کر لے گئے۔

☆ اسلام آباد۔فیصل آباد کی فضائی پرواز کے دوران دو مسافروں نے قومی اسمبلی کے رکن الیاس جٹ کے گلے پر تیز دھار والی قینچی پھیر دی، تاہم طیارے کے محافظوں نے دونوں کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ اس کے بعد پی آئی اے نے دستی سامان میں قینچی رکھنے پر بھی پابندی عائد کر دی۔

☆ نوجوان اداکارہ نادرہ کو لاہور کی ایک مارکیٹ کے قریب گولی مار کر قتل کر دیا گیا۔ اسی شہر میں ٹیلی ویژن کی ایک اداکارہ نینا کو بھی قتل کر دیا گیا۔

☆ فوج کے میجر سجاد نصیر کو چک لالہ (راولپنڈی) میں قتل کر دیا گیا اس کی نعش اس کی کار سے برآمد ہوئی۔

☆ بہاول پور سے قومی اسمبلی کے رکن کے والد کو قتل کر دیا گیا، قتل کے شبہ میں ایک سابق ایم این اے کو گرفتار کر لیا گیا۔

☆ لیاقت پور (بہاول پور) میں بس کے مسافروں کو لوٹا گیا۔

☆ مانانوالہ (شیخوپورہ) میں بس کے مسافروں کو لوٹا بھی گیا اور مارا بھی گیا۔

☆ آزاد کشمیر سے لاہور آنے والی بس کے مسافروں کو سرائے عالمگیر کے پاس لوٹ لیا گیا۔

☆ شاہراہ لاہور۔ اسلام آباد پر بسیں لوٹنے والے سرگرم رہے ایک بس کو گجرات کے قریب لوٹا گیا۔ لاہور۔ ملتان، ساہیوال، لاہور اور لاہور سے فیصل آباد روٹس پر بھی متعدد بسیں لوٹی گئیں۔

☆ راولپنڈی سے ڈیرہ اسمٰعیل خان جانے والی بس بھی لوٹی گئی۔

☆ راہزنوں نے ملتان میں سرائے سدھو کے قریب بس پر فائرنگ کر دی جس سے ایک مسافر ہلاک اور تین زخمی ہوگئے۔ تھوڑی دیر پہلے ہی ان ڈاکوؤں کا ایک پولیس سب انسپکٹر سے مقابلہ ہوا تھا۔

☆ راہ زنوں نے مانگا روڈ (لاہور کے قریب) کیش لے جانے والی وین کو روکا اور ایک کروڑ روپیہ لے گئے۔

دہشت گردی:

کراچی میں حکومت اور شہریوں نے دہشت گردی کی کاروائیاں مسلسل کیں۔ بعض اہم واقعات یہ ہیں:

☆ لیاقت آباد کی سپر مارکیٹ میں دس سرکاری ملازمین کو فائرنگ سے ہلاک کر دیا گیا۔

☆ اورنگی میں بارہ افراد کو زبردستی ایک بس میں سوار کرایا گیا اور پھر قتل کر دیا گیا۔

☆ ککھّی گراؤنڈ کو ٹارچر کیمپ کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا۔

☆ 14 اگست (یوم آزادی) کو قائداعظم کے مزار پر نیوی کے ایک گارڈ کو گولی مار دی گئی۔

☆ فیڈرل بی ایریا میں سندھ کے وزیراعلیٰ (سابق) کے بھائی کی کار فائرنگ کر کے اسے قتل کر دیا گیا۔

☆ مسجد کے پاس بم پھٹنے سے تقریباً ایک درجن افراد جان بحق ہوئے۔

☆ سندھ اسمبلی کے احاطے میں بم کا دھماکہ ہوا۔

☆ ایک غریب بستی میں روزگار کے لئے باہر سے آئے ہوئے آٹھ مزدوروں کو ذبح کر دیا گیا۔

☆ کلفٹن کے علاقے میں راکٹ گرا، ایک بچہ ہلاک ہوگیا۔

☆ امریکی قونصلیٹ کے دفتر کی گاڑی پر گولیاں چلائی گئیں، امریکی سٹاف کے دو رکن ہلاک ہوگئے۔ امریکی قونصلیٹ میں انسداد منشیات سے متعلق پاکستان کے

ملازم (سابق فوجی) کو ناظم آباد میں کار سے باہر آتے ہی گولی مار دی گئی۔

☆ ایک نسل پرست تنظیم کے دفتر پر حملہ کر کے تیرہ آدمیوں کو قتل کر دیا گیا۔

☆ مسلم اقلیتی فرقہ کی دو مساجد پر حملہ کر کے بیس افراد کو مار دیا گیا۔

☆ ایک مکان میں سات افراد کو ذبح کر دیا گیا۔

☆ فنڈ اکٹھا کرنے کے لئے مذہبی جماعت کی طرف سے لگائے گئے کیمپ پر حملہ کر کے بیس افراد کو مار ڈالا۔

☆ پشاور میں دھماکے۔

☆ دسمبر کے مہینے میں ایک بارونق مارکیٹ میں ایک سٹور کے سامنے گاڑی میں فٹ کیا گیا بم پھٹا جس سے کوئی چالیس کے قریب افراد جاں بحق ہوئے۔ ہدف کوئی خاص فرقہ، طبقہ، فرد یا گروہ نہیں بلکہ پاکستانی معاشرہ تھا۔

☆ ایک افغان باشندہ ٹیلی گراف آفس میں بم نصب کر رہا تھا کہ بم پھٹنے سے خود ہلاک ہو گیا۔

☆ ایک بم پولیس سٹیشن کے قریب پھٹا۔

☆ ایک اور بم ٹریفک سگنل کے قریب پھٹا۔

☆ سیشن کورٹ کے پاس بم پھٹا۔

☆ سپورٹس سٹیڈیم کے گیٹ کے پاس بم کا دھماکہ ہوا۔

☆ پولیس پارٹی پر بم پھینکا گیا۔ دو پولیس والے زخمی ہوئے۔

☆ ایک بم بس سٹاپ پر پھٹا۔

☆ بم دھماکہ زرعی یونیورسٹی کی لائبریری میں ہوا۔

☆ ڈیفنس کالونی میں بم پھٹا۔

☆ چوک یادگار میں بم کا دھماکہ ہوا۔

پنجاب میں دھماکے:

پنجاب میں بس سٹاپ پر بم کے دھماکے ہوئے مگر یہ واردات اس صوبے میں سندھ اور سرحد کے مقابلے میں کم ہوئی۔

منشیات سے متعلق جرائم:

منشیات کے خلاف قانون سازی کو مؤثر بنایا گیا اور سات سمگلروں کے بعد مزید انیس افراد کے اثاثے منجمد کیے گئے۔ دو سمگلروں کو امریکہ کے حوالے کیا گیا اس طرح 91 سے اب تک امریکہ کے حوالے کیے جانے والے منشیات کے سمگلروں کی تعداد دس ہو گئی۔ بعض کے مقدمات اعلیٰ عدالتوں میں چل رہے ہیں۔ اس لئے انہیں امریکہ کے حوالے نہیں کیا گیا۔ ایک سابق ایم این اے ایوب آفریدی (قبائلی علاقہ سے) پاکستان سے نکل گیا اور خود کو امریکی حکام کے سامنے پیش کر دیا۔

قبائلی علاقہ کی خیبر ایجنسی میں جب منشیات کے خلاف مہم چلائی گئی تو اس علاقے کے علما نے ایک محاذ بنا کر حکومت کے اقدام کے خلاف سخت مزاحمت کی۔ تین افراد مارے گئے۔ ایبٹ آباد میں ایک اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس، ایک کانسٹیبل اور امریکی سفارت خانہ میں منشیات سے متعلق ایک افسر مارا گیا۔

منشیات کی نقل و حمل، تجارت، سمگلنگ وغیرہ کے الزام میں ایک ایم این اے، ایک سابق ایم پی اے، ایک وکیل سمیت پاکستانیوں کے ساتھ ساتھ 41 غیر ملکی باشندے بھی پکڑے گئے ان میں 27 نائیجیریا کے، 6 تنزانیہ کے، ایک آئرلینڈ کا اور ایک ایک عرب امارات، صومالیہ اور امریکہ کا تھا۔

عورتوں کے خلاف:

عورتوں کے خلاف جرائم کی تعداد بے شمار ہے مگر اس سال سترہ ہزار کے قریب رپورٹ کیے گئے۔ پولیس والوں کا کہنا ہے کہ صرف 35 فی صد جرائم کی اطلاع پولیس کو ملتی ہے باقی معروف معاشرتی وجوہ کی بنا پر سامنے نہیں لائی جاتیں۔ عورتوں کی عصمت دری کے واقعات بھی بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ عورت کی کمزوری اور بے بسی کے باعث مجرم نڈر ہو کر یہ واردات کرتے ہیں۔ کمیشن نے حیدر آباد اور اندرون سندھ میں بے آبرو ہونے والی 54 خواتین کے بارے میں ایک تجزیہ دیا۔ جو یوں ہے۔

بحساب عقیدہ مذہب

مسلم	غیر مسلم	کل

38	16	54

بحساب عمر

بالغ	18/16 سال کی عمر	10/15 سال کی عمر	6 سے 9 سال
33	6	12	3

جو بے آبرو کرنے کے بعد مار دی گئیں......2۔ ایک کی عمر سات برس دوسری کی دس برس۔

بے آبرو کرنے والے افراد کی سماجی حیثیت۔

بااثر زمیندار	14
قانون نافذ کرنے والے محکموں کے ملازمین	9
پولیس کی وردی میں	4
باپ	1
زمیندار سرکاری افسر کی شہ پر	1
عام جرائم پیشہ	22
نامعلوم	3
ٹوٹل	54

کمیشن کے شعبہ خواتین نے سال کی آخری سہ ماہی میں پنجاب میں اخبارات میں شائع ہونے والی 180 وارداتوں کا تجزیہ کیا جو یوں ہے۔

عمر کے اعتبار سے:

وارداتیں	16/18 سال	10/15 سال	5/9 سال
134	6	23	17
بیچ دی گئیں		1	
گونگی بہری		1	
باپ یا سوتیلے باپ کا نشانہ		2	

عصمت دری کے بعد مار دی گئیں یا مر گئیں۔ 9
(عمر 14,13,11,10,9,8,7,6,5)

1995ء میں کراچی میں ایم کیو ایم (دونوں دھڑوں) کی طرف سے پر تشدد کارروائیاں ہوتی رہیں۔ گھات لگا کر پولیس اور رینجرز کو مارنے کی وارداتیں بھی ہوئیں، مخبروں سے بھی اسی طور پر نمٹا گیا اور صرف پولیس اور رینجرز کے 242اہل کار اور افسر مارے گئے جبکہ پولیس کے ہاتھوں سرعام ایم کیو ایم اور ان کے ساتھی مارے گئے اور بہت سے وہ سرگرم مارے گئے جنہیں پولیس نے حراست میں لے رکھا تھا۔حراست میں مارے جانے والوں غیر معمولی تعداد کی بنا پر پولیس کی طرف سے پیش کی جانے والی توجیہات بھی عام لوگ نظر میں مشکوک ہوگئیں۔توجیہہ یہ تھی کہ ملزم نے بھاگنے کی کوشش کی اور اس طرح مارا گیا، دوسرا یہ کہ ملزم او راس کے ساتھیوں نے پولیس کا مقابلہ کیا اور مارا گیا، تیسرے یہ کہ ملزم کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا جانا تھا کہ ملزم یا ملزموں کے ساتھیوں نے حملہ کیا اسے یا انہیں بھی مار دیا اور پولیس والے بھی زخمی یا ہلاک ہوئے۔

کراچی سے ہٹ کر ایک عجیب سا قصہ راولپنڈی میں ہوا۔ ڈکیتی کے چار ملزم راولپنڈی کی کچہری میں پیشی پر لائے گئے۔ انہوں نے ایک پولیس والے کوقتل کیا دوسرے کو زخمی کیا اور کار میں سوار ہوکر فرار ہو گئے۔مگر ان کے پیچھے ایک پولیس پارٹی لگ گئی۔شہر سے کچھ فاصلے پر سواں نالہ کے پاس پولیس والوں نے ملزمان کو جالیا اور گرفتار کر لیا۔ اچانک ایک اور پارٹی آئی او راس نے پولیس پر حملہ کر دیا۔ نتیجے میں چاروں زیرحراست ملزمان مارے گئے۔ اگر فرض کریں کہ یہ پولیس میں زیرحراست افراد کو بالا ارادہ مار دینے کی کارروائی ہےتو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پولیس کے ایک کانسٹیبل کو ہلاک اور دوسرے کو زخمی کیوں کیا گیا؟

دوسری بات یہ ہے کہ بلاشک پولیس بے شمار ماورائے عدالت ظالمانہ کارروائیاں کرنے کی مرتکب (بلکہ عادی) ہے مگر کراچی میں بھی ان کے اڑھائی سو کے قریب افراد کے مارے جانے کو بھی پہلو بہ پہلو رکھ کر دیکھا جانا چاہیے جیسے راولپنڈی کی متذکرہ بالا واردات کے حوالے سے تجویز کیا گیا ہے۔ بہرطور پولیس کی حراست میں مارے

جانے والوں میں سے بعض کی داستان تو ایک سی ہے مگر بہت سوں کا معاملہ مختلف ہے مثلاً فاروق دادا کو تو اس لئے مار دیا گیا کہ وہ ایم کیو ایم کا سرگرم لیڈر بھی تھا اور اس پر قتل کی وارداتیں کرنے کا الزام بھی تھا مگر سندھ کے در و افتادہ گاؤں میں ایک باپ بیٹے کو بیلوں کی جوڑی کی چوری کے الزام میں پکڑا گیا دونوں کو مار دیا گیا یا مر گئے۔ یہ معاملہ بھی متقاضی ہے کہ رپورٹ میں سے واقعات کی نوعیت کے حوالے سے تفصیل دی جائے۔

☆ لاہور میں عاطف چودھری اور اس کے ساتھی آغا نوید کی ہلاکت کا قصہ ایسا تھا کہ کوئی اس پر یقین نہیں کر سکتا تھا۔

☆ فیصل آباد حوالات میں ایک بائیس سالہ نوجوان محمد ادریس قتل ہو گیا پولیس کا کہنا تھا کہ محمد ادریس نے ریزر کے ساتھ اپنا گلہ کاٹ لیا۔ سوال یہ ہے کہ ریزر اس کے پاس کیسے آیا؟

☆ چوری کے الزام میں ایک شخص خدا بخش پکڑا گیا، جھنگ کی حوالات میں مر گیا۔

☆ شاہ پور کی حوالات میں محمد انور مر گیا۔

☆ فیصل آباد پولیس کی زیر حراست محمد شفیق کی موت اتنی مشکوک تھی کہ شور پڑنے پر سٹاف کو معطل کرنا پڑا۔

☆ لاہور میں گلشن راوی کی حوالات میں شبیر پراسرار حالات میں مر گیا یا مارا گیا۔

☆ ساہیوال جیل میں تین قیدی مر گئے۔

☆ لوہاری پولیس سٹیشن لاہور میں نشتر کالونی کا نعمت مارا گیا۔

☆ تھانہ مناواں (لاہور) کی حوالات میں ذوالفقار کی پراسرار موت پر ایک پولیس اہل کار کو گرفتار کرنا پڑا۔

☆ توہین رسالت کے الزام میں مختار مسیح لاہور میں حوالات میں تھا اور مردہ پایا گیا، پولیس کا کہنا تھا کہ وہ دل کا دورہ پڑنے کے باعث مر گیا۔ گھر والوں نے ہائی کورٹ میں فریاد کی، عدالت کی ہدایت پر قتل کا مقدمہ درج ہوا۔

سندھ میں:

☆ اسمٰعیل خضحیلی قتل کے جرم میں پکڑا گیا، ٹنڈو الہ یار پولیس کی حوالات میں مردہ

پایا گیا۔

☆ پی پی پی، شہید بھٹو گروپ کا کارکن علی اکبر کلہوڑو کو نوشہرو فیروز پولیس نے گرفتار کیا۔ آٹھ دن بعد ضلع نواب شاہ سی آئی اے سنٹر میں مر گیا۔

☆ ڈاکو بشیر ماچھی کے بارے میں شک تھا کہ اس نے پی آئی اے کے سٹاف کے ارکان کو اغوا کر لیا ہے۔ اس کے ساٹھ سالہ عزیز فتح محمد ماچھی کو بھی اسی شبے میں گرفتار کر لیا گیا۔ وہ تفتیش کے دوران مارا گیا۔

☆ پیر جو گوٹھ (ضلع خیر پور) کے تھانے میں علی بخش کنہڑ کو چوری کے الزام میں لایا گیا۔ بارہ دن بعد مارا گیا۔

☆ 35 برس کا عبدالرشید بنگالی غیر قانونی طور پر سرحد عبور کر کے آیا عمر کوٹ پولیس نے پکڑ لیا۔ ایک سال وہیں رہا اسی دوران مر گیا، اس کے ساتھیوں کا کہنا ہے کہ وہ تشدد کی وجہ سے ہلاک ہوا۔

☆ لاڑکانہ کے ایک گاؤں میں پولیس نے ولی محمد مگھاری کو گرفتار کیا، پولیس کی گاڑی میں بیٹھنے کے لئے کہا، انکار پر ایک ہیڈ کانسٹیبل نے اتنا مارا کہ موقع پر ہی ہلاک ہو گیا۔

☆ قاسم آباد (حیدر آباد) کی پولیس نے پنہوز بلیدی کو زمین کے جھگڑے پر گرفتار کیا مگر جلدی ہی مر گیا اور مبینہ طور پر پولیس کے تشدد کے باعث۔

تشدد کے باعث:

☆ کاشمور پولیس نے معمولی شکایت پر گل نیاز پٹھان کو پکڑ لیا۔ تشدد کیا۔ پھر ہسپتال منتقل کیا جہاں وہ مر گیا۔ پانچ پولیس والوں اور دو عورتوں کے خلاف مقدمہ درج ہوا۔

☆ میر پور میتھلو میں اباڑو ایکسائز پولیس نے اللہ بخش کو پکڑا، تشدد کیا، اس نے خون تھوکنا شروع کیا تو اسے گھر پھینک گئے۔ اگلے روز وہ مر گیا۔

☆ پی پی پی۔ شہید بھٹو گروپ کے میر غلام علی کو سنٹرل جیل سکھر میں قید کیا گیا پھر اچانک اسے ہسپتال پہنچا دیا گیا جہاں وہ مر گیا۔ خاندان والوں کا کہنا ہے کہ ان

کے پاس ثبوت ہے کہ مرحوم کو زہر دیا گیا تھا۔

☆ قربان نور یجو کو سکھر کی سپیشل کورٹ نے دہشت گردی کے جرم میں موت کی سزا دی، اسے ایک اغوا کے کیس کے سلسلہ میں تفتیش کے لئے سکھر جیل سے خیر پور تھانے لایا گیا۔ پھر اسے ہسپتال منتقل کر دیا گیا جہاں وہ مر گیا۔ وارثوں کا کہنا ہے کہ اس پر تشدد کیا گیا تھا اور جسم پر نشانات بھی تھے۔

☆ دادو کے یوسف جمالی کو بدنام ڈاکو حنیف چانڈیو سمجھ کر گرفتار کیا گیا۔ بعد میں بتایا گیا کہ چانڈیو پولیس مقابلے میں مارا جا چکا تھا۔

☆ اوندال کوری کو بی سیکشن سکھر پولیس نے گرفتار کیا، آباد پولیس سکھر کے حوالے کیا۔ پھر اسے سعید آباد کے جنگل میں مار دیا گیا۔ پولیس کا کہنا ہے کہ پولیس کو ڈاکوؤں کے ایک ڈیرے پر لے جا رہا تھا کہ ڈاکوؤں نے فائرنگ کر کے اسے ہلاک کر دیا۔

☆ سکھر میں ایم کیو ایم کا سرگرم کارکن اصغر رانگھڑ موٹر سائیکل پر جا رہا تھا جب پولیس نے اسے گولی مار کر ہلاک کر دیا اور کہا کہ وہ پولیس مقابلہ میں مارا گیا۔ چشم دید گواہوں نے کہا کہ پولیس غلط کہتی ہے۔

☆ چھٹو کھوسو او اس کا کمسن بیٹا پٹھان (10 سال) کو دادو میں ان کے گاؤں سے گرفتار کیا گیا۔ چار دن بعد پولیس نے کہا کہ کھوسے پولیس مقابلے میں مارے گئے۔ گاؤں والوں نے پولیس پر غلط بیانی کا الزام لگایا۔

☆ عبدالرحمٰن سکھر شہر میں موٹر سائیکل پر جا رہا تھا پولیس نے فائرنگ کی، مارا گیا۔ پولیس نے کہا اسے رکنے کا اشارہ دیا گیا، نہیں رکا، اس نے پولیس پر فائر کر دیا یوں مقابلے میں مارا گیا۔

☆ دیدار آ گانی پر ڈکیتی کا شبہ تھا۔ پتہ چلا کہ پولیس مقابلے میں مارا گیا، اس کے باپ نے کہا کہ آ گانی دریا میں نہا رہا تھا جب پولیس نے اسے گولی مار دی۔

☆ گاؤں دوست محمد کھوسہ کا سترہ سالہ طالب قادر بخش مری اپنے آموں کے باغ میں بیٹھا تھا، ادھر سے پولیس گزری، اس نے مری کو بلایا، لڑکا خوف کھا گیا اور بھاگنا شروع کر دیا، پولیس نے گولی چلا کر ڈھیر کر دیا۔

☆ سہراب رند اور جمال رند کو پولیس مقابلے میں ماردیا۔ دونوں کو کچھ دیر پہلے کوٹڑی پولیس نے گرفتار کر رکھا تھا۔

☆ ایک دولہا اشرف پنوار اور اس کا سترہ سالہ رشتہ دار اکبر پنوار حیدر آباد کے ایک شادی ہال میں پولیس کی فائرنگ سے مارے گئے۔ پولیس کا کہنا ہے کہ وہ ایک جرائم پیشہ بابو میرانی کے تعاقب میں شادی ہال پہنچے جہاں بابو نے پولیس پر فائرنگ کی جس کی زد میں آکر دولہا اور اس کا عزیز مارے گئے۔ شدید احتجاج پر عدالتی تحقیقات شروع کرائی گئی۔

☆ اقبال اور محمد اقبال کو رانی نگر پارکر کی پولیس پارٹی کی فائرنگ سے مارے گئے، وجہ زمین کا کوئی جھگڑا تھا۔

☆ خان پور میہٹر پولیس نے ذوالفقار پنجابی کو گرفتار کیا، پھر معلوم ہوا کہ پولیس مقابلے میں مارا گیا ہے۔ پولیس کا کہنا تھا کہ وہ پولیس کو اسلحہ کی برآمدگی کے سلسلے میں ایک جگہ لے گیا، جہاں اس کے اپنے ساتھیوں نے پولیس پر حملہ کر دیا۔ فائرنگ میں ذوالفقار مارا گیا۔ مقامی لوگوں کا کہنا ہے کہ ذوالفقار کو ان پولیس والوں نے مروایا جن کے ساتھ اس کے تعلقات تھے اور جن کے راز اس کے پاس تھے۔

جیل میں:

☆ سنٹرل جیل سکھر میں ایک قیدی دل مراد مگسی پر اسرار حالات میں مر گیا۔ عزیزوں نے کہا کہ جیل والوں نے اس پر تشدد کر کے اسے ماردیا اور لاش عزیزوں کو دینے کی بجائے ایدھی ٹرسٹ کے ذریعے دفنا دی۔ ایدھی ٹرسٹ سے کہا کہ مرنے والا لاوارث ہے۔

☆ پنوں عاقل کی پولیس نے بیس سالہ عبدالستار مہر کو بیلوں کی جوڑی چوری کرنے کے الزام میں گرفتار کیا۔ تین دن بعد کہا گیا کہ وہ تھانے سے بھاگ نکلا تھا اور اس نے دریا میں چھلانگ لگا دی تھی۔ خاندان کا کہنا ہے کہ اسے تشدد کر کے ہلاک کیا گیا، پھر لاش دریا میں پھینک دی۔

☆ ریاست مری کو ایک پولیس والے کے قتل کے الزام میں نواب شاہ کی بود لو ڈاہری کی پولیس نے گرفتار کیا، کچھ عرصہ بعد اس کی لاش دادو ریلوے سٹیشن کے قریب ملی۔ خاندان والوں کا کہنا ہے کہ پولیس نے تشدد سے اسے مار دیا اور لاش ریلوے سٹیشن کے قریب پھینک دی۔

پولیس والوں کے خلاف

☆ لاہور ہائی کورٹ نے سی آئی اے کے ایک انسپکٹر کے خلاف مقدمہ درج کرنے کی ہدایت کی، انسپکٹر نے غیر قانونی طور پر چھاپہ مارا، گرفتاری کی اور آدمی کو غیر قانونی حراست میں رکھا۔

☆ ایک مقدمے کا فیصلہ کرتے ہوئے لاہور ہائی کورٹ نے ایک اے ایس آئی کو ہزار روپے جرمانہ کیا اور عدالت کی برخاستگی تک عدالت میں کھڑے رہنے کی سزا دی۔

☆ لاہور ہائی کورٹ نے ایک مقدمہ میں انکوائری کا بھی حکم دیا اور مقدمہ ایک افسر سے دوسرے افسر کو تبدیل کرنے کا۔ ایس پی کی رپورٹ عدالت نے مسترد کر دی اور ڈی آئی جی سے کہا کہ وہ رپورٹ پیش کرے۔

☆ لاہور ہائی کورٹ کے سامنے درخواست پیش ہوئی کہ پولیس نے ایک عورت اور اس کے بیٹے کو حراست لے رکھا ہے، عورت کو تین دن بعد رہا کر دیا گیا مگر بیٹا اب بھی حراست میں ہے۔ بیلف بھیجا گیا جس نے بچے کو برآمد کر لیا۔ کورٹ نے ایس ایچ او کے خلاف حبس بے جا کے جرم میں مقدمہ درج کرنے کی ہدایت کی۔

☆ ڈیرہ غازی خان میں حاجی پور پولیس نے ایک ہفتہ روزہ اخبار کے ایڈیٹر کے خلاف جعلی مقدمہ بنایا۔ ہائی کورٹ نے اے ایس آئی کے خلاف مقدمہ درج کرنے کا حکم دیا۔

☆ ریلوے پولیس جیکب آباد کے ایس ایچ او نے کسی شخص کو حبس بے جا میں رکھا جس پر اسے گرفتار کر لیا گیا۔

☆ سی آئی اے پولیس لاہور نے ایک لڑکے کو حبس بے جا میں رکھا۔ ہائی کورٹ لاہور نے بیلف کے ذریعے لڑکا برآمد کرایا اور پولیس کے خلاف مقدمہ درج کرنے کا حکم دیا۔

☆ جھنگ کے ارشد رفیق کو گرفتار کر کے تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ ہائی کورٹ کے حکم پر بیلف نے برآمد کیا، وہ زخمی بھی تھا اور ہاتھ پاؤں بھی بندھے ہوئے تھے، تھانے کے کسی رجسٹر میں اس کا کوئی اندراج نہیں تھا۔ میڈیکل رپورٹ میں تصدیق کی گئی کہ وہ شدید زخمی ہوا ہے۔

☆ گوجرانوالہ کے ایک زمیندار کے گھر سے بیلف کے ذریعے ایک عورت سکینہ برآمد کی گئی جس کے پاؤں میں بیڑیاں تھیں۔ سکینہ نے الزام لگایا کہ زمیندار اس سے زبردستی کرتا رہا ہے اور اس کے ظلم کی وجہ سے اس کا دس دن کا بچہ بھی مر گیا ہے۔ اس نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو بتایا کہ اس کا خاوند اور چار بچے بھی زمیندار کی حبس بے جا میں ہیں، زمیندار کا کہنا تھا کہ اس خاندان نے اس سے قرضہ لیا تھا۔

☆ لاہور کے ایک مجسٹریٹ نے دو پولیس سب انسپکٹروں اور دو کانسٹیبلوں کے وارنٹ اس لئے جاری کر دیئے کہ وہ ایک مقدمہ میں گواہی کے لئے گزشتہ چار سال سے حاضر نہیں ہو رہے تھے۔

☆ لاہور ہائی کورٹ نے شیخوپورہ کے اک ایس ایچ او کو اس شخص کو پانچ ہزار روپے ادا کرنے کا حکم دیا جسے اس نے حبس بے جا میں رکھا تھا۔

☆ لاہور کے سی آئی اے کے سیل میں ایک عورت کو محض اس لئے محبوس رکھا گیا کہ وہ کسی مشتبہ ملزم کی عزیزہ تھی۔ اس عذاب سے بچنے کے لئے اس نے دوسری منزل سے چھلانگ لگائی جس میں اس کی ٹانگ بھی ٹوٹ گئی۔

☆ نارووال کے ایک ایس ایچ او نے ایک عورت اور مرد کو زنا کے الزام میں گرفتار کر لیا اور وجہ بتائی کہ وہ گشت پر تھا، اس نے ایک گھر کے کمرے کے دروازے کے سوراخ سے اندر جھانکا تو دونوں رنگ رلیاں منا رہے تھے۔ ہائی کورٹ نے اسے سخت سرزنش کی اور ڈی آئی جی سے کہا کہ اس پولیس افسر کے خلاف

تحقیقات کی جائے۔

☆ سندھ میں پیپلز پارٹی کا ایک ایم پی اے علی محمد ہنگورو جو پارٹی چھوڑ چکا تھا اور مرتضیٰ بھٹو کے گروپ میں شامل ہو گیا تھا، کینسر کے باعث پولیس کی حراست میں ایک ہسپتال میں مر گیا۔ اس کی بیماری کے بارے میں کوئی شبہ نہیں تھا مگر حکومت نے سنی ان سنی کر دی، سرکاری ڈاکٹر نے بھی رپورٹ دی کہ خطرے کی کوئی بات نہیں مگر کینسر اس کو بڑی تیزی سے کھا گیا۔

☆ ایک مشتبہ شخص کی تصویر لاہور کے اخبار میں چھپی، اسے ننگا کر دیا گیا تھا، پھر ہاتھ پاؤں باندھ کر بانس سے لٹکایا گیا تھا۔ تشدد کرنے کا سامان بھی تصویر میں نظر آ رہا تھا۔ وکیلوں نے لاہور ہائی کورٹ کو درخواست گزاری، لاہور ہائی کورٹ کو بتایا گیا کہ ذمہ دار پولیس والوں کو معطل کر دیا گیا ہے اور ان کے خلاف مقدمہ بھی درج کر لیا گیا ہے ہائی کورٹ نے مقدمہ داخل دفتر کرتے ہوئے پولیس کی سرزنش بھی کی۔

☆ کراچی میں جب بستیوں اور محلوں کو گھیر کر تلاشی لی گئی تو مرد لوگوں کو احاطوں میں دھکیل دیا گیا کئی ایک کی آنکھوں پر ان کی اپنی قمیض باندھ دی گئی۔ اس ضمن میں نوجوانوں کو بلا کسی جواز کے گرفتار کر کے پوچھ گچھ کی گئی۔

☆ ایک زیر مقدمہ گروپ کو کراچی کی عدالت میں یوں پیش کیا گیا مگر ان کی آنکھوں پر پٹی بندھی تھی اور ان کے جسموں پر زخموں کے نشانات تھے۔

☆ اخبار میں ملتان کے ایک ایس ایچ او کے بارے میں خبر چھپی۔ اس نے چھ آدمیوں کو حراست میں لیا، پھر انہیں ان کے گھروں میں لے گیا۔ ان کے کپڑے پھاڑ دیئے، انہیں مارا اور ان کے منہ میں جوتے ڈالے انہیں کتوں کی طرح بھونکنے کا حکم دیا اور دو کلو میٹر تک جانوروں کی طرح چلنے کے لئے کہا۔ لاہور ہائی کورٹ ملتان نے اس خبر کا نوٹس لیا ایس ایچ او کو مع چھ افراد کے طلب کیا۔ ان افراد نے پریس رپورٹ کی تصدیق کی۔ عدالت نے حکم دیا کہ انہیں حوالات میں رکھ لیا جائے ایس ایچ او نے آئندہ ایسا نہ کرنے کا یقین دلایا اور واپس ڈیوٹی پر چلا گیا۔

☆ لاہور کے ایڈیشنل سیشن جج نے استغاثہ کی کھچائی کی۔ اچھرہ پولیس نے 1991ء میں ایک شخص افضل وسیم کو گرفتار کیا۔ کسی عدالت میں کوئی چالان پیش نہیں کیا۔ اس عرصے میں کاغذات ہی مکمل نہیں ہوتے تھے اور مجسٹریٹ ملزم کو واپس جیل بھیج دیا کرتا تھا۔ ایڈیشنل سیشن جج نے افضل وسیم کو عبوری ضمانت دے دی۔

☆ لاہور ہائی کورٹ نے باٹا پور کے ایس ایچ او کی گرفتاری کا حکم دیا جو عدالت میں حاضر نہیں ہو رہا تھا۔

☆ پاکستان بھر میں عام شکایات ہے کہ زیر سماعت مقدمات کے اسیر قیدیوں کو ایک یا دوسرے بہانے عدالت میں ہی پیش نہیں کیا جاتا۔ اس ضمن میں میجر آفتاب کی مثال نمایاں ہے وہ المرتضٰی فائرنگ کیس میں ملوث تھا۔ متعدد تاریخوں پر اسے عدالت میں نہیں لے جایا گیا اور بہانہ یہ کہ گاڑی نہیں اور ایک بار گاڑی تھی مگر اس میں پیٹرول نہیں تھا۔

رپورٹ میں متعدد ایسی مثالیں بھی دی گئی ہیں کہ جائے وقوعہ کے بارے میں دو یا تین پولیس سٹیشنوں کے درمیان اس بات پر تنازعہ چلتا رہا کہ آیا ان کی حد میں ہے یا نہیں۔ اس دوران یوں بھی ہوا کہ زخمی ہونے والا بروقت ہسپتال نہ پہنچایا جا سکا اور وہ جانبر نہ ہو سکا۔ خود پولیس اور رینجرز کے درمیان بھی خونیں جھڑپ ہوگئی۔ نارنگ منڈی کی پولیس نے کہا کہ انہوں نے رینجرز کو مشتبہ حالت میں سڑک پر لکڑی لادتے دیکھا تھا۔ روکا تو جھگڑا ہوا۔ فائرنگ تک بات گئی اور دو رینجرز مارے گئے۔ عدالت تک معاملہ پہنچا۔ پھر ایک اے ایس آئی اور چھ کانسٹیبل گرفتار ہو گئے بعد میں رینجرز نے بھی شہر کو گھیر لیا۔

کہا جا سکتا ہے کہ رپورٹ میں مواد یک طرفہ ہے۔ یعنی جس انداز میں اخباروں میں آیا اور چھپا اور اس کو جس پس منظر میں رکھ کر دیکھا گیا وہ یک طرفہ ہے۔ ہو بھی سکتا ہے کہ بعض معاملات میں کچھ اونچ نیچ ہوگئی ہو مگر پولیس کو جس انداز میں فرائض انجام دینے چاہیں اور اس پر جو قانونی، اخلاقی اور آئینی تقاضے عائد ہوتے ہیں ان کی روشنی میں یہ کارگزاری افسوس ناک ہی شمار ہوگی۔ لوگوں کی نظر میں پولیس کو معاملات تحمل، اور ذہانت سے نمٹانے چاہیں کیونکہ پولیس کے ہاتھوں ایک شخص کا زخمی ہونا یا مارا جانا ایک ایسا فعل شمار

ہوتا ہے جسے یہ کہا جا سکتا ہے کہ مرنے والے شہری نے ٹیکس دے کر امن و امان اور تحفظ کے لئے جو گولی پولیس کو لے کر دی تھی وہ کسی سماج دشمن، وطن دشمن یا چور اچکے کے سینے میں اترنے کی بجائے اسی پر امن شہری کے سینے میں اتر گئی۔ جب لوگوں کے ٹیکسوں سے خریدی گئی گولی لوگوں کے ٹیکسوں سے تنخواہ پانے والی پولیس کی بندوق سے شہریوں ہی کے سینے میں اترنے لگتی ہے تو پھر اس کو پولیس سٹیٹ کا نام دیا جاتا ہے۔ پاکستان میں بار ہا ایسے مواقع اور ادوار آئے جب حکومت کرنے والوں نے پولیس کو اپنے اقتدار کی بقا کی خاطر کرایہ دار پولیس کے طور پر استعمال کیا اور بے دریغ استعمال کیا اور پولیس نے بھی بدعنوانی اور روز گار کو بچانے ترقی پانے اور اپنے اقتدار یا اختیار کو حد سے باہر استعمال کرنے میں حکمرانوں کا اپنی رضا سے آلہ بننے میں اپنے پیشے کی لاج کو بھی ایک طرف رکھ دیا۔ یہ وہ مرحلہ ہے جب ایک ادارہ مجموعی طور پر اپنے مدار سے ہٹ جاتا ہے اور تعمیر سے زیادہ تخریب (نادانشمندانہ طور پر ہی سہی) میں سرگرم ہو جاتا ہے۔

پنجاب کے سابق آئی جی کا تحریری اعتراف گناہ

ہر شعبہ میں پولیس کی کارکردگی روبہ زوال

92-91ء میں لکھے گئے احکامات پر صفر کے برابر بھی عمل نہیں ہوا

ہماری پولیس (پنجاب کے حوالے سے) کس قدر مستعد ہے اور پولیس ایکٹ کے حوالے سے کہاں تک کارآمد ہے اس کا اندازہ لگانے کے لئے ایک انسپکٹر جنرل کے ان احکامات کا انتخاب کر لیا جائے جو انہوں نے ایک ڈیڑھ سال کے عرصہ میں محکمے کو جاری کئے تو قیل و قال اور مباحثے کی ضرورت نہیں رہے گی اور ایکٹ اور رولز کے جوہر بھی کھلتے نظر آئیں گے۔ سابق انسپکٹر جنرل پنجاب سردار محمد چودھری کے ان احکامات کو ''راہ عمل'' کے نام سے ایک کتاب کی صورت میں بھی شائع کر دیا گیا تھا۔ سنٹرل پولیس آفس کی جاری کردہ اس کتاب میں ستمبر 1991ء سے دسمبر 1992ء تک کے احکامات ہیں۔ اب ان میں سے انتخاب:

☆ دیکھا گیا ہے کہ بعض اوقات سنگین نوعیت کے مقدمات کے حقائق موثر انداز میں عدالتوں کے نوٹس میں نہ لائے جانے کی وجہ سے ملزمان ضمانت پر رہا ہو جاتے ہیں۔

☆ یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ باوجود تحریری و زبانی یقین دہانیوں کے تھانہ کی سطح پر ابھی تک رجحان برقرار ہے کہ جرائم کی نوعیت کو کم کرنے کے لئے راہزنی اور ڈکیتی جیسے سنگین مقدمات زیر دفعہ 382 ت پ درج ہو رہے ہیں بلکہ بعض اوقات ایسے مقدمات کو زیر دفعہ 79-6-17 اسلامک لا (حرابہ) درج کرنے پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔ آئندہ اگر کسی پولیس افسر نے راہزنی یا ڈکیتی کا مقدمہ زیر دفعہ 382 ت ب حقائق کو توڑ موڑ کر غلط درج کیا تو وہ سخت محکمانہ کارروائی کا

مستوجب ہوگا۔صفحہ 6-7

☆ یہ بات مشاہدہ میں آئی ہے کہ پولیس افسران بدستور مقدمات کے صحیح اندارج سے نہ صرف گریزاں ہیں بلکہ سنگین نوعیت کے مقدمات میں جرائم کی نوعیت کو محض اس لئے چھپاتے ہیں تاکہ یہ ظاہر ہو کہ سنگین جرائم قابو میں ہیں جبکہ حقیقت حال اس کے برعکس ہوتی ہے۔

☆ آئندہ کسی پولیس افسر کو صرف اس بنا پر قصور وار نہیں گردانا جائے گا کہ اس کے عرصہ تعیناتی کے دوران درج شدہ مقدمات کی تعداد میں اضافہ ہوا۔

☆ یہ شکایت عام ہے کہ جب بھی عوام الناس مقدمہ درج کروانے یا پولیس کی مدد حاصل کرنے کے لئے تھانہ جاتے ہیں تو افسر انچارج نہیں ملتا۔ یہ شکایت بادی النظر میں معقول اور کافی حد تک درست معلوم ہوتی ہے جس سے عوام کی نظر میں پولیس کا وقار بھی مجروح ہوتا ہے۔صفحہ 8-7

☆ دیکھا گیا ہے کہ تفتیش میں ضروری تاخیر عام طور پر مقامی پولیس سے سرزد ہوتی ہے ۔ مشاہدہ میں آیا ہے کہ مختلف سطح کے نگران افسران (مثلاً انچارج تھانہ جات، سب ڈویژنل پولیس آفسر، ڈسٹرکٹ ایس پی، ڈی آئی جی رینج اور ڈی آئی جی کرائمز برانچ اور دیگر اعلیٰ افسران) بھی مسائل (تفتیش) کے حل میں بڑی سرد مہری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس طرح مقدمات کی تفتیش میں غیر ضروری تاخیر ایک سنگین مسئلہ بن چکا ہے۔صفحہ 10

☆ یہ بات سامنے آئی کہ اضلاع سب ڈویژن اور تھانوں کے درمیان معیادی کرائم میٹنگوں کا رواج قصہ پارینہ بن چکا ہے۔ اگر کبھی کبھار کوئی میٹنگ ہوئی تھی ہے تو سی آئی اے کے یونٹ اسے اس قدر کم اہمیت دیتے ہیں کہ متعلقہ ایس پی اور ڈی ایس پی (سی آئی اے) اس میں شمولیت سے قاصر رہتے ہیں۔صفحہ 56

☆ ایک ذیلی حلقہ افسر سے مقدمات کی تفتیش دوسرے ذیلی حلقہ افسر کے سپرد کرنے کے سلسلہ میں ایس ایچ او اپنی صوابدید آزادانہ طور پر استعمال کرتا ہے اس سے پورے نظام میں خرابی پیدا ہوتی ہے۔ یہ صورت حال موجودہ نظام میں سنگین خرابیوں کا موجب بنی ہے۔ بہت سے موضوعات ایسے ہیں جن میں تقسیم

کار کے اصولوں کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے اس سے صورت حال میں ابتری پیدا ہوتی ہے۔صفحہ 64

☆ سر دست یہ تاثر عام پایا جاتا ہے کہ پولیس کی کل نفری میں سے تقریباً نصف یا کم از کم ایک چوتھائی صرف وقت گزاری کر رہی ہے۔ نہ تو انہوں نے کسی مقرر اشتہاری مجرم یا بدقماش پر ہاتھ ڈالا ہے اور نہ ہی آج تک کسی چور، ڈکیت، راہزن یا منشیات کا دھندہ کرنے والے کا احتساب کیا۔ اس طرح یہ عملہ محکمہ پولیس اور حکومتی خزانے پر ایک ناروا قسم کا بوجھ ثابت ہو رہا ہے۔صفحہ 66

☆ یہ جان کر انتہائی افسوس ہوا کہ محکمانہ کارروائی سے متعلق وضع کردہ اصول وضوابط کی پابندی کا رجحان خاصی حد تک کم ہوتا جا رہا ہے...... پولیس قواعد کے قاعدہ 9-16 میں اس بات پر زور دیا گیا ہے لیکن افسوس کہ عملدرآمد کی بجائے اس کی زیادہ تر خلاف ورزی کی جاتی رہی۔صفحہ 68

☆ نہروں، کھالوں او رراجباہوں سے پانی کی چوری میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے شکایات کی کثیر تعداد کا لب لباب یہ ہے کہ پولیس اور محکمہ نہر کوئی موثر کارروائی کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے۔صفحہ 74

☆ عام طور پر محسوس کیا جاتا ہے کہ صحافیوں کا پولیس کے بارے میں رویہ مثبت نہیں ہوتا اور ارادی یا غیر ارادی طور پر قانون شکنوں اور مجرموں کی طرفداری ہوتی ہے اس صورت حال کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ پولیس کا موقف موثر طور پر اخبارات ورسائل تک نہیں پہنچایا جاتا۔ اخبارات، ریڈیو، ٹیلی ویژن وغیرہ پولیس کے امیج کو بنانے یا بگاڑنے میں نہایت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ذرائع ابلاغ جرائم پیشہ لوگوں کی مکاری سے اکثر متاثر ہو جاتے ہیں۔صفحہ 90-86

☆ پاکستان کا فوجداری نظام قانون اور اس پر مبنی نظام پولیس اس اصول پر قائم ہیں کہ امن عامہ کا اصل انحصار رعایا کے ہر ایک فرد کی ذمہ داری پر ہے۔ عدالتیں اور پولیس اس لئے بنائی گئی ہیں کہ وہ اس ذمہ داری کی انجام دہی۔ نگرانی اور امداد کا ذریعہ بنیں۔ پولیس رولز 1-2 میں نہایت افسوس کے ساتھ محسوس کر رہا ہوں کہ ایس ایچ او صاحبان کافی عرصہ سے جائداد سے متعلقہ مقدمات میں جرم

کی نوعیت کو گھٹانے کی روش کو دوبارہ اپنا رہے ہیں اور اس سلسلہ میں صحیح دفعہ 392 ضابطہ فوجداری کی بجائے دفعہ 382 ضابطہ فوجداری میں اندراج مقدمات کا رجحان فروغ پا رہا ہے۔ یہ فعل نہ صرف خلاف قانون ہے بلکہ ملزمان کی امداد کرنے کے مترادف ہے۔ صفحہ 21

☆ یہ بات مشاہدے میں آئی ہے کہ جرائم میں گرفتار کئے گئے ملزمان کے ورثا کو پولیس کی طرف سے بروقت اطلاع نہیں دی جاتی جو پولیس کے لئے اخلاقی مشکلات اور ورثا کے لئے ذہنی اذیت کا باعث بنتی ہے۔ آئندہ ورثا کو فوری طور پر اطلاع دی جائے۔ صفحہ 23

☆ مفروران اور مجرمان اشتہاری کے خلاف کارروائی کے موضوع پر تفصیل سے غور کیا گیا۔ صورت حال یہ سامنے آئی ہے کہ ماسوائے چند اضلاع کے وہ بہت غیر تسلی بخش ہے۔ مسئلہ نے مزید سنگین صورت اختیار کر لی ہے۔ جو کارروائی عمل میں لائی جاتی ہے اس کی رفتار نہایت سست ہے اور وہ تسلسل سے محروم ہے۔ ہدایات مندرجہ پولیس رولز کو بالکل پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔ بعض کیفیات جو غالباً قیام پاکستان کے بعد پیدا ہوئیں ان کے سد باب پر مناسب غور نہیں کیا گیا۔ صفحہ 26

☆ مسلسل کئی سالوں سے دیکھا جا رہا ہے کہ پورے صوبہ میں کسی مجرم اشتہاری کے خلاف کبھی کارروائی زیر دفعہ 88 ضابطہ فوجداری نہیں ہوئی۔ یہ ناقابل تسلیم ہے کہ ہزاروں مجرمان اشتہاری میں سے کسی کے نام پر بھی غیر منقولہ جائداد نہیں ہے۔ اس سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ تھانہ کی سطح پر پولیس کے ارکان کی طرف سے جائداد غیر منقولہ کے متعلق جو دریافت کی جاتی ہے وہ معیاری نہیں ہے اور حقائق کو منظر عام پر لانے سے دانستہ پہلو تہی جاتی ہے۔ صفحہ 38

☆ مجموعی طور پر ملک میں جرائم کی صورت حال خصوصاً سنگین مقدمات کا روبہ اضافہ رجحان ، تفتیش میں قابل اعتراض تساہل و طوالت، عدالتی کارروائی میں غیر ضروری تاخیر، نسبتاً قانون شکن عناصر پر گرفت کی کمزوری اور عوام میں خوف و ہراس سے متاثر ہو کر وفاقی حکومت نے آئین اسلامی جمہوریہ پاکستان میں

بارہویں ترمیم اور قانون سازی کے ذریعے عدالت ہائی خصوصی کے قیام کے عمل سے فوری انصاف مہیا کرنے کو ممکن بنایا ہے۔ مروجہ قانون فوجداری کے تحت پولیس بلاشرکت غیر تفتیش کرنے والا واحد ادارہ ہے یہ واضح ہے کہ پولیس ہی قانون کا بازوئے شمشیر زن ہے۔صفحہ 43

☆ حدود علاقہ تھانہ کے اندر سب انسپکٹر (افسر مہتمم تھانہ) حفظ امن اور انسداد جرم، سراغ رسانی، جرائم کے لئے مقامی پولیس کی عمدہ کارکردگی، انتظام و انصرام، اچھے طرز عمل اور ڈسپلن کا اولین ذمہ دار ہے۔ پولیس رولز 1-22

ہماری شاہراہوں پر اور شہروں کے اندر ٹریفک کی بدنظمی اور بے ضابطگی عیاں ہے۔ مسافت غیر محفوظ ہوگئی ہے۔آئے دن کے حادثات میں قیمتی جانوں اور گاڑیوں کا ضیاع ہورہا ہے۔شہری ٹریفک پولیس سے بجا طور پر توقع کرتے ہیں کہ وہ ہر وسیلہ کو بروئے کار لاکر ٹریفک میں نظم وضبط پیدا کرے۔صفحہ 117

کچھ بہادری کی داستانیں......کچھ فرض شناسی کے قصے

کچھ تمغے چوڑے سینوں پر کچھ پھول پڑے ہیں قبروں پر

یوں بھی ہوتا ہے کہ سعادت حسن منٹو کے ایک افسانے کے کردار صفدر ٹھیلہ جیسے لوگ ایسے اداروں میں پیدا ہو جاتے ہیں جو عوام کی نظر میں جائز یا بلا جواز آزار کا باعث بن گئے ہوتے ہیں۔ معاشرے میں ان کی حیثیت انتہائی افادی کردار ادا کرنے کے باوجود جذباتی طور پر ناقابل قبول ہوتی ہے۔ کسی زمانے میں تھانیدار کے بارے میں پنجابی میں ایک لوک گیت تھا جس کا مصرع تھا۔

گھوڑی چڑھدا تے لگدا تھانیدار نی مائے

(اے ماں میرا محبوب جب گھوڑی پر سوار ہوتا ہے تو وہ تھانیدار کی طرح وجیہہ، خوبصورت اور معتبر نظر آتا ہے) مگر یہی پولیس والے ایک معروف شاعر عبیر بوذری مرحوم کی نظر میں کیا ہیں؟ ان کی نظم کے ٹیپ کے مصرعے سے اندازہ ہو جائے گا۔

پولس نوں آکھاں رشوت خور تے فیدہ کیہ
پچھوں کروا پھراں ٹکور تے فیدہ کیہ

(میں پولیس والوں کو اگر رشوت خور کہوں تو لامحالہ وہ مجھے بہت ماریں گے اور اس قدر ماریں گے کہ مجھے بہت دیر ٹکور کرنی پڑے گی، تو پھر انجام اگر یہ ہے تو اسے رشوت خور کہنے کا فائدہ کیا ہوا۔)

سعادت حسن منٹو کا صفدر ٹھیلہ کب گھوڑی پر چڑھا تھانیدار لگتا ہے اور بھگت سنگھ او ر انگریز دشمن عوام میں شامل۔ کب سکاٹ جیسا ایس پی گردن زدنی بن جاتا ہے؟ یہ مراحل اور معاملات اور ہی طرح کے ہوتے ہیں۔ مختصراً یہ کہ نہ کوئی ہمیشہ کے لیے جاتا ہے اور جسے سراپا شر سمجھا جاتا ہے وہ اول و آخر خیر بن کر طلوع ہوتا ہے۔

پولیس میں بھی یہی صورت ہے، پولیس دنیا کے کسی تختے، کسی ملک کی ہو،

بہر حال لوگوں میں اس کے بارے میں کہیں نہ کہیں اک منفی تاثر ضرور ہوتا ہے۔ پولیس واحد محکمہ ہے اور دنیا بھر میں ہے جس کا کوئی ملازم آپ کو مشکوک جان کر کسی بھی وقت کوئی سوال کر سکتا ہے جو آپ کے وقار، آزادی اور دیانتداری پر ایک وار ثابت ہوتا ہے۔ کسی حکومت کا کوئی محکمہ اپنے کسی ملازم کو یہ اختیار نہیں دیتا کہ وہ کسی شہری کو راستے میں یا گھر پر جا کر تفتیش کے سے انداز میں سوال کر سکے۔ عدلیہ کا شعبہ وہ ہے جس سے بڑے بڑے کانپنے لگتے ہیں مگر شہریوں کو عدلیہ کے بارے میں کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ اس کا کوئی ملازم (بیلف) ان کی جائز آزادی میں مخل ہو سکتا تا آنکہ انہوں نے خود کوئی قانون شکنی نہ کی ہو اور یہ معاملہ بذریعہ پولیس عدالت میں نہ پہنچ گیا ہو۔

پولیس کے اختیارات (جائز ناجائز، تحریری غیر تحریری، رسمی غیر رسمی) پولیس کی وردی، پولیس کی نیک نامی یا بدنامی، کبھی ذاتی واسطہ پڑا ہو تو اس تجربے کی شیرینی یا تلخ کلامی، پولیس کی کمائی پولیس کی طرفداری، پولیس کی مخالفت...... یہ ساری چیزیں مل کر پولیس کے بارے میں ہمارے ہاں عموماً منفی قسم کے تاثرات اور تماثیل پیدا کرتی ہیں۔ مگر بعض اوقات اسی ''آلودہ گناہ'' پولیس کا کوئی فرزند کچھ ایسی کارروائی کر گزرتا ہے کہ لوگ فارسی مصرعے کے مطابق کہہ اٹھے۔

مارا ازیں گیا ہے ضعیف ایں گماں نہ بود

(یعنی ہمیں اس بیکار سے کمزور سے گھاس سے اتنے زور آور نشہ کی توقع نہ تھی)

سو پولیس والا فرض منصبی کے طور پر، اپنے شوق سے، یا اپنے عقیدے، تربیت، پیشے یا انسانی ہمدردی کے تحت یک بیک ایسے چمک کر آنکھوں کو خیرہ کر جاتا ہے کہ ذہن میں پولیس کے بارے میں بدترین تعصب رکھنے والا بھی حیران ہو جاتا ہے۔ پولیس کی تاریخ میں یہ بھی ہے کہ لندن میں اٹھارہویں صدی میں جب پولیس بنی تو یہ پولیس بعض اوقات خود چوری کرواتی، راہزنی کرواتی، لوگوں سے زبردستی پیسے چھین لیتی ان کی حفاظت کرنے کی بجائے ان کو غیر محفوظ کر دیتی۔ رشوت لیتی غرضیکہ ساری برائیاں جن سے شہریوں کو بچانے کے لئے انہیں ملازم رکھا گیا تھا وہ انہی کے ذریعے معاشرے میں سرایت کر جاتیں۔ لیکن وہ دور گزر گیا۔ ایسے ادوار ہم پر بھی آئے۔ دوسرے ملکوں کی پولیس پر بھی آئے۔ کئی اب بھی انہی مراحل سے گزر رہے ہیں۔ بہر طور بعض اوقات ہوتا یہ ہے کہ کوئی

پولیس والا کسی بھی شعبے میں اعلیٰ کارکردگی دکھا جاتا ہے، جان خطرے میں ڈال کر چوروں، خطرناک مجرموں کو پکڑ لیتا ہے، بدقماش لوگوں سے کسی مغویہ عورت کو چھڑا لیتا ہے، کسی ڈوبتے کو بچا کر ایک گھر کو تاریکی میں ڈوبنے نہیں دیتا۔ کسی کے کھرے کو دباتا دباتا کسی بم باز کو پکڑ لیتا ہے، کسی دشمن ملک کے جاسوس کو گرفتار کر لیتا ہے۔ کسی بہت بڑی جائیداد خزانے، زیورات کے بارے میں متوقع بڑی واردات کو اپنی ناگہانی کارروائی سے روک لیتا ہے۔ حالانکہ عموماً پولیس سے لوگ ایسی توقع نہیں کرتے جس طرح صفدر ٹھیلے سے یہ واقع نہیں کرتے کہ وہ جو خود ایک بدمعاش ہے ایک دوسرے بدمعاش کے شکنجے میں آئی لڑکی کی عصمت اور جان بچانے کے لئے خود اپنی جان پر کھیل سکتا ہے۔

ایسی بہادرانہ یا غیر معمولی کارروائیوں او رکارکردگی کے لئے انگریز نے بھی پولیس والوں کے لئے انعامات او رخطابات رکھے ہوئے تھے اورقیام پاکستان کے بعد نہ صرف وہ انعام قائم رہے نئے نئے انعامات بھی بنا دیئے گئے۔ انگریز انعامات و اکرام اپنے قومی مقاصد اور سیاست کے حوالے سے ارزاں کرتا تھا جبکہ پاکستان بننے کے بعد حوالے تھوڑے سے بدل گئے۔ انگریز پولیس والوں سے سب سے زیادہ یہ توقع کرتا تھا کہ وہ سامراج کے مفاد، اس کی سروری، اس کے بچاؤ اور اس کے ہم رنگ ہم قوم اور ہم خیال لوگوں کی حفاظت کے لئے پوری جانفشانی سے کام کریں گے اور عقیدے کی حد تک لگاؤ رکھتے ہوئے جان قربان کرنے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ چنانچہ شروع دن سے انگریز کا معیار یہی رہا یعنی سب سے زیادہ فوقیت سامراج اور اپنی حکومت کے مفاد کے تحفظ کو، پھر عام آدمیوں کا بوقت ضرورت یا ہنگامی حالات میں حق الخدمت ادا کرنے میں غیر معمولی بہادری اور جرأت کا مظاہرہ ۔ انگریزوں کے زمانے میں ایک کنگز پولیس اور فائر سروس میڈل جو غیر معمولی کارکردگی پر دیا جاتا، دوسرا اعلیٰ خدمات پر انڈین پولیس میڈل، تیسرا برما پولیس اور چوتھا کالونیل پولیس میڈل۔

این۔اے۔رضوی صاحب نے اپنی کتاب میں دہلی کے کوتوال خان صاحب حمید الدین خان کے سینے پر کنگز پولیس میڈل لگانے کی تصویر شامل کی ہے۔ تمغہ 1922ء میں پرنس آف ویلز لگا رہا ہے۔ اسی طرح انہوں نے سرحد کے خان شہاب الدین خان (1939) اور سندھ کے مسٹر عبدالکریم کی میڈل والی تصویر بھی شامل کی ہے اور کچھ ان

بہادروں کا ذکر کیا ہے جن کا تذکرہ کری نے اپنی کتاب میں کیا اور کچھ وہ واقعات جو قیام پاکستان کے بعد کے ہیں۔ 1909ء سے لے کر 1947ء تک اس میڈل کا نام کنگز پولیس میڈل رہا جبکہ 1947ء میں اسے قائداعظم پولیس میڈل کا نام دیا گیا۔

1947ء سے پہلے کری کے حوالے سے رضوی صاحب نے بتایا کہ ضلع لدھیانہ کے ایک سب انسپکٹر نے اکیلے ہی ایک بہت بدنام ڈاکو رام سنگھ کو گھیر لیا، اسے ایک کمرے میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ مسلسل فائرنگ کی تا آنکہ اس کے ساتھی پولیس والے آ گئے۔ یہ تنہا غیر معمولی بہادری کا مظاہرہ تھا۔

فرنٹیر پولیس کے ایک سب انسپکٹر فیروز الدین نے سرحد میں کچھی بازار اور اپنے تھانے کو ایک بہت بڑے گروہ کی یلغار سے بچا لیا، فیروز الدین اس وقت خود بھی بیمار تھا، اس نے نہ صرف حملہ آوروں کو روکا بلکہ پسپا ہونے پر مجبور کر دیا اور پھر اس بیمار پولیس افسر نے ان کا تعاقب کیا تا آنکہ وہ خود تھک کر گر نہیں گیا۔ یہ 1919ء کا واقعہ ہے۔

سندھ کے گاؤں مانڈو میں مسلح ڈاکوؤں کا گروہ لوگوں کو لوٹ رہا تھا، اتنے میں دو کانسٹیبلوں نے اپنی مارٹینی مسکٹ اس طرح سے چلائیں کہ ڈاکوؤں نے جانا پولیس کا بہت بڑا دستہ فائرنگ کرتا چلا آ رہا ہے۔ ڈاکو بھاگ نکلے۔ گاؤں ہی نہیں یہ دو کانسٹیبل بھی بچ گئے کیونکہ اگر ڈاکو ان کی طرف رخ کر لیتے ان کے بچنے کی کوئی امید تو نہیں تھی۔ اسی طرح لاڑکانہ کے کچھ دیہات میں جہاں خاصے دولت والے لوگ رہتے تھے۔ بلوچ افغان ڈاکوؤں نے جن کی تعداد تیس کے قریب تھی ہلا بول دیا۔ وہاں پر صرف چھ کے قریب نیم مسلح سپاہی موجود تھے مگر انہوں نے ایسی چال چلی کہ تیس ڈاکوؤں پر مشتمل اس یلغار کا منہ موڑ دیا۔

جب پولیس افسر اس قسم کی غیر معمولی بہادری، شجاعت یا ہوش مندی کا مظاہرہ کرتے (جن کی ان سے ان کی محکمہ بھی توقع نہیں کرتا) تو پھر انہیں کنگز پولیس میڈل دیا جاتا، جس کا اب نام قائد اعظم میڈل ہے اور ہر سال 23 مارچ کو پولیس کے کسی نہ کسی جوان بہادر کو یہ تمغہ دیا جاتا ہے۔ پرانے افسر یہ توقع کیا کرتے تھے کہ جنہیں یہ میڈل دیا گیا ہے ان کا نام ہر ڈسٹرکٹ پولیس کے دفاتر میں بورڈ پر نمایاں طور پر لکھے ہونے چاہئیں۔ اگر اس قسم کا انعام کانسٹیبل کو مل جاتا تو اسے خود بخود اگلے عہدے پر ترقی مل جاتی

اسی طرح باقی سارے عہدہ داروں کو بھی ایوارڈ ملنے کی صورت میں ترقی مل جاتی۔

رضوی صاحب کہتے ہیں کہ ایسے انعامات حاصل کرنے والے بے شمار ہیں، بہرطور انہوں نے چند مثالیں دی ہیں۔ 1917ء میں سیالکوٹ میں ایبٹ نام کا ڈپٹی کمشنر تھا جو ایک خانہ بدوش جرائم پیشہ قبیلے کو مستقل طور پر ایک جگہ پر آباد ہونے کے لیے آمادہ کر رہا تھا۔ پکھی واسوں کی ایک یلغار میں وہ زمین پر گر پڑا۔ دریں اثنا پولیس انسپکٹر معراج الدین مراز نے اڑھائی سو کے قریب خانہ بدوشوں پر پستول سے فائرنگ کر کے ان کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ یہ لوگ ایک دم حملہ پر گھبرا گئے اور بھاگ نکلے۔ یوں معراج الدین مرزانے ڈپٹی کمشنر کی جان بچالی۔

1918ء میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ صدائے علی خان اور اس کی پارٹی، ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت سات افراد کو گرفتار کرنے گئے کہ ان کا سامنا پانچ سو کے قریب افراد پر مشتمل ہجوم سے ہوگیا جو لاٹھیوں بیلچوں اور کلہاڑوں سے مسلح تھے، مگر اس نے کمال دانش مندی سے کام لے کر ان لوگوں کو سمجھا بجھا لیا اور قتل و غارت کی ایک بڑی واردات نہ ہونے دی گئی، پولیس والے بھی بچا لئے گئے۔

ایک اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس خان صاحب غلام رسول کو بھی اس میڈل سے نوازا گیا۔ وہ تین بڑے مسلح خطرناک ڈاکوؤں کا پیچھا کر رہا تھا جو ایک کمرے میں گھس گئے اور اس کو انہوں نے مورچہ بنا لیا، غلام رسول اس کمرے کے کوٹھے پر چڑھ گیا۔ چھت میں شگاف ڈال دیا اور مجرموں پر فائرنگ کر دی اور ڈاکوؤں کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔

پنجاب پولیس کی کریمنل انویسٹیگیشن برانچ کے اہل کار سید احمد شاہ نے 1929ء میں اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال کر لوٹا (بمبئی) میں دو منہ زور انقلابیوں کو ایک گھر کے اندر گرفتار کر لیا اور اگرچہ دونوں کے قریب ہی ریوالور پڑے ہوئے تھے مگر سید احمد شاہ نے انہیں ریوالور اٹھانے کا بھی موقع نہیں دیا۔

1930ء میں جل گاؤں میں ایک زیر مقدمہ قیدی بھگوان داس کو سماعت کے لئے کچہری لایا گیا۔ وہاں اس کے کسی عزیز نے کھانے پینے کی اشیا اسے دیں جن میں ایک ریوالور بھی تھا، بھگوان داس بھی اپنے ریوالور کو سیدھا بھی نہیں کر پایا تھا کہ سید احمد شاہ نے وہ ریوالور چھین لیا اور اپنے ریوالور کی مدد سے کچہری کے احاطہ میں موجود پانچ سو کے

قریب افراد کو قابو کر لیا، ان میں اکثریت بھگوان داس کے سیاسی حامیوں کی تھی۔ اس طرح یہ ہجوم عدالت کے احاطہ سے باہر نکال دیا گیا۔

ایک سب انسپکٹر نریندر سنگھ ڈاکوؤں سے کئی مقابلوں میں بڑا کامیاب رہا 31-1929 میں اس نے بڑی شہرت پائی۔ 1929ء میں اس نے ایک مسلح اشتہاری ملزم پر ہاتھ ڈال دیا اور اسے قابو بھی کر لیا۔ 1930ء میں اس نے ایک بدنام ڈاکو کرتارا (شاید کرتار سنگھ جو اپنے وقت کا رابن ہڈ تھا اور جس کے کارناموں کے پنجابی زبان میں بڑے گیت (ڈھولے) بنے ہوئے ہیں) کے ڈیرے کو گھیر لیا تھا اور پھر کرتار کو گرفتار کر لیا۔ 1931ء میں رونٹا کے مقام پر اس کی ڈاکوؤں سے مڈبھیڑ ہوئی اس نے دو کو موقع پر ہلاک کر دیا۔ ایک مرتبہ ڈاکوؤں کا سامنا ہوا مگر وہ ایک عمارت میں قلعہ بند ہو گئے۔ نریندر سنگھ عمارت کی چھت پر چڑھ گیا اور انہیں للکار کر اپنا نام بتایا جو ان دنوں ڈاکوؤں میں دہشت کی ایک علامت بن گیا تھا، ڈاکوؤں نے اسی وقت ہتھیار ڈال دیئے۔

40-1939ء میں سپرنٹنڈنٹ پولیس چودھری سادھورام کے کئی مقابلے ہوئے۔ ایک مقابلے میں اس نے مسلح ڈاکو کے گھر کو آگ لگا دی۔ دوسرے مقابلے میں چھت پر چڑھ گیا اور اس کمرے میں جہاں ڈاکو چھپے ہوئے تھے سوراخ کر کے آگ پھینک دی، ایک مارا گیا دوسرا پکڑا گیا۔ چند ایک دیہات کے بارے میں اسے شبہ تھا کہ وہاں بہت سے قاتل اشتہاری مجرم وغیرہ چھپے ہوئے ہیں۔ اس نے بار بار ان دیہات پر یلغار کی اور تین قاتل، تین ڈاکو، چار نقب زن، اور ایک راہ زن گرفتار کر لیا مگر ان کی طرف سے شدید مزاحمت کے بعد ایک اشتہاری پر سات افراد کے قتل اور چھ ڈکیتیوں کا الزام تھا، سادھو رام نے اسے بھی ایک مقابلے میں ڈھیر کر دیا۔

1934ء میں گھوڑا سوار سہراب خان نے زخمی ہونے کے باوجود ایک بدنام اشتہاری مجرم چاند سنگھ کا تعاقب کیا تا آنکہ وہ خود ڈھیر نہیں ہو گیا۔ 1936ء میں ایک کانسٹیبل میراں بخش نے سیلاب کے دنوں چار اور تین افراد کی ڈوبتی پارٹیوں کو سیلاب کی زد سے بچا لیا، حالانکہ وہ خود تیرا کی نہیں جانتا تھا۔ اس نے کہیں سے لکڑی کا بڑا گٹھا یا مڈھ ڈھونڈ لیا اور اس کی مدد سے سیلاب میں پھنس جانے والے لوگوں کی زندگیاں بچاتا رہا۔

1940ء میں عیسیٰ خیل پولیس سٹیشن کے سب انسپکٹر سکندر خان نے دو ہیڈ

کانسٹیبلوں اور چھتیس کانسٹیبلوں کی مدد سے اڑھائی سو افراد پر مشتمل قبائلی لشکر کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا جو جاتے جاتے اپنے ایک ساتھی کی لاش بھی چھوڑ گئے۔

اب کچھ قصے قیام پاکستان کے بعد مشرقی پاکستان (حال بنگلہ دیش) کے:

1948ء میں ضلع فرید پور کے سب انسپکٹر ظفرالدین نے ایک کشتی میں بہت سے ڈاکو سوار دیکھے۔ ظفرالدین اس کشتی کے قریب ہو گیا۔ اس کے اور ڈاکوؤں کے درمیان گولیوں کا تبادلہ ہوا۔ پھر ظفرالدین نے ڈاکوؤں کی کشتی میں کود کر اس ڈاکو کو قابو کر لیا جس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ دریں اثنا ظفرالدین کی پولیس پارٹی بھی پہنچ گئی اور یوں ان ڈاکوؤں کو گرفتار کر لیا گیا۔

1949ء میں کوئی تیس کے قریب ڈاکو ایک گھر پر حملہ آور ہوئے۔ یہ نواکھلی کا واقعہ ہے۔ سب انسپکٹر اظہرالدین سے گولیوں کا تبادلہ ہوا، اظہرالدین نے دو کو گرفتار کر لیا۔ جبکہ باقی سارے بھاگ گئے۔ فرید پور ضلع کے ہیڈ کانسٹیبل عبدالرزاق نے تین نقب زنوں کو دیکھ لیا جو واردات کر کے جا رہے تھے اس نے ان کا پیچھا کیا، انہوں نے اس پر حملہ کیا اسے چاقو سے زخمی بھی کیا مگر اس نے ایک ڈاکو کو قابو کر لیا اور اس کے قبضے سے چوری کا مال بھی برآمد کر لیا۔

ڈھاکہ میں انسپکٹر امین الدین احمد کو مخبری ہوئی کہ کچھ ڈاکو ڈکیتی کرنے کے لئے فلاں جگہ منصوبہ بنا رہے ہیں امین الدین احمد نے ڈاکوؤں کی ملاقات کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ جہاں اس نے چار ڈاکوؤں کو گرفتار کر لیا اور ان سے اسلحہ بھی برآمد کر لیا۔ 1950ء ہی میں بوگرہ ضلع کے سب انسپکٹر حنیف خان کو اطلاع ملی کہ گاؤں چکالما میں ڈکیتی کی واردات ہونے والی ہے۔ وہ فوراً بھاگا اور موقع کا گھیراؤ کر لیا۔ ڈاکوؤں نے اس پر فائرنگ شروع کر دی، جس کی وجہ سے خود حنیف خان کا ہیلمٹ گولیوں سے چھلنی ہو گیا۔ مگر اس نے گروہ کے سرغنہ کو گولی مار دی، باقی چار کو موقع پر گرفتار کیا۔ بعد میں ان کے تیرہ ساتھیوں کو بھی پکڑ لیا۔

چٹاگانگ کے انسپکٹر ارشد علی کا قصہ ہے کہ وہ دریا میں کشتی پر جا رہا تھا کہ اس کی کشتی کے آگے ڈاکوؤں کی کشتی آ گئی، ڈاکوؤں نے اس کی کشتی میں چھلانگ لگا کر اسے قابو

کر لیا اور اس پر پستول تان لیا اسی عرصہ میں ارشد علی نے کچھ اس طرح سے چھلانگ لگائی کہ ایک ڈاکو اور وہ دونوں دریا میں جا پڑے۔ کشمکش جاری تھی کہ ارشد علی کے ساتھی پہنچ گئے جنہوں نے ایک ڈاکو مار دیا اور دو کو حراست میں لے لیا۔

1958ء میں لاہور میں ایک اسسٹنٹ سب انسپکٹر سردار خان نے دو مسلح سمگلروں کو گرفتار کر لیا۔ حالانکہ سردار خان غیر مسلح تھا، دوسرا اسے سمگلروں کے ریوالور کی دو گولیاں بھی لگ چکی تھی مگر نہ اس نے سمگلروں کو چھوڑا، نہ ان کے گھوڑے کو اور نہ ہی ان کے سامان کو۔

اب پرانے زمانوں کی بجائے ایک آدھ قصہ اسی ضمن میں پولیس کے نئے لوگوں کا بھی دیکھ لیجئے۔ گوجرانوالہ کے ایک سب انسپکٹر امان اللہ خان نیازی نے ''شجاعت کا نشان پنجاب پولیس'' کے عنوان سے ایک مختصر سی کتاب لکھی اس میں بعض پولیس والوں کی غیر معمولی بہادری اور قربانیوں کا ذکر کیا۔ امان اللہ نے بہت قصے لکھے اور ڈی آئی جی اظہر حسن ندیم اور ایس پی محمد مسعود بنگش نے اس کتاب کو اپنی تعریفوں سے نوازا بھی ہے۔ امان اللہ خان اس انسپکٹر پولیس (فاروق خان) کا بھائی ہے جو ضلع گوجرانوالہ میں اوجلہ کلاں کے معروف معرکہ میں جاں بحق ہوا تھا۔ فاروق خان اور اس کے ساتھی بہادری سے سماج دشمن عناصر سے لڑے اور پولیس کی نیک نامی کا سامان کر گئے۔ اس واقعہ سے امان اللہ بہت متاثر لگتا ہے۔ بہر طور اس کی کتاب میں سے دو واقعات مختصراً۔

شمال مغرب کی طرف سے لاہور میں داخل ہوں، دریائے راوی عبور کرتے ہی پل کے شہر والے سرے پر کہیں اکرام اللہ نیازی شہید چوک لکھا نظر آتا ہے۔ اکرام اللہ نیازی لاہور شہر میں ایک معروف پولیس افسر تھا۔ تحصیل فیروز والہ میں ایک ڈاکو نوری کچا نے بڑی دہشت پھیلا رکھی تھی، بار ہا بچ نکلا، ڈی آئی جی میجر مشتاق نے چاہا کہ نیازی جیسے تجربہ کار افسر کو نوری کی سرکوبی پر لگایا جائے۔ اکرام اللہ نیازی سی آئی اے میں ڈی ایس پی تھے، نیازی کو بتایا گیا کہ نوری تھانہ فیکٹری ایریا کے موضع ٹھٹھہ چدھڑاں میں رات کو آئے گا۔ 19 دسمبر 1992ء کو نیازی نے چھاپا مارا مگر نوری تیز رفتار گھوڑی پر بھاگ نکلا۔ نیازی بھی پریشان اور میجر مشتاق بھی۔ مگر نیازی نے یقین دلایا کہ وہ نوری کا انتظام ضرور کرے گا۔ دو دن بعد میجر مشتاق کو پتہ چلا کہ نوری اپنے گھر میں آیا ہوا ہے۔ نیازی نے

چھاپہ مار پارٹی میں نامی گرامی پولیس والے شامل کئے۔ نیازی کے ساتھ ڈی ایس پی رئیس احمد تھا۔ انسپکٹر ادریس، عارف رشید، شفیق باجوہ، عظمت گوندل۔ ریڈ دن کی روشنی میں فیض پور میں کیا گیا۔ نوری کچا کے مکان کو گھیر لیا گیا مگر وہ اپنی سیون ایم ایم کے ساتھ ایک ایسے کمرے میں مورچہ بنا کر بیٹھا جہاں سے سب کچھ نظر آتا تھا۔ سب سے پہلے نیازی مکان کے صحن میں پہنچ گیا مگر نوری مورچہ سنبھال چکا تھا، اس نے نیازی پر مہلک فائر کیا، رئیس دوسری چھت سے آ رہا تھا، مگر اس سے پہلے نوری نے ادریس کو جو نیازی کے پیچھے آیا تھا زخمی کر دیا، رئیس نے اپنے طور پر چھلانگ لگائی کہ کمرے کی کھڑی کی آڑ میں آ کر نوری پر حملہ آور ہو مگر نوری پہلے وار کر گیا۔ عارف رشید اور عظمت گوندل نے ٹیر گیس پھینکی، خود اندر کودے، نوری کے فائر سے زخمی ہوئے مگر نوری بھی اب ٹوٹ رہا تھا، زخمیوں نے کمرے کے اندر اس طرح فائرنگ کی کہ نوری بچ نہ سکے۔ آخر محاذ پر خاموشی چھا گئی۔ اکرام نیازی، رئیس احمد خاں، انسپکٹر ادریس جان جان آفریں کے سپرد کر چکے تھے، عارف رشید اور شفیق باجوہ زخمی تھے۔ میجر مشتاق احمد اور ایس پی نسیم بھی موقع پر پہنچ گئے تھے۔ بہر طور ایک قاتل ڈاکو یا جابر سے لوگوں کو نجات دلانے کے لئے کبھی کبھی پولیس والوں کو ایسی قربانی بھی دینی پڑتی ہے۔ دو ڈی ایس پی اکرام اللہ نیازی/رئیس احمد خان انسپکٹر ادریس جان بحق ہوئے، دو اہل کار زخمی ہو گئے۔ اکرام نیازی/رئیس یا ادریس کے تھانے یا علاقے کا مسئلہ نوری کچا نہیں تھا وہ ان کے تھانے یا تھانوں سے متعلق نہ تھا، وہ دوسرے ضلع کے اہل کاروں کا معاملہ تھا مگر کبھی کبھی حدود تھانہ سے بلند ہونا پڑتا ہے حالانکہ حدود تھانہ کا روایتی باہمی تنازعہ پولیس والوں کی کارکردگی پر ایک بدنما دھبہ بھی ہے۔

امان اللہ خان نے ایک دوسرا قصہ بھی بیان کیا ہے میانوالی کا جہاں دو برادریوں اور قبیلوں کے درمیان دشمنی پرانی ہے۔ کالا باغ کے نواب مظفر خان اور بنی افغاناں کے افغانوں کے درمیان۔ 1988ء کا واقعہ ہے بنی افغاناں والوں نے کہا مظفر نے ہمارا چرواہا قتل کرایا ہے، مظفر نے کہا اس نے میرا قیمتی ہرن مار دیا اور پھر خود اس (مظفر) پر حملہ کیا تھا۔ بنی افغان قبیلہ نے اپنے ان جوانوں کو بھی بلا لیا جو فوج میں ملازم تھے۔ دونوں طرف خوفناک تیاری تھی۔ پولیس نے چاہا معاملے کو کنٹرول کیا جائے۔ ڈی آئی جی سرگودھا احمد نسیم نے اوپر سے پوچھا۔ کیا کمانڈو ایکشن سے کشت وخون کو روکا جائے؟ ایس پی آصف نواز

تھا۔ بنی افغاناں کو روکنا مقصود تھا، پولیس پہنچی پہلی گولی ایس پی کے گن مین اے ایس آئی شیر سمندر نیازی کو لگی، موقع پر جان بحق ہوا۔

دوسری جانب سے ڈی ایس پی محمد نواز کی قیادت میں پولیس بڑھی مگر پہاڑوں میں چھپے بنی افغاناں والوں نے فائرنگ کی، کانسٹیبل انور مارا گیا۔

پنجاب کنسٹیبلری والے تیسری سمت سے آگے آئے۔ اندھا دھند فائرنگ ہوئی۔ ایک کانسٹیبل یوسف مارا گیا باقی تیرہ افسروں اور اہل کاروں کو افغانوں نے یرغمال بنا لیا۔

آپریشن ملتوی کر کے یرغمالیوں کو چھڑانے اور مرنے والوں کی نعشیں حاصل کرنے کا حکم ہوا۔ ایس پی نے مذاکرات کے لئے کہا، فورس کو واپس بلایا۔ مگر بنی افغاناں والوں نے لاشیں بھی اٹھانے نہ دیں، نہ یرغمالی رہا کئے، نہ گفت وشنید کی۔ پولیس والوں کے آگے بڑھنے کی صورت میں یرغمالیوں کو مار دینے کی دھمکی تھی۔ مولانا عبدالستار نیازی مذہبی امور کے وزیر تھے انہوں نے مذاکرات کروائے تیسرے دن لاشیں اٹھائیں۔ پولیس کو ایسے مرحلے بھی پیش آتے ہیں۔ جہاں جانوں کا نذرانہ پیش کرنا پڑتا ہے۔

حرفِ آخر

بزبان یارِ من

ہمارے پس ماندہ معاشرہ میں، جو مختلف ادوار میں مختلف قسم کے سرکاری قواعدوضوابط اور معاشرتی روایات و حکایات کا سیر رہا ہے، بنیادی اور حساب داری کے مربوط نظام کو پختہ بنیادوں پر استوار نہیں کیا جا سکا۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ ہر دور میں محاسبہ کو حساب داری، جواب دہی اور معاشرتی انصاف کے مختلف سانچوں میں ڈھالا جاتا رہا ہے۔ معاشرے کے اندر حاکم طاقتوں کے طریق کار کے خلاف جو مختلف قوتیں سر اٹھاتی اور شکست یا فتح حاصل کرتی رہیں وہ کن مقاصد کو لے کر آگے بڑھی تھیں اور پھر انہوں نے ان مقاصد اور وعدوں کو کہاں تک نبھایا۔ اس کا سراغ نہیں ملتا۔ آریائی عہد میں چوکیدار یا پہریدار یا پولیس والا کیا اختیار رکھتا تھا اس پر نگرانی کس کی تھی، اسے معاشرہ کا ایک دوستانہ حصہ سمجھا جاتا تھا یا اسے بھی آج کی طرح نفرت اور خوف سے دیکھا جاتا تھا؟ یہ قصہ اپنی پوری شرح و سط کے ساتھ بیان نہیں ہوا یا کم از کم ہمیں معلوم نہیں۔ بعد کے ادوار کی چھان پھٹک بھی آج کے تقاضوں کے مطابق کم از کم ہمارے ہاں نہیں کی گئی اس لئے زمانہ حال اور ماضی کے جستہ جستہ تحریری واقعات سے گمان یہی ہوتا ہے کہ ایک خوشحال معاشرہ اور ایک نسبتاً منصفانہ رویے والی حکومت کے عہد میں پولیس کا کردار نسبتاً بہتر رہا ہے اور اسے حکومت کی طرف سے ان تنازعات میں ملوث نہیں کیا گیا جن میں مثلاً آج کل ملوث کر دیا جاتا ہے۔ معاشرہ میں تنگی (معاشی، عدالتی، ثقافتی ہر قسم کی کساد بازاری) کے دنوں میں عوام کی طرف سے احتجاج کی آواز کو دبانے کے لیے ہمیشہ ریاستی طاقت (اور پولیس اس کا مسلح بازو ہوتی ہے) استعمال کی جاتی رہی ہے۔ اب بھی کی جارہی ہے اور جب اس استعمال حد اعتدال سے آگے گزر جاتا ہے۔ تو پھر اس ریاست کو پولیس سٹیٹ کہا جانے لگتا ہے۔

آج کی ہماری پولیس انگریز کے عہد میں صورت پذیر ہوئی یعنی ایک ادارے کی صورت میں منظّم ہوئی اور ساحلی علاقوں (مدارس بمبئی اور بنگال) میں یورپی مفادات کا تحفظ اس کی اصل ذمہ داری ٹھہرا۔ وہ تاجروں کی ایجاد کردہ تھی اور تاجر تب سے ابتک اور آئندہ بھی اپنے منافع کا غلام ہے۔ باقی ساری تہذیبی ثقافتی اور معاشی اقدار اس کے لئے ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ انگریزوں نے اس پولیس کو فوج سے الگ کیا اور اپنے مفاد کے مطابق بنائے گئے قوانین پر عملدرآمد کی ذمہ داری ایک طرف عدالت، دوسری طرف سرکاری مشینری اور پولیس کو دے دی۔ اب ایک معاملہ ہے حاکم کا کہ وہ غیر ملکی ہے اور پولیس یا دوسرے شعبوں میں نچلی سطح پر ہی سہی اکثریت مقامی لوگوں کی ہے۔ غیر ملکی (خواہ وہ انگریز تھے جنھوں نے یہاں آباد ہونے کی ٹھان رکھی تھی) حاکم کی صورت مقامی حاکم سے بہر نوع مختلف ہوتی ہے اور غیر ملکیوں کی طرف سے ریاستی ڈھانچے اور افرادی قوت کا استعمال ملکیوں کے مقابلے میں مختلف ہوتا ہے۔ سو ہماری پولیس کو غیر ملکی حاکموں (جنھیں مقامی حاکموں کے مقابلے میں کئی گنا برتر جانا گیا اور جنھوں نے ریاستی کاموں کے لئے تو پولیس کو خوب استعمال کیا مگر ذاتی کاموں کے لئے کہیں استعمال نہیں کیا) کے احکام بجا لانے میں ایک اور انداز میں کام کرنا پڑا مگر جب اپنے حاکم آئے تو نقشہ سر بسر تبدیل ہونے لگا۔ سب سے پہلے با اثر پولیس والوں کو یہ تسلی ہوئی کہ اب حاکم طبقے میں ان کے اپنے قبیلے، علاقے، برادری کے لوگ بھی شامل ہیں اور ان کے ذاتی کاموں کو بھی دیکھنا ہے اس کے جواب میں ان سے سرپرستی کی بھی امید رکھنی ہے بلکہ سرپرستی کروانی ہے۔ ان کے اقتدار کو اپنی ترقی میں بدعنوانی اور نااہلی پر پردہ پوشی کے لئے بھی استعمال میں لانا ہے۔ یوں احتساب اور میرٹ دونوں کی بیخ کنی لازم ٹھہری۔

میرٹ اور احتساب کے کچھ واقعات پنجاب کے ایک سابق انسپکٹر جنرل عباس خان کے حوالے سے بیان ہو چکے اسی طرح سیاسی مداخلت اور تگڑم بازی کا بھی بہت ذکر ہوا۔ ہمارے عہد میں انتخابات میں پولیس سے جو کردار ادا کروایا جاتا ہے وہ بہت ہی بڑے کینوس پر پھیلا ہوا ہے مگر مشتے از خروارے کے طور پر 1964ء کے قومی اسمبلی کے الیکشن میں صرف ایک حلقہ میں پولیس کے کردار کے بارے میں ریٹائرڈ ایس پی شیخ ابرار احمد کا تحریری بیان یا سرگذشت بازخوانی کے زمرے میں شامل کتاب ہو چکی کہ انہی دنوں ایک

دوسرے انسپکٹر جنرل پولیس نے اپنی پولیس جن کی یاد داشتوں پر مشتمل ایک کتاب لکھی۔ نام ان کا حافظ ایس ڈی جامی ہے اور کتاب کا نام ہی انہوں نے Police Crime and Politics (پولیس جرم اور سیاست) رکھ دیا۔ اس عنوان کی بنا پر نیک نیتی سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ پولیس کو ایک تو جرائم سے نمٹنا ہوتا ہے اور دوسرے ایک اور بڑے جرم یعنی سیاست سے بھی دوستی اور دشمنی نبھانی پڑتی ہے۔ سیاست اور سیاستدانوں نے دراصل پولیس کے برے بھلے ڈھانچے میں بڑی زور کی نقب لگائی اور میرٹ کو اڑا کر لے گئے، دوسرے دیانتداری، راست روی اور حصول انصاف میں پولیس کے کردار کو بھی گہنا کر رکھ دیا اور آخر کار عملاً نہیں لیکن ذہنی طور پر عوام کو یقین ہوتا چلا گیا کہ ہماری پولیس نہ صرف جعل سازی، چوری چکاری، قتل ڈاکے سے لے کر کوٹھے کے کاروبار تک کی سرپرستی کرتی ہے بلکہ اس کے منافع میں حصہ دار بھی بن جاتی ہے کیونکہ پولیس کے پاس اختیار بہت ہوتا ہے اور محاسبہ کار سے بالکل ڈر نہیں ہوتا۔ اسے یہ خبر ہے کہ اگر جج کے گھر چوری ہوئی ہے، پرنسپل کا بیٹا گم ہو گیا ہے، وزیر صاحب کی کوئی عزیزہ (خدا نہ کرے) اغوا ہو گئی ہے، مل کے مزدوروں نے مینجنگ ڈائریکٹر سے ہاتھا پائی یا مار پیٹ کی ہے تو ان سب صاحبان اقتدار کو انصاف حاصل کرنے کے لئے تھانے کے راستے سے گزر کر جانا پڑے گا۔ براہ راست عدالت میں جانا ممکن نہیں ہے۔ تو ایسی صورت میں ہمارے معاشرے میں پولیس کی اصلی اور ذہنی حکمرانی کا احساس یا انداز کیا ہوگا؟ اس کا اندازہ لگانا بڑا مشکل۔

اس اختیار اور اقتدار کو اگر کسی شخص یا ادارے سے ذرا سا بھی خطرہ ہو تو پولیس کے لئے اس کی تابعداری کس قدر اہمیت کی حامل بن جاتی ہے اس قسم کا تاثر حاجی صاحب کی کتاب میں بھی پایا جاتا ہے۔ مثلاً ایک بدقماش سب انسپکٹر یا انسپکٹر جو پوری پولیس فورس میں شیطان کی طرح بدنام ہو چکا ہے، اسے مختلف بدعنوانیوں کی بنا پر نکالا بھی جا چکا ہے اس کے باوجود صوبے کا سربراہ آئی جی سے یہ کہے کہ نہ صرف اس کو بحال بھی کیا جائے بلکہ اس کو علاقہ یا تھانہ بھی اس کی مرضی کا مطابق دیا جائے تو انسپکٹر جنرل کی حالت کیا ہوگی......
اس کے لئے ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے کہ وہ نوکری سے استعفیٰ دے دے مگر جب اسے پیشگی یہ معلوم ہے کہ اس کا جانشین یعنی نیا آئی جی اس کے جاتے ہی اس بدنام اہل کار کو حاکم اعلیٰ کی خواہش کے مطابق عزت و احترام سے بحال کر دے گا تو پھر اس کے سامنے

راستہ کیا رہ جاتا ہے۔ پھر اختیار خواہ آئی جی کا ہو یا وزیر اعلیٰ کا سمجھوتوں سے پیدا ہوتا ہو تو لامحالہ انسپکٹر جنرل کمزوری دکھائے گا۔ اور اس طرح صوبے کا سربراہ (عوام کا منتخب کردہ) اور سرکار کا منتخب کردہ انسپکٹر جنرل دونوں مل کر پولیس میں فساد خون کا ٹیکہ لگا دیں گے نتیجہ ایک فاسد فورس کی صورت میں برآمد ہوگا۔

حافظ جامی صاحب پولیس میں جانے سے پہلے مقابلے کے امتحان (خاندانی تعلق اور سفارش کی بنا پر نہیں) کے ذریعے پنجاب سول سروس میں شامل ہوئے اور پھر وہاں سے پاکستان سول سروس کے امتحان میں کامیاب ہو کر پولیس سروس میں آ گئے۔ ہمارے معاشرے میں زیادہ مضبوط خاندانی جڑوں والے اعلیٰ افسر اور کمزور معاشرتی جڑوں والے اعلیٰ افسر میں بھی ایک فرق ہوتا ہے یہ فرق بڑا ہی باریک ہوتا ہے مگر دونوں کی کارکردگی میں بہت نمایاں فرق کو ظاہر کرنے لگتا ہے۔ حافظ صاحب کی یادداشتوں میں یہ پہلو بھی باربار چھپانے کے باوجود نکل ہی آتے ہیں۔

شیخ ابرار احمد نے ٹوبہ ٹیک سنگھ سے کنونشن لیگ کے امیدوار کی کامیابی میں پولیس کے کردار کا قصہ بیان کیا ہے۔ اس سے پہلے کنونشن لیگ کے صدارتی امیدوار جنرل ایوب خان کی کامیابی کے بعد شہر کراچی میں جو کچھ گزر گئی اس پر ایک نظم مرحوم فیض احمد فیض نے لکھی تھی جس کا ایک شعر ضرب المثل ہوا۔

نہ مدعی نہ شہادت حساب پاک ہوا
یہ خون خاک تشہناں تھا رزق خاک ہوا

اور ایک ذکر حافظ جامی صاحب نے کیا ہے جو ان دونوں کراچی میں سپیشل برانچ کے سپرنٹنڈنٹ تھے۔ مقابلہ تو فاطمہ جناح اور ایوب خان کے درمیان تھا۔ ووٹ 2 جنوری 65ء کو پڑے۔ حاجی صاحب کے الفاظ میں ایوب خان کی حامی نوکر شاہی اور سیاستدانوں نے عام ہیرا پھیری کی۔ ووٹروں کو ہر طرح سے مجبور کر کے ایوب خان کے لئے ووٹ لئے اور یہ دھاندلی کھلے عام کی گئی۔ اور ایوب خان بھاری اکثریت سے جیت گئے۔ فتح کی خوشی میں ایوب خان کے صاحبزادے گوہر ایوب خان نے کراچی میں ایک بڑا جلوس نکالنے کا ارادہ کر لیا اس جلوس کے طور اطوار نعرہ زنی اور جارحانہ انداز نے نوکر شاہی کو پریشان کر دیا کہ اگر اسے روکا نہ گیا تو شہر پر قیامت ٹوٹ پڑے گی، روئیداد خان کراچی کے

کمشنر تھے، افسروں نے بھی مل کر گوہر ایوب سے رابطہ کر کے معاملہ پر امن طریق سے ختم کرنا چاہا مگر نہ رابطہ ہوا نہ فتح کا جلوس رکا، پٹھانوں وغیرہ پر مشتمل اس جلوس نے مہاجر بستیوں میں لوٹ مار، قتل و غارت اور آتشزنی کی انتہا کر دی۔

جن ماؤں کے بچے مار دیئے گئے، جن کے سہاگ اجڑے، جن کی جائیداد برباد ہوئی، جن کا ساز و سامان لیا گیا اور جن کے گھر نذر آتش کئے گئے وہ انصاف کے لئے تھانے پہنچے اور گوہر ایوب خان کے خلاف قتل عمد سمیت متعدد مقدمات درج کروائے گئے۔ اس کے علاوہ جلوس کے حوالے سے پولیس سمیت مختلف ایجنسیوں کے جو وائرلیس اور دوسرے پیغامات تھے وہ بھی سب ریکارڈ پر تھے یعنی جلوس والوں کی غیر قانونی بلکہ غیر انسانی کارروائیوں کا پورا ریکارڈ تیار ہو چکا تھا۔ غلام نبی میمن مغربی پاکستان کے وزیر قانون تھے انہیں پتہ چلا کہ قتل کا مقدمہ بھی درج ہو چکا ہے تو وہ فوراً کراچی پہنچے اور پہلا کام یہ کیا کہ پولیس کی لاگ بک ملاحظہ کی جس پر تمام ریمارکس اور پیغام درج تھے۔ مختلف وقتوں میں مختلف کے ہاتھ کے لکھے ہوئے پیغامات۔ حکم ہوا کہ یہ لاگ بک ضائع کر دی جائے اور ایک نئی لاگ بک تیار کروائی گئی۔ یہ سارا کام اعلیٰ افسروں کی موجودگی میں ہوا۔ اور انہی کی نگرانی میں اصل لاگ بک کر جلا کر گوہر ایوب خان کو قتل کے مقدمے سے صاف بچا لیا گیا۔ اقربا میرے کریں خون کا دعویٰ کس پر یہ کارروائی۔ پولیس، سیاستدانوں اور نوکر شاہی کا مشترکہ شاہکار ہے اور آج جبکہ اس سانحہ کو تینتیس برس سے اوپر گزر چکے تو غالب کے الفاظ میں بھی کہنا پڑے گا کہ

بارے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد

اوپر کہیں ذکر ہے کہ ڈاکے، چوری، راہزنی، سمگلنگ، قبضے، حتیٰ کہ کوٹھے تک کی کمائی میں پولیس حصہ دار نظر آتی ہے۔ بظاہر یہ بڑا غیر ذمہ دارانہ بیان نظر آتا ہے مگر حاجی صاحب کا بیان کردہ صاف ایک واقعہ متذکرہ غیر ذمہ دارانہ بیان کو حد درجے کا اعتبار بخش دیتا ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ حاجی صاحب نے خیر پور کے ایس پی کی حیثیت سے لوگوں کی شکایات کی روشنی میں تھانوں کا دورہ شروع کیا اور بدنام جرائم پیشہ افراد کے خلاف کارروائی کا سلسلہ بھی۔ تھانہ بابر ٹولی کا ایس ایچ او بڑا سخت گیر مشہور تھا اس کے علاقے میں ایک زمیندار بڑا بدنام تھا۔ رسہ گیری سے لے کر باقی سارے جرائم اس کے کھاتے میں ڈالے

جاتے تھے، حاجی صاحب نے اس ڈیرے پر چھاپہ مارا۔ ملزم پکڑا بھی گیا، گاؤں کے سینکڑوں لوگ اس کی دراز دستیوں کے خلاف صدائے احتجاج بن کر اکٹھے ہوگئے۔ حاجی صاحب نے دفعہ 110 تعزیرات پاکستان کے تحت اسے تھانے میں بند کر دیا۔ اتفاق سے انہی دنوں مغربی پاکستان کے انسپکٹر جنرل پولیس (جو ون یونٹ سے صوبہ سندھ کے انسپکٹر جنرل پولیس تھے اور آزادی سے پہلے بمبئی پولیس میں ہوا کرتے تھے) شریف خان سکھر کا دورہ کر رہے تھے۔ انہیں اس زمیندار کی گرفتاری کی خبر ملی، انہوں نے اسی وقت رخت سفر باندھا۔ سیدھے خیر پور کے تھانے میں پہنچے، ڈی ایس پی سمیت سارے عملے کی زبردست کھنچائی کی، ان کے خلاف سخت کارروائی بھی کی اور اپنے یار زمیندار کو حوالات سے نکال کر لے گئے۔ اسی جرم میں سال کے آخر میں جامی صاحب کی سالانہ خفیہ رپورٹ (ACR) بھی خراب کر دی۔ اور ہمارے لئے ایسی مثال بنا دی جس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکیں کہ

اے باد صبا ایں ہمہ آوردہ تست

☆☆☆

کتابیات انگریزی

1. A Book of Readings on the History of Punjab 1799-1947:- Ikram Ali Malik 1970.
2. Administration of the Mughal Empire. Dr. I.H. Qureshi 1966.
3. Dyal Singh Majeethia-Life and achievements Madan Gopal- Dyal Singh Library Trust. 1994.
4. Encyclopaedia Britainnica 1979.
5. History of Punjab S.M. Latif.
6. History of Punjab, Vol I Ed. Fauja Singh 1977.
7. History of the Muslims of Indo- Pakistan sub- continent (1707-1806) Prof. Abdur Rashid 1978.
8. Law and Order Management in Punjab. Tanveer Hameed. 1994.
9. Modern Police Administration ed: Donald O'Shultz.
10. Our Police Heritage - Saga of the Police Forces of Pakistan and India, N.A. Razvi 1961.
11. Problems of Law and Order Police Reforms. Mohammad Abbas Khan I.G.P.
12. Pashtun and Baloch History. Punjabi view ed. Ahmad Salim.
13. State of Human Rights in 1995. Human Rights Commission of Pakistan, Lahore 1996.
14. Indian Police, J.C. Curry.
15. The Muslim Year Book of India and Who's Who with complete information of Pakistan. 1948. S.M. Jamil.
16. The Punjab Police in a Comparative Perspective, Azhar Hassan Nadeem 1989.

کتابیات اردو

1۔ بنگالی مسلمانوں کی جدوجہد آزادی — عبداللہ ملک

2۔ پولیس اور جمہوری روح — سابق آئی جی محمد عباس خان

3۔ تاریخ اسلام — ڈاکٹر حمید الدین

4۔ تحقیقات چشتی — مولوی نور احمد چشتی

5۔ جرم، جیل اور پولیس — برکت علی غیور

6۔ حقیقت الفقرا (فارسی) — محمد درویش

7۔ دور مغلیہ — صلاح الدین ناسک

8۔ راہ عمل — سابق آئی جی سردار محمد چودھری

9۔ شاہ حسین — شفقت تنویر مرزا

10۔ شجاعت کا نشان......پنجاب پولیس — امان اللہ خان

11۔ عہد سلاطین — صلاح الدین ناسک

رسائل:۔ پولیس کے رسالے :ماہنامہ محافظ لاہور: پولیس گزٹ لاہور۔ لاہور پولیس لاہور۔ روزنامے۔ جنگ لاہور۔ ڈان لاہور، کراچی۔